

بیا اضافہ شدہ ایڈیشن

زمرہ پاؤںٹ 2

جاوید چودھری



بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

Kashif Azad @ OneUrdu.com

زیر و پوائنٹ 2

زیر پوائنٹ 2

Kashif Azad @ OneUrdu.com
جاوید چودھری

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اردو بازار، لاہور

فون: 7352332-7232336

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	نیو پوائنٹ 2
مصنف	جادیب چودھری
ناشر	گل فراز احمد
محل	علم و عرقان پبلشرز، لاہور
پروف رینگ	زادہ توبیدی پ نظر، لاہور
کپوزنگ	ملک محمد راہم
عنایت	انس احمد
کن انتاج	اکتوبر 2009ء
قیمت	= 500 روپے

بہترین کتاب پیچھائے کے لئے رابطہ کریں:- 0300-9450911

Kashif Azad @ OneUrdu.com

علم و عرقان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اردو بازار، لاہور

فون: 7352332-7232336

اشرف بک ایجنسی

اقبال روڈ، کینٹی پونک، راولپنڈی

دیکم بک پورٹ

اردو بازار، کراچی

کتاب گھر

اقبال روڈ، کینٹی پونک، راولپنڈی

خزینہ علم و ادب

الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

ادارہ علم و عرقان پبلشرز کا متصدیکی کتب کی اشاعت کرنے ہے جو حقیقت کے مطابق سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا متصدیکی کی دل آزاری یا کسی کو انسان پہنچانا ہے بلکہ اٹھائی دیتا ہے ایک تجھی چدٹ بھاکر ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس کی اپنی حقیقت اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور حقیقت سے متفق ہوں۔ اللہ کے نعم و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کپوزنگ ٹیکسٹ، تحریک اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بڑی تلاش سے اگر کوئی غلطی یا صفات درست نہ ہوں تو از را کرم مطلع فرماؤں۔ انشاء اللہ اگلے ایجنسی میں از الد کیا جائے۔ (ہش)

نسلی

اہمی جی
کے نام

Kashif Azad @ OneUrdu.com

ترتیب

11	جادید چودھری	کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے کنفیوژن کا پہاڑ
15		دوفٹ کا فاصلہ
18		ڈالر کماڈ پائیسی
21		جزل دیپک کپور کو بھی میڈل دے دیں
24		بے چارہ سوالی ہے، بے چارہ بھکاری ہے
27		اس سے پہلے کہ مہلت ختم ہو جائے
30		کینز نگر
33		اللہ کا ہاتھ
36		مرمریں ستونوں کی بہشت
39		کاش میں
41		حیات بھی منصر ہوتی ہے اور حکومت بھی
44		شاید کبھی نہیں
47		دو لگنے کا آدمی
50		آب حیات
53		بوتوں کا دلیں
56		بے اولاد
58		پانچ برس نہیں پانچ سو سال
61		تا حیات صدر
64		جناب صدر
66		واہیت ہمپر
69		دس بائی تیرہ فٹ
72		پتوں پر جھی ریت
75		شوکت عزیز میرے بھائی ہیں
77		سر انور پروین کی مثال
80		

8	
83	اسلامی معیار
86	بلت پروف
88	وہ ملک بھی خوشحال نہیں ہوا کرتے
90	حوالہ کا پیغام
93	سورج نہیں ڈوباتے
96	سزا
99	نشیب
102	بیہاد
105	کوئی مشکل نہیں
108	وہ خاک ہو کر بکھر گئے
110	فصل
113	غندے، لیبرے، ڈاکو
116	جس آج کا کل نہیں ہوتا
119	ڈرامہ 2001ء
121	چار روزہ نیاں
124	سٹون انج
127	چھ سو پچاس روپے
130	بس بکلی کے ایک بل کے عوض
133	رومال
136	پچاس فٹ اور تینی چمناں
138	آئیے دعا کریں
141	اے میرے خدا تو کہاں ہے!
144	مرنے کا حق
147	کامی کا کازی
150	منزل اب دور نہیں
153	رہن فیلانہ کے گئے میں بارہ ایس
155	ہمیں ڈشتریاں بدلتا ہوں گی
157	سمئنے اور بھیڑ یے گی کہانی
160	محضوم انسان

162	قیامت
165	واستہ ہاؤس 410 کلو میٹر
167	بائی-بائی
170	برف کی ڈلی
172	روئین
175	حساب
177	ترتی
179	دودن
182	ٹان انٹوز
184	آئیے سکھوں کی آنکھیں کریں
186	دھوپی اور کرچا
189	سر کاری بوز می، غیر سر کاری بوز می
192	قراء سوچنے
195	اتخاذات
198	باہلیں
201	بد دعا کیں
203	ہم انسان کی موت مارے گے ہوتے
205	یا اللہ معافی
208	منصور الحق کو وہ اپنے بھیج دیں
211	خشندے پانی کے دو گاہ
214	صرف دو چیزیں
216	جب تک بند نہیں ہوتی
219	بھیڑیں بھی اتحاد نہیں بنائیں
222	66 لاکھ 76 ہزار 5 سو
225	نق اس مکے کے
227	اویں فارغ تھو، خیرا
230	بے قانون معاشرے کے بے زبان لوگ
233	اُس ملک کو عدالتیں بیجا سمجھتی ہیں
236	انصاف دکان، فیکٹری یا دفتر نہیں ہوتا

239	آخری پشتہ
242	نوئے ہوئے جوتے
244	جمہوریے
246	مینڈیٹ کو مینڈیٹ رہنے دیں
	1988
248	حس حکمرانی
251	کامینہ
254	بھاولپوری کھرے
257	خوش نصیبی
259	وہ تو مجھے مانتا ہی نہیں
261	دودھ کا گنورا
263	ولی
265	امریکہ اور امریکی
268	جم، جمال، جیل
270	ایے پروردگار تم تے مجھے فلپائن کی جعل لکھ بنا یا
273	آرچی
275	یہ ایک گالی
277	جورب کی مانتے ہیں
280	چوہنے اور مائیں
283	اون کا گولا
286	شاید اسی کو طاقت کہتے ہیں
289	زندگی
291	اگر ایسا ہوتا، اگر ویسا ہوتا
294	ہمیں 1948ء کا پاکستان چاہے
297	چُپ
300	ہم سکرا کر تو دیکھ سکتے ہیں
303	جست پیش اٹ
305	جیکب دی لائیں
308	آئیے ماڈل کی طرح سوچیں
311	

کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے

(میری داستان، تصوری تھوڑی)

میرے گاؤں میں پڑھائی کا رواج نہیں تھا، تمام بچوں کا بچپن مرغیوں کے اندے چراتے، بیر توڑتے، کتوں کی دم کو آگ لگاتے اور ڈھوڑ ڈنگروں کے پیچھے بھاگتے گزرتا تھا۔ میرا مستقبل، میرا نصیب بھی یہی تھا لیکن میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا، میں بچپن میں ایک کمزور اور لا غر بچہ تھا۔ میں جب دوسرے بچوں کے ساتھ ڈنگروں کے پیچھے بھاگتا تو بے ہوش ہو کر گر جاتا تھا اور اس کے بعد مجھے دو، دو دن تاپ رہتا تھا، میرے بزرگوں نے جلد ہی میری نالائق بھانپ فی الہذا گاؤں کی روایت، گاؤں کے ماحول نے مجھے مسٹرد کر دیا۔ یہ میری ہمیلی شکست تھی، میرا پوہا بچپن گھر کی چونکھت کے اندر اپنی ماں، پاچھوہیوں اور بچوہیوں کے پیچھے پیچھے پھرتے لزرا۔ میں جس کو باہر جاتے دیکھتا اسی کا پلوک پلوک پڑ کر پیچھے پیچھے چل پڑتا، جو لوگ دیہات کے ماحول سے والف ہیں وہ جانتے ہیں دن چڑھنے سے غروب آفتاب تک گاؤں کی گلیوں میں ویرانی اور ادای کے ڈیرے ہوتے ہیں۔ تمام مرد اور بچے ڈھور ڈنگروں کے ساتھ کھیتوں میں چلے جاتے ہیں جس کے بعد گاؤں میں جانوروں کے گور، غیبت کرتی عورتوں اور بیالیوں پر بیٹھے بچوں کے سوا کچھ نہیں پختا۔ اگر کبھی گاؤں میں کوئی فقیر یا پھیری والا آ جائے تو اس کی آواز ذرا دیر کے لئے گلیوں کا سناتا توڑتی ہے لیکن یہ آواز بھی جلد ہی مایوس ہو کر دوسرے گاؤں کا رخ کر لیتی ہے۔ گاؤں کی دو پہروں کا یہ سناتا میرے اندر اترتا چلا گیا۔ آنے والی زندگی میں اس سنائے سے میں نے کئی بار جان چھڑانے کی کوشش کی لیکن میں کامیاب نہ ہو سکا، یہ سناتا آج بھی ایک تھائی، ایک ادای اور ایک بے چارگی کی شکل میں میری شخصیت کا حصہ ہے۔ ایش نے بھی مجھ سے کئی بار پوچھا۔ ”تم بلے، لگلے شور شراب سے کیوں بھاگتے ہو، تم خوش ہوتے، تمقبل ہگاتے اور ہنسنے ہنسنے تو لوگوں سے دور کیوں رہتے ہو۔“ اس کا سوال جیزنوں تھا لیکن میں اسے کیا بتاتا، میرے وجود کے اندر میا لے رنگ کا ایک ویران گاؤں ہے جس کی گلیوں میں تھائی بھتی اور سناتا سرسراتا ہے۔ یہ سناتا یہ تھائی اور یہ گاؤں باہر کی کوئی آواز قبول کرنے پر تیار نہیں۔ اس سنائے کی آواز اتنی بلند اور اس تھائی کی چھاؤں اتنی گھبری ہے کہ اس کے پیچے کوئی آواز، کسی آواز کا کوئی طسم جزو نہیں پکڑ پا رہا۔

میری ماں کو میری اس کیفیت کا علم ہوا تو اس نے مجھے سکول داخل کر وا دیا۔ میں اپنے خاندان کا پہلا فرد تھا جس کے قدم سکول کی پڑھت کے اندر داخل ہوئے اور اس کے بعد اس نے پڑھائی کو اپنا غسل بنا لیا، اس کی وجہ بہت دلچسپ تھی۔ ہم لوگ علم کو کمزوری جانتے تھے۔ میرے خاندان کا خیال تھا سکول اور کتابیں انسان کی جواں مردی، بہت اور شجاعت فتح کر دیتی ہیں، ربانہ ہب تو اسے میرا خاندان عورتوں کا کام سمجھتا تھا۔ ہمارے خاندانوں کے مردوں کا ایمان فقط تک محدود تھا اور اسے بھی وہ صرف ہاتھ دھوتے وقت استعمال کرتے تھے۔ کچھ حصہ پہلے کراچی کے بعض علماء کرام نے مجھے دعوت دی، لیکھر کے بعد ایک صاحب نے فرمایا۔ ”آپ کی تحریروں میں ایک خاص قسم کا نہیں رنگ ہے جس سے محبوس ہوتا ہے آپ کی تربیت خالص نہیں ماحول میں ہوئی تھی۔“ میں نے قبیلہ لگایا اور ان سے عرض کیا۔ ”حضور میرے خاندان میں صرف میری دادی اور میری ماں کو قرآن مجید پڑھنا آتا تھا، میرے بزرگ اور میرے بزرگوں کے بزرگوں کا ذریعہ معاش لڑائی جھکڑا تھا۔ اگر آپ اسے نہیں تربیت کہتے ہیں تو الحمد للہ میں بچپن میں اس سے ملا مال تھا۔“ سکول کے حالات بھی اتنے اچھے نہیں تھے۔ برگد کا ایک درخت تھا اور اس کے نیچے ایک ماسٹر ”کیوں“ کے پھون کو الف انار اور بے بکری کی تعلیم دیتا تھا، میرا تعلق کیونکہ گاؤں کی ”متاز فیلی“ سے تھا۔ میں چودھریوں کا بینا تھا لہذا مجھے کیوں کے بھون سے ذرا فاصلے پر بخایا جاتا تھا۔ مار اور ڈانٹ ڈپٹ کے دوران بھی میرے رہتے کا خیال کیا جاتا تھا میر صاحب اور میرے بھوپال اور بھائیوں ”دیں ریمنیشن“ نکلتے تھے، وہ بھی آپ کی زم چھڑی سے مارتے تھے جبکہ دوسرا بھوپال کو تباہی کے موئے ڈنڈے سے اوپر زدیا جاتا تھا۔ اس دس کریمینیشن کا یہ نتیجہ تھا آخر میں آپ کی وہ زم چھڑی اور میں، ماسٹر صاحب کا واحد اتنا شرود گے۔ میری طرح میرے والد بھی اپنے بھائیوں میں ایک کمزور شخص تھے، وہ لڑنے بھرنے اور لڑائی جھکڑے سے پرہیز کرتے تھے۔ ان کے بھائی اس کمزوری پر انہیں ”آڑھتی“ کہتے تھے۔ آڑھتی کا لفظ بے شمار لوگوں کے لئے نیا ہو گا لیکن دیباتی دس منظر رکھنے والے لوگ اس سے بخوبی واقف ہوں گے۔ دیباتی قصبوں کا سب سے بڑا کاروبار آڑھت ہوتا ہے۔ آڑھتی وہ لوگ ہوتے ہیں جو کسانوں اور زمینداروں سے اتنا خریدتے ہیں، اس پر اپنی کمیش رکھتے ہیں اور پھر یہ مال آگے بچ دیتے ہیں۔ یہ لوگ دیہی زندگی میں خاصے خوشحال ہوتے ہیں لیکن اپنی پست بمعتی اور کاروباری اپر وچ کے باعث اچھی نظر سے نہیں دیکھتے جاتے۔ میرے والد حساب کتاب کے ماہر تھے۔ ان کی طبیعت میں اُن پسندی اور صلح صفائی کا عصر بھی پایا جاتا تھا چنانچہ وہ دوسرے بھائیوں کو لڑنے بھرنے سے منع کرتے تھے۔ یہ بات میرے خاندان کے لئے قابل قبول نہیں تھی لہذا برداری نے انہیں آڑھتی کا خطاب دے دیا۔ یہ کٹاکش اتنی بڑھی کہ ایک دن میرے والد نے مجھے کندھے لگایا، میری ماں کا ہاتھ پکڑا اور شہر بھرت گئے۔ یوں ہم لوگ شہری ہو گئے۔

شہر میں سکول ہمارے گھر کے بالکل سامنے تھا۔ میرے والدین نے مجھے سکول میں داخل کر دیا۔ یہ

ایک ناٹ سکول تھا جس میں تختیاں، سلیمیں اور زندے ہوتے تھے۔ میری جسمانی کمزوری نے یہاں بھی میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ کلاس کے مضبوط اور بھاری بھر کم بچوں نے جلدی مجھے دیوار سے لگا دیا، وہ میرا کھانا پیش کر کھا جاتے، میری بیب سے پیسے تکال لیتے، میری کتابیں اور کپڑے پھاڑ دیتے، میں سارا دن رو رونگز اور دجا تھا۔ میں اپنی ماں سے روز کہتا تھا میں سکول نہیں جاؤں گا، میں نے نہیں پڑھنا لیکن وہ مجھے تسلی دے کر کسی نہ کسی طرح اگلے روز سکول بھجوادی تھی، شاید میں تیرسی جماعت میں تھا جب میں نے زندگی کی پہلی کہانی پڑھی، یہ دس پیسے کی چھوٹی سی کتاب تھی جس میں کوئی جن کسی شہزادی کو اٹھا کر لے جاتا ہے اور شہزادہ شہزادی کی تلاش میں اُنکل کھرا ہوتا ہے۔ میرے کلاس فیلوz اس وقت تک کہانیاں نہیں پڑھ سکتے تھے۔ انہوں نے میرے ہاتھ میں کتاب دیکھی تو مجھے حکم دیا۔ ”اوے چکو ہمیں پڑھ کر سناؤ۔“ میں نے فرفرو پڑھ دی، اس دوران پوری کلاس خاموشی سے سخن رہی، کہانی کے بعد حکم ہوا۔ ”تم روز کتاب لے کر آؤ گے اور ہمیں سخن کہانی سناؤ گے۔“ میں نئی مصیبت میں گرفتار ہو گیا۔ اب میں سکول سے گھر آتا اور دس پیسے پیدا کرنے میں جت جاتا، اسی بھی اور اپا بھی سے بھانے بھانا کر پیسے کھینچتا، گھر کے ٹین ڈبے اور باسی لکڑے بیچتا اور یوں کسی نہ کسی طرح کہانی کی نئی کتاب خرید لیتا، اگر کسی دن کامیاب نہ ہوتا تو میرے کلاس فیلو مجھے یخچ لٹا کر مارتے۔ اس مار کا خوف مجھے کہانیوں کی کتابوں کے پیچھے ہوڑا تارہ بتا تھا۔ مجھے مینے کے تسلی ہیں کہانیں جاتے ہیں وہی تھیں۔

ایک روز ایک بیب واقعہ پیش آیا۔ میں کتاب لھر بھول آیا، کہانی سنانے کا وقت آیا تو میں پریشان ہو گیا۔ لگوں نے بازو چڑھانے شروع کر دیئے۔ میں نے ہمت کی، ان کے سامنے کھرا ہوا، پچھلی کہانیوں کے گرواروں کو ملا کر ایک کہانی کا خاکہ تیار کیا اور کتاب کے بغیر کہانی سنانی شروع کر دی۔ یہ میری زندگی کی پہلی کہانی تھی جس کا موجود میں خود تھا۔ اس کے بعد یہ میری روشن بن گئی، میں روز نئی کہانی بھاتا اور کلاس فیلوz کو سنادیتا۔ آنے والے وقت میں کتابوں اور کہانیوں کی جگتو مجھے لاہر یوں میں لے گئی، میں نے بے تحاش پڑھنا شروع کر دیا۔ اسی دوران کسی نے میرے والدین کے کافوں میں ڈال دیا۔ ”یہ غرب اخلاق کتابیں پڑھتا ہے جس کے نتیجے میں اس کے اخلاق خراب ہو چکے ہیں۔“ میرے والدین ان پڑھتے، اس مشورے کے بعد انہوں نے مجھے خیش کتابوں سے دور رکھنے کو اپنا مشن بنا لیا، وہ میرے ہاتھ میں جو کتاب دیکھتے، چھینتے اور پیچا کر جلا دیتے، میں پیچت رہ جاتا لیکن انہوں نے مجھے ”بد اخلاق“ ہونے سے بچانا تھا۔ کتب سوزی کے اس دور میں میرے کو رس تسلی کتابیں محفوظ نہ رہیں۔ میرے ایک پیچانے کتاب سوزی کو اتنا بڑا مشن بنا لیا وہ روز بیج اشنتے، میرے بستے میں ہاتھ ڈاتے اور جو بھی کتاب ان کے ہاتھ لگتی وہ اسے جلا کر چلم گرم کر لیتے۔ اس قلم کا یہ نتیجہ تکلا، میں راتوں کو اٹھ کر موم بھی جلاتا اور سب سے چھپ کر کتابیں پڑھتا، سکول میں کوئی کتابوں میں ناول چھپا کر پڑھتا اور سودا اساف کے لفڑیے پھاڑ کر ان پر چھپے لفظ پڑھتا، اس مشقت کا اثر میری نظر پر ہوا اور مجھے ساتوں جماعت میں وحدت لا دکھائی دینے لگا، میری نظر خراب ہو چکی تھی لیکن میرے گھر

والے یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، ان کا کہنا تھا۔ ”بارہ سال کے بچے کی نظر کیے خراب ہو سکتی ہے، یہ سب کہر ہیں، عینک لگانے کے بہانے ہیں۔“ میری نظر خراب سے خراب ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ مجھے تنہ سیاہ نظر آتا بند ہو گیا، میں نے خود ہمت کرنے کا فیصلہ کیا، میں نے جیب خرچ سے گھر والوں سے چوری عینک خرید لی۔ اب میں اپنی عینک بنتے میں چھپا لیتا۔ گھر سے نکلا تو گالیتا اور گھر کے قریب پہنچ کر دوبارہ چھپا لیتا۔ یہ مشقت کا لج تک جاری رہی، میں پورے چار سال چھپا کر عینک لگاتا رہا۔ میرے گھر والوں نے کانج تک میری عینک کو تسلیم نہ کیا۔

بچپن میں میرے تین شغل تھے۔ تہائی، مطالعہ اور یادداشت۔ میں جو لفظ پڑھ لیتا وہ میرے حافظے کا حصہ بن جاتا۔ ایش نے ایک روز پوچھا ”تمہیں ساری باتیں، ساری چیزیں کیسے یاد رہ جاتی ہیں۔ تم تاریخ وقت اور جگہ تک بتا دیتے ہو، تم کپڑوں کا رنگ، ہاتھوں، آنکھوں اور ہونتوں کے اشارے اور سانسوں کی تعداد تک نوٹ کر لیتے ہو، کیسے کیسے، بتاؤ، جلدی بتاؤ۔“ اس نے اس دن عنابی رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے، یہ نوہبر کی چار تاریخ تھی، ہم داسن کوہ میں انہیں کے درخت تلتے بیٹھے تھے، پتوں پر خزاں نے ابھی بس اتنا شروع کیا تھا۔ جب اس نے یہ سوال پوچھا تھا تو ایک شراری پذشاخ سے نوٹا، ہوا میں لہرایا اور ڈولتا ہوا اس کے سر پر آگرا، اس نے سر جھکنا، پتہ کھسکا، بالوں سے اترنا اور کندہ ہے پر آ کر کلک گیا۔ نھیک اسی لمحے سامنے جہازی پر ایک تکلی لہرائی، تڑپتے کبوتر کی طرح اس نے جہازی کا چکر لگایا اور عناصر ہوئی۔ میں ہنسا، میری بھی شام کے اندر میرے میں اتر گئی، خلکی کی ایک لہر میری ریز ہدی کی ہدی میں سننا تی ہوئی سخن دے بیٹھ میں گم ہوئی۔ میں نے آہتہ دھیٹے لجھے میں جواب دیا ”تجہائی اور اداکی..... جس شخص کو بچپن میں یہ استاد مل جائیں، اسے زندگی میں کسی سکول کی ضرورت رہتی ہے اور نہ ہی استاد کی۔“ یہ حقیقت ہے اس تہائی اور اس مطالعے نے مجھے ڈھنی طور پر بہت جلد بالغ کر دیا، میں اپنے کلاس فیلوز، اپنے اساتذہ سے آگے نکل گیا، اتنا آگے نکل گیا کہ میں ان کے مذاق کا ذریعہ بن گیا، وہ جو کچھ کھیلتے تھے مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی، وہ جو کچھ سوچتے تھے، جو کچھ بولتے تھے اور جو کچھ کرتا چاہتے تھے، مجھے وہ سب خام، فضول، اور لا یعنی لگتا تھا۔ میری اس سوچ، اس طرزِ عمل نے مجھے مزید اداس، مزید اکیلا کر دیا اور میں صحراء کے اس درخت کی طرح ہو گیا جو ریت کے سینکڑوں ہزاروں ٹیلوں میں تجاکھڑا ہوا اور اس کی بات، اس کی سرگوشیاں رہتی ہو اور نہ ہی وہ رہیت کے احساسات سمجھتا ہو۔ میرا یہ مسئلہ یونیورسٹی تک قائم رہا۔ یونیورسٹی میں ایک اور واقعہ پیش آیا جس نے ایک اداس نو جوان کو انجھا کر جووم میں لا پھینکا، جس نے مجھے بولنا، ستنا اور بولے سنے کو انجوائے کرنا سیکھا دیا، یہ اکتوبر کی ایک شم روشن صبح تھی، بہاولپور کی رہیت پر ابھی رات کی خلکی باقی تھی.....

کنفیوژن کا پہاڑ

پروفیسر ارشد جاوید پاکستان کے نامور سائیکالوجسٹ ہیں، یہ پینا نرم کے بھی ماہر ہیں اور انہوں نے گھر بیو زندگی پر بھی بڑی شاندار کتابیں لکھی ہیں لیکن یہ کتابیں "شریف بچوں" کے مطابعے کیلئے نہیں ہیں۔ پروفیسر صاحب میرے دوست ہیں اور میری اکثر اوقات حوصلہ افزائی فرماتے رہتے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے چند دن پہلے مجھے ایک دلچسپ خط لکھا، میں بات آگے بڑھانے سے پہلے آپ کو یہ خط پڑھانا چاہتا ہوں۔ پروفیسر ارشد جاوید فرماتے ہیں "میرا نو سالہ نواسا ذین تیسری جماعت کا طالب علم ہے، وہ انگلش میڈیم سکول میں پڑھتا ہے ذین کا سالانہ امتحان قریب تھا، اس کی ماں اس کو سارا دن پڑھاتی تھی، وہ چیزیں جو دہ اردو میں اچھی طرح جانتا تھا سے انگلش میں سمجھنیں آتی تھیں، اس کی ماں اسے رہنمائی تھی، وہ بھی سمجھے یاد کر رہا تو اسے جلد یاد نہیں ہوتا، وہ سارا دن ماں سے جھپڑ کیاں اور مار کھاتا تھا، ایک دن تک آ کر ذین نے اپنی ماں سے کہا "ماما! میرا دل کرتا ہے کہ میں تو میرہی جاؤں"۔

پروفیسر ارشد جاوید نے اس کے بعد مزید لکھا "23 مارچ کوئی تعلیمی پالیسی آنا تھی، اس پالیسی میں پاکستان میں پہلی جماعت سے انگلش پڑھانے کی باتیں ہیں، بدستی سے احساس کمرتی کے مارے ان لوگوں کا خیال ہے کہ انگلش پڑھنے سے قوم ترقی کرے گی، اگر اس میں کوئی حقیقت ہوتی تو برطانیہ کی حکومت نہ سکرتی، روس اور چین کبھی عالمی طاقت نہ بنتے، جاپان بے مثال ترقی نہ کرتا، برطانیہ اور امریکہ کا ہر فرد آئین شائین ہوتا (یاد رہے کہ آئین شائین جسم کا تھا)، دیست انڈیز ایک ترقی یافتہ ملک ہوتا، عالمی طاقت، امریکہ نہ برطانیہ، روس، چین، فرانس اور جرمنی میں صرف امریکہ اور برطانیہ انگلش بولنے والے ملک ہیں، سارے ترقی یافتہ یورپ میں صرف برطانیہ میں انگلش بولی جاتی ہے، مسلمانوں نے ایک ہزار سال دنیا پر حکومت کی ظاہر ہے کہ اس کی وجہ انگلش نہ تھی، نفیات کا ایک اہم اصول ہے کہ انسان خصوصاً بچہ اپنی زبان میں چیزوں کو جلد اور بہتر طور پر سمجھتا ہے، اپنی زبان میں سوچتا اور غور و فکر کرتا ہے، ترقی کا تعلق کسی خاص زبان کے ساتھ نہیں ہوتا بلکہ اپنی زبان کے ساتھ ہوتا ہے، اور آج تک کسی قوم نے اپنی زبان کے بغیر ترقی نہیں کی۔ ہمارے ہاں بچوں کا سارا وقت انگلش کو رہنے میں ضائع ہو جاتا ہے، ان کو انگلش آ جاتی ہے، مگر علم نہیں آتا، وہ وقت جو انہیں غور و فکر

پر لگانا چاہیے وہ انگلش رئنے میں لگتا ہے اس طرح ان کے پاس غور و فکر کیلئے وقت نہیں بچتا جو نکد انسان اپنی زبان میں سوچتا ہے اسی لئے ہم پہلے اردو میں سوچتے ہیں اور پھر اس کا انگلش میں ترجیح کرتے ہیں۔ ہارورڈ کی ریسرچ کے مطابق کسی خاص زبان کا ترقی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، اسی لیے تمام ترقی یافتہ ممالک میں ملکی زبان میں تعلیم دی جاتی ہے جس کی وجہ سے بچے آسانی سے علم حاصل کر لیتے ہیں اور ان کے پاس غور و فکر کیلئے کافی وقت نہیں جاتا ہے۔

پروفیسر صاحب مزید لکھتے ہیں۔ "انگلش کے حوالے سے ایک دلیل یہ ہے کہ یہ یہ میں الاقوامی زبان ہے غالباً روس، چین، جاپان، جمنی اور فرانس اس حقیقت سے آگاہ نہیں، یہاں سے جاہل ہیں، بے خبر ہیں، ایک دلیل یہ بھی ہے اسی دلیل سے ہمارے طالب علم اعلیٰ تعلیم کیلئے امریکہ اور برطانیہ جاتے ہیں، اس طرح انہیں آسانی ہو جاتی ہے یہ بات بھی غلط ہے کیونکہ ہمارے ہاں بہتر کیلئے ایک فیصد لوگ یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، اس ایک فیصد میں سے بھی بہتر کیلئے آدھا فیصد اعلیٰ تعلیم کیلئے برطانیہ اور امریکہ جاتے ہیں، اب تو ایک بڑی تعداد اعلیٰ تعلیم کیلئے روس اور چین جا رہی ہے اس سے بڑی تعداد کیا ہو گی کہ ہم ایک فیصد سے بھی کم لوگوں کی خاطر پوری قوم کو انگریزی پڑھائیں، اس طرح پوری قوم کا قیمتی وقت صاف کر دیں، یہ بھی ذہن طالب علم جو اعلیٰ تعلیم کیلئے باہر جاتے ہیں، وہ کوئی بھی زبان چند ماہ میں سکھ لیتے ہیں، ذہن عین القدر کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے وہ انگلش میڈیم سلوول کے پڑھنے ہوئے ہیں تھے مگر انہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کیلئے تین ملکوں کی زبان سیکھ لی۔ علامہ اقبال نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کیلئے جرمن زبان سیکھی، ہمارے ملک میں ڈاکٹروں، سائنسدانوں اور مفکرین کی 95 فیصد سے زیادہ تعداد انگلش میڈیم سکول کی پڑھی ہوئی نہیں۔ چودھری صاحب! آپ بھی نہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ انگلش نہ پڑھائی جائے بلکہ ذریعہ تعلیم انگلش کی بجائے اردو ہو، بہتر ہے کہ پر ائمہ تک صرف اردو پڑھائی جائے، اس کے بعد انگلش اور عربی کے مخفایہ شامل کئے جائیں، اسلامی تعلیمات سے آگاہ ہونے کیلئے عربی جانانا نبایت ضروری ہے، ہماری پاہتی کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ ہم قرآن پڑھتے ہیں مگر اس کے مضمون اور پیغام سے نا بلد ہوتے ہیں، بچے میڈیم تک پہنچنے پہنچنے اردو کے علاوہ انگلش اور عربی سیکھ لیں گے، ایک بچہ آسانی سے تین چار زبانیں سکھ لیتا ہے۔ قائد اعظم نے اردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دیا تھا حالانکہ خود ان کو اردو اچھی طرح نہیں آتی تھی مگر ان کو علم تھا کہ تو میں صرف اپنی زبان میں ترقی کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں قومی اسکول میں ایک قرارداد بھی پاس ہوئی مگر بد قسمتی سے ابھی تک اس پر عمل نہیں ہوا اور آج ایک بار پھر انگریزی کی احتضان پورے ملک پر سلطنت کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میں اپنی بات ختم کرنے سے پہلے آپ کو ایک لطینہ ستاتا چلوں ایک سرداری انگلینڈ گئے، خوب ترقی کی 10 سال کے بعد واپس لوئے، گاؤں کے لوگوں نے ان کے اعزاز میں جلد منعقد کیا اور ان سے گوروں کی ترقی کا راز پوچھا، اپنی تقریر کے آخر میں سرداری نے فرمایا "مکحوم ترقی نہیں کر سکتے، انگلینڈ کا بچہ بچے

انگریزی بولتا ہے جبکہ تمہارے تو بڑھتے بھی انگریزی نہیں بول سکتے۔ ”ہمارے ساتھ بھی سمجھی ہو رہا ہے۔“
پروفیسر ارشد جاوید کا خط ختم ہو گیا میں بڑی حد تک پروفیسر صاحب کی باتوں سے اتفاق کرتا ہوں
ہم جب ایک قومی زبان کے مالک ہیں تو پھر ہمیں اسے استعمال بھی کرنا چاہیے لیکن مسئلہ اردو یا انگریزی نہیں
مسئلہ کنفیوژن ہے، ہم آج تک یہ طے نہیں کر سکے ہمارا ذریعہ تعلیم انگریزی ہو گا یا اردو؟ ہم بھی اردو کی محبت
میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور کبھی انگریزی کو اپنی قومی ضرورت بنا لیتے ہیں۔ آپ خود فیصلہ کیجئے جس ملک میں
چیف جسٹس سے لے کر صدر تک تمام عہدوں کے حلف انگریزی میں ہوتے ہوں اور جس میں کشمیر کو کاشمیر بولا
اور پڑھا جاتا ہو وہ ملک اور وہ قوم کنفیوژنیں تو کیا ہے؟ رتبی کامل ہمیشہ فیصلے سے شروع ہوتا ہے، ہم آج
اردو یا انگریزی کسی ایک کافیصلہ کر لیں اور اس فیصلے کو پچاس سال کیلئے لاک کروں تو ہم اپنے مسئلے حل کر لیں
گے؛ ہم اگر اس ملک میں انگریزی کو فروغ دینا چاہتے ہیں تو ہم کسی سرکاری اور غیر سرکاری دفتر میں اردو کی
درخواست قبول نہ کریں اور پورے ملک کے بچوں کا سلپیس پہلی کلاس سے انگریزی میں کر دیں اور اگر ہم اپنی
قومی زبان کا اختیاب کرتے ہیں تو پھر چیز اسی سے لے کر صدر تک صرف اور صرف اردو بولیں، ہمارے وزراء
وزراء اعلیٰ اور وزیر اعظم بھی چینی زبان کی طرح تمام علمی فورمز پر اردو میں بات کریں اور ترجمان اس کا
ترجمہ کریں، ہمارے سارے تعلیمی سلپیس اردو میں ڈھالے جائیں اور کوریا کی طرح انگریزی کی ہر تازہ کتاب
کا ترجمہ ایک ماہ کے اندر مارکیٹ میں آجائے تاکہ یوپ اور ہم میں ناچ لیپ پیدا نہ جاؤ ہمارے دفاتر کی
ساری کارروائی اردو میں ہو، ہم نہ کرات، نہ ایجاد اور مینیمنڈ بھی اردو میں کریں، ہم جو بھی کریں ہم ایک ہی بار
کریں، حقی کریں اور معاشرے کو آدھا تیز اور آدھا بیشتر ہانے کا سلسلہ بند کریں ورنہ ہم کنفیوژن کے پھر
تلے دفن ہو جائیں گے۔



دوفٹ کا فاصلہ

"پاکستان بھی عجیب ملک ہے۔" ڈیوڈ نے سگار ہونتوں میں دبایا، میں نے چوک کر پوچھا" وہ کیسے؟ اس نے لمبا کش لیا، میری طرف طنزیہ نظروں سے دیکھا اور آہستہ آہستہ بولا۔ "پاکستان کے تمام لیڈروں تمام سیاستدانوں، بینیزرز ایم ایں ایز اور رسول سوسائٹی کے تمام نمائندوں کو صورتحال کی ٹکنیک کا اندازہ ہے، ان تمام لوگوں کے پاس ملک کو مسائل سے نکلنے کے فارمولے بھی موجود ہیں اور ان میں مسائل کے حل کی صلاحیت بھی ہے لیکن یہ اس کے باوجود کوئی عملی قدم نہیں اخخار ہے، میں جب یہ حالات دیکھتا ہوں تو مجھے یہ ملک بہت عجیب لگتا ہے۔" ڈیوڈ اٹھا، اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گیا، ڈیوڈ ایک انٹریشنل ڈوز ایجنٹی کا کنسٹری ہیڈ بے وہ بچھلے دو سال سے اسلام آباد میں مقام ہے، میرا اس کے ساتھ تعارف کی سفارتی تقریب میں ہوا اور وہ آہستہ آہستہ میرا دوست بن گیا، وہ ایک بہادر اور بڑی حد تک داش مند گورا ہے، وہ پورے پاکستان کی سیر کر چکا ہے اور پاکستان کے مسائل کو بڑی گہرا آئی سے جانتا ہے، وہ گزشتہ روز میرے پاس آیا اور اس نے پاکستان کے سیاسی اور ثقافتی حالات پر تبصرہ شروع کر دیا، ڈیوڈ نے گفتگو کے آخر میں اپنا تبصرہ دیا، ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گیا لیکن اپنے پیچھے سوچ کی ایک لمبی لکیر چھوڑ گیا۔

ہمارا مسئلہ کیا ہے؟ ہم اپنے حالات کو بہتر کیوں نہیں بنانے پا رہے؟ میں جب بھی یہ سوال سنتا ہوں تو مجھے وہ شخص یاد آ جاتا ہے جو رات کے اندر ہیرے میں پہاڑ کی چوٹی سے پھسل گیا اور تیزی سے ڈھلوان کی طرف پھسلتا رہا، اچانک اس نے ہاتھ مارا اور کسی درخت کی لمبی سی شاخ اس کے ہاتھ میں آ گئی، وہ شاخ کے ساتھ لٹک گیا، اب منتظر کچھ ہوں تھا، چاروں طرف گھپ اندر ہرا تھا، اس شخص کو ایک انج کے فاصلے پر موجود چیزیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں، وہ پہاڑ اور زمین کے درمیان فضا میں شاخ کے ساتھ لٹک رہا تھا، وہاں شدید سردی تھی اور سردی کی وجہ سے اس کا جسم آہستہ آہستہ سن ہو رہا تھا، اس نے اللہ تعالیٰ سے گزر گزا کر مدد کی دعا شروع کر دی، وہ روتا جاتا تھا اور اللہ تعالیٰ سے مدد کی دعا کرتا جاتا تھا، وہاں اچانک کسی کے اترنے کی آواز آئی، اس شخص نے خوشی سے اوپر دیکھا اور آواز لگائی، "کون ہے؟ اوپر سے آواز آئی" مجھے اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد کیلئے بھیجا ہے، اس نے پوچھا "تم ہو کون؟ آواز آئی" میں فرشتہ ہوں اور اللہ تعالیٰ کے حکم پر مصیبتوں کے

بیکار لوگوں کی مدد کرتا ہوں" وہ شخص خوش ہو گیا اور اس نے خوشی سے کہا "لیکن مجھے کیسے یقین آئے گا کہ تم واقعی فرشتے ہو" فرشتے نے فوراً جواب دیا "تمہارا نام محمد صابر ہے تم پونیاں کے رہنے والے ہو اور تم روزانہ بس اپوں کے انہیے چوری کرتے ہو" اس شخص کو فوراً یقین آ گیا لہذا اس نے جذباتی آواز میں کہا "تم پھر مجھے بچاؤ" آواز آئی "میرے ہاتھ نہیں ہیں میں تمہیں پکڑ سکتا ہوں اور نہ ہی تمہیں نیچے اتار سکتا ہوں میں بس تمہیں مشورہ دے سکتا ہوں" وہ شخص تھوڑا سا پریشان ہوا اور اس نے پریشانی میں کہا "اچھا پھر مجھے مشورو دو" آواز آئی "تم فوراً شاخ چھوڑ دو" وہ شخص تکمیل طور پر پریشان ہو گیا اور اس نے چلا کر کہا "تم میرے مد دگار ہو یا دشمن، تم دیکھنے کی رہے میں پہاڑ اور وادی کے درمیان لٹک رہا ہوں اور میں نے اگر ہاتھ چھوڑ دیا تو میں گر جاؤں گا" فرشتے نے اس کی بات سن کر جواب دیا "میں تمہیں گارنی دیتا ہوں تم اگر ہاتھ چھوڑ دو تمہیں چوت نہیں آئے گی" لیکن اس نے فرشتے کی بات ماننے سے انکار کر دیا اس کے بعد فرشتے اسے سمجھاتا رہا اور وہ مسلسل انکار کرتا رہا یہاں تک کہ سردی نے اس پر اثر کیا اس کا جسم جنم گیا اور وہ انتقال کر گیا اگلے روز لوگوں نے وہاں ایک عجیب مظہر دیکھا پہاڑ کے دامن میں ایک درخت تھا درخت کی ایک شاخ سے ایک لاٹ لٹک رہی تھی اور اس لاٹ اور زمین کے درمیان صرف دو فٹ کا فاصلہ تھا۔

آپ غور کریں تو آپ کو محسوس ہو گا اس شخص میں دو فاصلت تھے ایک اس نے اللہ تعالیٰ پر یقین نہیں کیا اور دوسرے اس نے فرشتے کیلئے تیار ہیں اس کیلئے اپنے ہاتھ میں ہو گئی تھیں اور فرشتے کیلئے تم میں بھی موجود ہیں ہم مسلمان ہیں ہم اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان بھی رکھتے ہیں ہم دن میں پانچ بار اللہ تعالیٰ سے گزر گزرا کر دعا میں بھی کرتے ہیں ہم نماں کعبہ میں خالق کعبہ سے پٹ کر اللہ سے مدد بھی مانگتے ہیں اور ہم روپہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جالیاں تھام کر گریہ وزاری بھی کرتے ہیں لیکن جب اللہ تعالیٰ ہماری مدد کیلئے کوئی فرشتہ بھجوواتا ہے اور وہ فرشتے کیلئے کوئی مشورہ دینا ہے تو ہم اس مشورے پر عمل کی بجائے شاخ سے لٹکے رہنے کو ترجیح دیتے ہیں گویا ہمارا اللہ پر ایمان تو ہے لیکن اس پر یقین نہیں دوسرا ہم ستیٰ کمزوریٰ نالائقیٰ، غافل پرستی اور منافقت کے ہاتھوں آہستہ آہستہ موت قبول کر رہے ہیں لیکن ہم امریکہ کا ہاتھ چھوڑنے کا رسک لینے کیلئے تیار نہیں ہیں چنانچہ ہم نہیں نے صرف دو فٹ اونچائی پر مر رہے ہیں آپ اگر اس کہانی کے بے وقوف شخص کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو آپ کو نہیں ہو گا اللہ تعالیٰ پچھلے دس برسوں سے جاری ڈبلیو بیش کوندو لیزا رائس رچرڈ آرٹن، ایڈمز، ایک موشن رچرڈ ہابروں، گورڈن براؤن اور ڈیوڈ ملی بینڈ جیسے لوگوں کو "فرشتہ" بنا کر ہماری طرف بھجووارا ہے یہ لوگ پاکستان آتے ہیں یہ میں "ڈومز" کے ہمراز سے مارتے ہیں ہماری بے عزتی کرتے ہیں ہم پر ڈرون بھجواتے ہیں یہ ڈرون ہمارے سینکڑوں لوگوں پر ہم پھیلنے ہیں یہ لوگ ہمیں طالبان کے ساتھ گفتگو نہ آکرات اور معاہدوں سے دور رکھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں یہ میں امداد بھی نہیں دیتے ہیں یہ ہمارے قانون اور آئین میں اپنی مرتبی کی تہ بیلیاں بھی کرتے ہیں اور یہ ہمارے

یہ نت میں بھی اپنے لوگ شامل کر دیتے ہیں لیکن ہم ان سے سبق بھی نہیں سمجھتے آپ لوگ ہو سکتا ہے میرے
تھیس سے اتفاق نہ کریں لیکن آپ خود سوچنے ان "فرشتوں" کی کارروائیاں کیا ہیں؟ یہ اللہ تعالیٰ کی وہ
نضرت ہے جس کی ہم ہر نماز کے بعد دعا کرتے ہیں اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے وہ "فرشے" ہیں جو اپنے
مطلوبات کے ذریعے ہمیں سمجھا رہے ہیں کہ تم لوگ اتنے بے دوقوف ہو کہ تم اللہ کو چھوڑ کر انسانوں کے قدموں
میں جھک رہے ہو چنانچہ تم خسارے کا سودا کر رہے ہوں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ذریعے ہمیں یہ بھی سمجھا رہا ہے
کہ ڈیوڈ ملی بینڈ سے لے کر باراک حسین اور امام تک دنیا کا کوئی شخص تمہارا ہمدرد دوست اور مہربان نہیں اور
جب تک تم ان لوگوں کی شاخ کے ساتھ لٹکے رہو گے تم اس وقت تک خسارے میں رہو گے چنانچہ یہ شاخ
چھوڑ دوتا کہ تم غیروں کی دی ہوئی موت سے نج سکو آپ اگر اس کہانی کو ملک کے موجودہ حالات میں رکھ کر
دیکھیں تو آپ کو صوفی محمد اور طالبان بھی "نجیی امداد" دکھائی دیں گے یہ لوگ ہمیں اپنے اقدامات سے سمجھا
رہے ہیں کہ ہمارے نظام میں بے شمار خامیاں ہیں یہ نظام اس ملک کے عوام کو ہر ابری مساوات انصاف
روزگار تعلیم سکون اور صحت نہیں دے رہا یہ ایک غیر انسانی نظام ہے جس میں انسانوں کے ساتھ جانوروں
سے بدتر سلوک ہوتا ہے چنانچہ اس نظام میں بیشادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے یہ لوگ ہمیں یہ بھی بتا رہے ہیں
کہ اگر ہم خود ہی شریعت نافذ کر دیں ہم جدید تقاضوں کو سامنے رکھ کر اسلام کی تحریک کریں ہم اسلام کو مددہ
عرب امارات سعودی عرب اور مرکزی ایشی ملک طبع آج کے اناں بے تقاضوں کے قریب لے آئیں ہم
معاشرے کو کھول دیں اور اس میں ایک ایسی شریعت نافذ کر دیں جس میں دنیا کے قضاۓ بھی پورے ہو جائیں
اور ملک بھی ترقی کرے تو ہم وقت کے بہت بڑے بیان سے نج جائیں گے یہ لوگ ہمیں سمجھا رہے ہیں اگر
آپ نے ایمان کیا تو پھر تمہیں طالبان کی متشدد شریعت قبول کرنا پڑے گی اور بقول میاں نواز شریف پورے
پاکستان میں سوات جیسے حالات پیدا ہو جائیں گے چنانچہ میں سمجھتا ہوں طالبان سے لے کر رچہ ڈیا بر وک
تک یہ سب لوگ اللہ تعالیٰ کی نجیی امداد ہیں اور یہ ہمیں ان ڈائرکٹلی یہ سمجھا رہے ہیں کہ ہم غیروں کی شاخ
چھوڑ دیں ہم نج جائیں گے کیونکہ موت اور زندگی کے درمیان صرف دوست کا فاصلہ ہے۔



ڈالر کماو پالیسی

یہ بات بہر حال حقیقت ہے سوات میں آپریشن ناگزیر تھا۔ کیوں؟ کیونکہ سارے مالاکنڈ ڈویژن میں حکومت اور حکومت کی رٹ ختم ہو چکی تھی اور پورے علاقے میں عملاً طالبان کا ہولہ تھا۔ یہ لوگ سرکاری دفتروں اپلیس اسٹیشنوں اور لوگوں کی ذاتی املاک پر قابض تھے اور انہوں نے 25 لاکھ لوگوں کو رینال ہنا رکھا تھا چنانچہ علاقے کا بقہہ چھڑانے اور گورنمنٹ کی رٹ قائم کرنے کیلئے یہ آپریشن ناگزیر تھا لیکن یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے آپریشن کے بعد کیا ہو گا؟ کیا آپریشن کے بعد طالبان مکمل طور پر ختم ہو جائیں گے؟ کیا آپریشن کے بعد طالبان کا فلسفہ بھی دم توڑ دے گا؟ کیا علاقے میں امن ہو جائے گا اور یہ امن کتنی دیر قائم رہے گا؟ وہ تمام لوگ جن کے حوالہ بر شے اور اور وہ اس آپریشن میں ہلاک ہوں اُنکے اور جن لوگوں کی زمین جائیداد اور پر اپنی تباہ ہو گی کیا وہ لوگ 2009ء کو بھول سکیں گے؟ وہ بارہ لاکھ لوگ جو اپنے گھر دکانیں اور جائیداد چھوڑ کر مہاجر ہو گئے ہیں، جنہیں کمپوں تک پہنچنے کیلئے کئی کمی دن پیدل سفر کرنا پڑتا ہے جن کے پیچے دودھ بوزھے دوا اور نوجوان روزگار کیلئے ترس رہے ہیں وہ لوگ جو گرفتاری کے اس موسم میں کھلے آسان تھے پڑے ہیں اور جن کی خاتمیں کی بے پر دگی ہو رہی ہے اور وہ تمام لوگ جو کل تک اوپر والا با تھجھ تھے لیکن آج وہ دو وقت کی روٹی کیلئے قطاروں میں کھڑے ہیں کیا یہ لوگ دوبارہ اپنے گھروں کو لوٹ سکیں گے اور اگر ہاں تو کی انہیں 2006ء اور 2007ء کی زندگی واپس مل سکے گی؟ اگر نہیں تو پھر یہ لوگ کمپوں میں کتنی دیر زندگی گزاریں گے؟ اس عرصے میں ان کی چند باتیں، معاشرتی اور نسیاہی صورت حال کیا ہو گی؟ اور ان کی بھثتری میں کیا کیا تبدیلیاں آئیں گی؟ یہ وہ سوال ہیں جن کا جواب ہمیں جلد سے جلد تلاش کرنا ہو گا کیونکہ اس آپریشن کے نتائج ان سوالوں کے جواب میں پوشیدہ ہیں اور ہم ان جوابوں کی تلاش میں جتنی تاخیر کریں گے آپریشن کے نتائج بھی ہم سے اتنے ہی دور ہوتے چلے جائیں گے لیکن ان جوابوں سے پہلے ہمیں ایک اور سوال کا جواب بھی تلاش کرنا ہو گا اور یہ ہماری قومی بقاء کا سوال ہے سوال یہ ہے حالات کو اس نجح تک پہنچایا کس نے تھا؟ وہ کون تھا جو اس ملک کو اس سطح تک لے آیا کہ آج یہ ملک انتظامی لحاظ سے معطل ہو چکا ہے اس کا کوئی سرکاری ادارہ کام نہیں کر رہا اور عموم بے بسی سے آسان کی طرف دیکھ رہے ہیں؟ یہ آج کے پاکستان کا سب

سے بڑا سوال ہے لیکن میرے پاس اس کا جواب موجود ہے!

پاکستان کے موجودہ حالات کی ذمہ دار ہماری ڈالر کماو پالیسی تھی یہ پالیسی جزء ضایاء الحق کے دور میں پیدا ہوئی تھی، جزء ضایاء الحق اور ان کے رفقاء نے 1980ء میں سوویت یونین کی "گولڈ مائین" سے استفادے کا فیصلہ کیا تھا، ان لوگوں نے اپنے غیر جمہوری اقتدار کو دوام دینے "ڈالفار علی بھٹو کے سیاسی بھوت سے جان چھڑانے اور حرص کے اندر ہی کنوں ڈالروں سے بھرنے کیلئے امریکہ کی طرف ہاتھ بڑھادیا، یہ لوگ امریکہ کیلئے کرائے کے فوجی بن گئے امریکہ اس وقت سوویت یونین کو گرم پانچوں سے دور رکھنے کیلئے سستے سرفرازوں کی خلاش میں تھا، ہم لوگ آگے بڑھتے تو امریکہ نے ہمیں لپک کر بینے سے لگایا اور یوں جزء ضایاء الحق کے رفقاء ڈالر کمانے کیلئے سوویت یونین امریکہ افغانوں اور آخر میں خود اپنے لوگوں کو دھوکہ دیتے گئے، پوری دنیا جانتی تھی وہ لوگ جنہیں شہادت کا ذوق دے کر افغانستان بھجوایا جا رہا ہے یہ لوگ جب واپس اپنے علاقوں میں آئیں گے تو ملک کی بیت بدلت جائے گی، وہ عرب مجاہدین جنہیں مصر، اردن، شام، سعودی عرب، عراق اور سوڈان کی جیلوں سے نکال کر پاکستان اور افغانستان کے قبائلی علاقوں میں آباد کیا جا رہا ہے یہ لوگ پاکستان کا حشر کر دیں گے اور ہم نے جن 40 لاکھ افغانوں کیلئے اپنی سرحدیں کھول دی ہیں یہ لوگ پاکستان کی نفیات، معاشرت اور ثقافت بدل کر رکھ دیں گے، ہم اس حققت سے والتف تھے لیکن ڈالر کماو نافیا ان حقائق سے بے پرواہ ڈالر کماتا چلا گیا ہماری اس پالیسی کے نتیجے میں ملک میں ہیر و گن آئی لیکن ہماری رو لنگ کا اس خاموش رہی کیونکہ اسے ڈالر مل رہے تھے، ملک میں کاشتکوف آئی لیکن ہمارا بر سر اقتدار طبقہ خاموش رہا کیونکہ اسے ڈالر مل رہے تھے، ملک میں دہشت گردی، شدت پسندی اور بے روزگاری آئی لیکن ہمارے حکمران خاموش رہے کیونکہ انہیں اس بے روزگاری، شدت پسندی اور دہشت گردی کا معاوضہ مل رہا تھا، افغان جنگ کے بعد افغانستان کے وار لار ڈکھائی دے رہے تھے افغانستان کی خانہ جنگی پر جشن منایا کیونکہ انہیں افغانوں کی خانہ جنگی میں ڈالر زد کھائی دے رہے تھے، ہم نے اس خانہ جنگی کے بعد طالبان کا ظہور ہوا تو ہم نے طالبان کی پورش کیلئے بھی ڈالر لینا شروع کر دیئے، آپ دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دیجئے یہ طالبان کن کی پیداوار تھے؟ کیا ان کے پیچھے مجرم جزء (ریٹائر) نصیر اللہ باہر ہمارے خفیہ اداروں اور ہماری وزارت خارجہ کا ہاتھ نہیں تھا اور کیا ہم 1994ء سے 2001ء تک دنیا میں طالبان کا بخار نہیں بیچتے رہے، ہم نے طالبان کے نام پر ڈالنیں کیا؟ اور نائن الیون کے بعد جب طالبان پر براؤقت آیا تو کیا ہم نے ایک بار پھر امریکہ سے ڈالنیں کیا تھے؟ کیا جزء ضایاء الحق پر وزیر مشرف نے امریکہ کو لاجٹک پورٹ ہوانی اڑائے اور رسدر فرما ہم کر کے ڈالنیں کیا تھے؟ ہم نے تو بقول مشرف "امریکہ کو اس کے مطلوب لوگ پکڑ کر دیئے تھے اور کئی میں ڈالر مصوں کے تھے" کیا ہم نے امریکہ سے ڈالر مصوں کرنے کیلئے طالبان کو جان بوجھ کر قبائلی علاقوں میں جگہ بنانے کا موقع نہیں دیا تھا، کیا ہم مغربی دنیا کو پاکستانی طالبان کا خوف نہیں بیچتے رہے اور کیا

ہم نے ڈالر کماڈ پالیسی کے تحت بیت اللہ محسود منگل باغ، مولوی فضل اللہ اور مسلم خان وغیرہ کو شمالی و جنوبی دہشتگاری سے لے کر امام ڈیجیری تک موجود ہے، بنانے اور لشکر تیار کرنے کا موقع نہیں دیا اور کیا ہم اس خوف کا دنیا کے دوسرے گونے تک پھیلنے کا انتظار نہیں کرتے رہے؟ ہمیں مانتا ہیں کہ ان 99 فیصد "کیا" کا جواب بد قسمتی سے ہاں ہے چنانچہ یہ ہماری غلطیوں کی وہ فعل ہے جسے اب کائے بغیر گزارہ نہیں۔

ہم فعل کائے کیلئے تیار ہیں لیکن سوال یہ ہے کیا ہم اس بار مختلف ہیں؟ کیا ہم اس بار ڈالر کماڈ پالیسی سے ہٹ کر دل کی گہرائیوں سے ملک کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں؟ کیا ہم حقیقتاً یہ سمجھ گئے ہیں ہم جب تک بول کے جن کو واپس بول میں بند نہیں کریں گے ہم اس وقت تک سکھ کا سانس نہیں لے سکیں گے، افسوسی سے کہنا پڑتا ہے شاید نہیں ہم شاید اس بار بھی خود کو دھوک دے رہے ہیں ہمارے اقدام کے متون شاید اس بار بھی ایک دوسرے کے ساتھ کھیل رہے ہیں ہم شاید اس بار بھی ڈالر کمانے کے چکر میں ہیں؟ اور یہ وہ غلطی ہے جو ہمیں ایک ایسے اندھے غار میں لے جا رہی ہے جس کے آخر میں امید کی کوئی کرن موجود نہیں، ہم بد قسمتی سے مرکس کے وہ فنکار ہیں جو پیٹ کی بجوک مٹانے کیلئے اپنے ہی جسم کو آری سے کافتا ہے، لوگ اس کے فن پر تالیاں بجاتے ہیں پر فارمنس کے آخر میں اس کے ہیٹ میں چند ڈالر ڈال دیتے ہیں اور واہ واہ کرتے ہوئے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں جبکہ مرکس کا فنکار اپنے جسم کے ساتھ کھیل کھیل کر ایک دن تماشائیوں کے درمیان دم تو زدیتا ہے اور اگلے ہی دن اس کی جگہ کوئی نیا فنکار آ جاتا ہے؟ ہمیں مانتا ہیں کہ ہم دھوک دینے، دھوک کھانے اور اپنے آپ کو زخم لگانے کی ہری عادت میں بجا ہو چکے ہیں اور ہم نے آج تک اپنی تاریخ اور اپنی غلطیوں سے کچھ نہیں سیکھا، ہم نے اگر اپنی غلطیوں سے سیکھا ہوتا، ہم نے اگر سنجھنے یا تاریخ کا کفارہ ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہوتا تو آج واشنگٹن اور نیویارک سے بری خبریں شا آری ہوتیں، واشنگٹن میں سفیر پاکستان نے سرکاری خرچ سے دو ہزار لوگوں کو عشا نیہ نہ دیا ہوتا، صدر محترم کا پانچ دن کا آفیشل وزٹ بارہ دنوں تک طویل نہ ہوتا، ہمارے محترم وفاقی وزیر نیویارک کی سرہٹ 46 میں نشے کی حالت میں گوروں سے نہ الجھ رہے ہوتے اور نیویارک کے فنکشن میں صدر محترم کی موجودگی میں جیا لوں کے درمیان جنگ نہ ہوتی اور لوگ ایک دوسرے کے کپڑے نہ پھاڑتے اور صدر آصف علی زرداری "لاست" مودہ میں پاکستانی میڈیا کو "نابالغ"، "قرار نہ دیتے" یہ کیا ہے؟ پاکستانی ڈیگیشن امریکہ میں آج کس بات کا جشن منا رہا ہے؟ کیا یہ جشن بھی ہماری ڈالر کماڈ پالیسی کا تسلسل نہیں؟ کیا ہماری حکومت سو اس کے 12 لاکھ لوگوں کو سڑکوں اور گیپوں میں لا کر خوشی نہیں منا رہی اور کیا ہم ان لوگوں کے اترے ہوئے چہرے دنیا کو دکھا کر مزید ڈالر نہیں مانگیں گے؟ یہ وہ حقیقتیں ہیں جو ہمارے دروازے پر دستک دے رہی ہیں لیکن ہم آنکھیں بند کر کے آج کے دن کو انجوانے کر رہے ہیں اور ہم اس وقت تک اسے انجوانے کرتے رہیں گے جب تک فنکار تماشائیوں کے سامنے دم نہیں تو رہتا یہ ہے ہماری پالیسی ڈالر کماڈ پالیسی۔

جزل دیپک کپور کو بھی میڈل دے دیں

میں نے بھی پوری قوم کے ساتھیں تسلی ویژن پر بھارت کے آرمی چیف جزل دیپک کپور کی پریس کا نفرس دیکھی، جزل دیپک کپور کے لبجے میں فوجی تکنیکت، غرور اور اکھڑ پن تھا اور وہ کیمروں کی آنکھیں آنکھیں میں ڈال کر کہہ رہے تھے "ہمارے پاس جنگ سیست تھام آپشن موجود ہیں" جزل دیپک کپور کا لبجہ غرور اور حکمکی پوری قوم کے دل پر لگی اور کل سے پاکستان کے صحافی، دانشوار، تسلی ویژن ایکٹر، سیاستدان اور جریش بھارتی آرمی چیف کو جواب دے رہے ہیں یہ 1971ء کے بعد بھارت کے کسی آرمی چیف کی پہلی پریس کا نفرس تھی اور اس پریس کا نفرس کے دو مقاصد تھے اول پاکستان کو تباہی کی سمجھیگی سمجھانا اور دوم عالمی میڈیا کو غزہ سے باک افڑیا ٹینشن کی طرف کھینچ کر واپس لانا، دسمبر 2008ء تک پاکستان اور بھارت کی ٹینشن عالمی میڈیا کی "بائی ٹیوز" تھی اور بھارت اس سورجخال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان کو زیادہ سے زیادہ بدنام کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن پھر اچانک اسرائیل نے غزہ پر حملہ کر دیا اور عالمی میڈیا کی نظریں، قلم اور کیمرے والی سے غزہ پر شفت ہو گئے یوں بھارت عدم توجہ محسوس کرنے لگا چنانچہ اس نے "میں بھی تو ہوں" کی تکنیک استعمال کی اور اپنا آرمی چیف میدان میں دھکیل دیا، یہ تکنیک کامیاب ہوئی چنانچہ کل سے پوری دنیا کا میڈیا بھارتی آرمی چیف کی "ایروگینس" دکھارا رہا ہے۔

بھارت کا یہ کارڈ کس حد تک کامیاب رہے گا یہ سوال اپنی جگہ اہم ہے لیکن اس سے کہیں اہم سوال بھارت کی یہ جسارت ہے؟ بھارت نے اپنی فوج کو ہمیشہ سیاست انوں کے پیچھے رکھا، اس نے بھی فوجی سربراہوں کو آگے آ کر کھینچنے کی اجازت نہیں دی، بھارت کے پہلے اندرین آرمی چیف نے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کو ریٹائرمنٹ سے چھ ماہ پہلے ملازمت میں توسعی کی درخواست دے دی تھی، آرمی چیف کا کہنا تھا وہ فوج کو نئی بنیادوں پر استوار کر رہے ہیں اور انہیں اپنے کام کی تکمیل کیلئے تھوڑا سا مزید عرصہ چاہیے، نہرو کو اس درخواست میں بغاوت نظر آئی لہذا انہوں نے اسی وقت آرمی چیف کو بلوایا اور اس سے استعفی لے لیا اور اس سے جو نیز افسر کو آرمی چیف ہنا دیا یہ جو نیز افسر بھی چند ماہ بعد ریٹائر ہو گیا، اسی طرح آپ فیلڈ مارشل ماںک شاہ کی مثال لجھے، جزل ماںک شاہ کی قیادت میں بھارتی فوج نے 1971ء کی جنگ لڑی تھی اور پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا، بھارتی وزیر اعظم اندرانگاندھی نے نہ صرف اس کارناتے پر لوگ سجا میں جزل ماںک

شاہ کیلے تالیاں بجوائیں بلکہ اسے فیلڈ مارشل کا اعزاز بھی بخشنا، بلکہ دلیش کے قیام کے چند ماہ بعد جزل مانک شاہ اندر اگاندھی سے ملے اور انہیں سیاستدانوں کو تحریک کرنے کے چند نئے ہتائے وزیرِ اعظم نے انہیں اگلے دن ڈینفس سیکرٹری سے ملنے کا حکم دیا، مانک شاہ دوسرے دن ڈینفس سیکرٹری کے پاس گیا تو اسے پڑا چلا وزیرِ اعظم نے اسے فوج سے بر طرف کر کے اندرین فٹ بال فیڈریشن کا سربراہ بنادیا ہے، بھارت نے فوجی ہر جملوں کے باوجود ایک پیور سے ہمیشہ پرہیز کیا چنانچہ جس وقت میں الاقوامی میگزینز ہمارے آری چیف جزل اشفاق پر دریز کیا تھی کو دنیا کی 50 طاقتور ترین شخصیات میں شمار کرتے ہیں اس وقت دنیا بھارتی آری چیف کے نام اور شکل تک سے واقع نہیں ہوتی لہذا بھارت کا اپنے آری چیف کو بیان بازی کے میدان میں لانا حقیقتاً تشویشاً کہے اور ہمیں بھارت کے اس اقدام کو "لاک" نہیں لیتا چاہیے۔ یہاں پر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے بھارت اپنی پالیسی میں اتنی تبدیلی کیوں لے آیا اس کی وجہ پر روشنی ڈالنے سے پہلے میں آپ کو بھارت کے سابق وزیرِ خزانہ اور وزیر خارجہ یثونٹ سہما اور مشاہدہ ہیں سید کے درمیان ایک مکالمہ سنانا چاہتا ہوں میں نے چند دن پہلے اپنے اُلیٰ پروگرام "کل تک" میں بھارت سے یثونٹ سہما اور پاکستان سے مشاہدہ ہیں سید کو مدعو کیا تھا یثونٹ سہما بھارت کی دوسری بڑی سیاسی جماعت بی بے پی کے متحرک رہنما ہیں وہ پاکستان اور بھارت کے درمیان "پیس پر ایس" میں بھی بڑے "ایکٹو" رے تھے لیکن بھی کے سامنے کے بعد بی بے پی اور یثونٹ سہمانے اپنی پالیسی تبدیل کر لی یثونٹ سہمانے دہبیر میں جماں میڈیا کو بیان دیا، اثدیا کو پیس پر ایس ختم کر کے پاکستان پر حملہ کر دینا چاہیے میں نے پروگرام میں ان سے پوچھا "آپ کی پالیسی میں اتنی بڑی ثفت کیوں آگئی" یثونٹ سہمانے جواب دیا "ہم نے اندازہ لگایا ہے پاکستان صرف طاقت کی زبان سمجھتا ہے" مشاہدہ ہیں سید نے لفڑ دیا "آپ کا یہ خیال غلط ہے" یثونٹ سہمانے جواباً کہا "میں آپ سے ایک سوال پوچھتا ہوں، اگر اثدیا پاکستان کی طرف ڈروز بھجوائے تو آپ کیا کریں گے" مشاہدہ ہیں صاحب نے جواب دیا "ہم فوراً اس جارحیت کا جواب دیں گے" سہما نے جواباً کہا "امریکہ دو سال سے اپنے ڈروز پاکستان بھجو رہا ہے یہ ڈروز پاکستانی سر زمین پر میزائل بھی گراتے ہیں ان میں آپ کے لوگ بھی مارے جاتے ہیں لیکن آپ ان ڈروز کا کوئی جواب نہیں دیتے کیوں؟" مشاہدہ ہیں سید کے پاس اس "کیوں" کا کوئی واضح جواب نہیں تھا سہمانے چند لمحے توقف کے بعد کہا "اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان امریکہ سے دبتا ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں پاکستان کو جو ملک دبائے گا یہ اس کے سامنے دب جائے گا اور جو اس کے ساتھ پرانی طریقے سے گفتگو کرے گا یہ اس کی بات کو نا سیریس سمجھے گا" میں نے یثونٹ سہما کے اس تاثر کے جواب میں ان سے کہا "اثدیا امریکہ ہے اور نہ ہی پاکستان افغانستان آپ لوگ پاکستان کے معاملے میں امریکہ بننے کی کوشش نہ کریں اس کے نتیجے میں فٹے میں ایٹھی جنگ ہو جائے گی"۔

ہم اگر جذبات کو ایک طرف رکھ کر یثونٹ سہما کی بات پر غور کریں تو ان کی بات غلط نہیں تھی، ہم دو سال سے دصرف امریکن ڈروز کے حملے برداشت کر رہے ہیں بلکہ بڑی حد تک ان جملوں کی حوصلہ افزائی بھی

کر رہے ہیں، امریکن شیٹ ڈپارٹمنٹ کے اسٹنٹ سیکرٹری رچرڈ باؤچر ہمیشہ "برداشت کرو" کا پیغام لے کر پاکستان آئے اور ہم نے ان خدمات کے عوام انہیں پاکستان کا دوسرا بڑا سول ایوارڈ ہلال قائد اعظم دے کر بیشونت شہا کی بات صحیح تابت کر دیا، ہم نے ثابت کر دیا ہم طاقتوروں کے سامنے نہ صرف دبئے ہیں بلکہ انہیں میڈلز سے بھی نوازتے ہیں، اسی طرح ہم نے امریکہ کے نو منتخب نائب صدر جوزف بائیڈن کو پاکستان کا سب سے بڑا ایوارڈ ہلال پاکستان پیش کیا، اس ایوارڈ کو وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے یہ کہہ کر "جسمی فائی" کیا کہ جوزف بائیڈن نے صدر پروپری مشرف کی یونینکارم اتروانے اور پاکستان میں جمہوریت لانے میں مرکزی کردار ادا کیا تھا، آپ اس جسمی فیشن اور اس میڈل سے اندازہ لگا لجئے ہم دنیا کو کیا پیغام دے رہے ہیں، کیا ہم دنیا کو یہ نہیں بتا رہے، ہم اس قدر کمزور ہیں کہ امریکہ پاکستان پر ڈرہونز کے ذریعے 42 مرتبہ حملے کرتا ہے، ان جنلوں میں ہمارے سازھے پالجی سوہنی شہید ہوتے ہیں اور ہم ان شہریوں کے قاتمکوں کو میڈل سے نوازتے ہیں، کیا ہم دنیا کو یہ نہیں بتا رہے کہ ہماری سیاسی جماعتیں اور ہمارے عوام میں اتنا دم فہم بھی نہیں کہ وہ اقتدار پر قابض جرنیل کی یونینکارم ہی اتنا سکیں اور ہمیں ملک میں جمہوریت قائم کرنے کیلئے بھی امریکہ کی ضرورت پڑتی ہے، کیا ہم پوری دنیا کو کمزوری کا پیغام نہیں دے رہے؟، مجھے بعض اوقات محسوس ہوتا ہے ہم لوگ کبھی نہ کبھی افغانستان اور پشاور میں بلاک ہونے والے امر کی فوجیوں کو نشان حیدر بھی پیش کر دیں گے کیونکہ امریکہ کے فوجی بھی دہشت رہی کے خلاف "ہماری جنگ" لڑ کر پاکستان کی خدمت گر رہے ہیں۔ یہ وہ حقائق ہیں جنہوں نے بھارت کو اپنی پالیسی تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا چنانچہ وہ بھی اب ہمیں ڈرانے اور دھمکانے کیلئے اپنے جرنیلوں کو میدان میں لے آیا اور آج ان کا آری چیف بھی رچرڈ باؤچر کی طرح ہمیں "یہ کرو وہ کرو وہ ہمارے پاس سارے آپشن کھلے ہیں" کی دھمکی دے رہا ہے، میں نے بھیجن میں ساتھا جب مکین ٹھن کی گری ہوئی دیواریں تعمیر نہیں کرتے تو سارا گاؤں اس گھر کو راستہ بنایتا ہے، ہم نے امریکن ڈرونز کے حملے برداشت کر کے اور اپنے قاتمکوں کو اعزازات دے کر اپنے ٹھن کو طاقتور قوموں کا راستہ بنادیا ہے، چنانچہ آج بھارت بھی امریکہ کی پیروی کیلئے تیار بیٹھا ہے، دنیا کا اصول ہے جب کوئی انسان ایک بار عزت غیرت اور جرأت سے محروم ہو جاتا ہے تو اسے اپنی کھوئی ہوئی جرأت غیرت اور عزت دوبارہ واپس نہیں ملتی اور ہم ان تینوں خوبیوں سے محروم ہو چکے ہیں لہذا آج بھارت بھی اپنے بوث ہماری نوپی سے صاف کرنے کے منصوبے بناتا ہے، چنانچہ جائیئے اب میں موبائل ٹکٹھ پر ناب مکھر بھی اور جزیل دیپک کپور کو بھی تمذق شجاعت ہلال قائد اعظم اور ہلال پاکستان دے دیجئے، انہیں بھی سرجیکل سڑائیک کی اجازت دے دیں، کیا فرق پڑتا ہے جہاں امریکہ کے میزائل وہاں بھارتی میزائل بھی کسی جہاں امریکہ کا ڈومور وہاں بھارتی ڈومور بھی کسی آپ بھارت کو بھی دوچار ہزار پاکستانی مار لینے دیں، آخر میں ان سے بھی بل وصول کر لیں گے، ان سے بھی امداد لے لیں گے، آخر ہم نے اس ملک کی معیشت اسی طریقے سے تو نمیک کرنی ہے۔



بے چارہ سوالی ہے، بے چارہ بھکاری ہے

نام تو طیبہ تھا لیکن عرب اسے پرثرب کہتے تھے، عربی میں پرثرب تکلیف اور بیماری کے مقام کو کہا جاتا ہے، یہ بات حقی بھی درست، پورے عرب میں سب سے زیادہ بارشیں اسی علاقے میں ہوتی تھیں لہذا وادی میں زہریلے مادے پیدا ہو گئے تھے، جو بھی طیبہ میں قدم رکھتا بیمار ہو جاتا لیکن پھر وہاں میرے حضور ﷺ تشریف لائے، محققین کہتے ہیں یہ اگست 622ء کا پہلا ہفتہ تھا لیکن کچھ کا خیال ہے یہ اکتوبر کا مہینہ تھا۔ آپ ﷺ قبائلے قبا میں چودہ دن قیام کے بعد پرثرب میں داخل ہوئے تو بونجار کی بچیوں نے دف بچا کر استقبال کیا، اس واقعے کے ایک ہزار تین سو اسی برس ایک ماہ اور 23 دن بعد ہم مُحَمَّدؐ اس جگہ کھڑے تھے، سامنے ایک قدیم قلعہ کے آثار تھے، شیخ الدین ڈاکٹر شیر علی نے قلعے کی طرف اشارہ کر کے ہاتھا گوہ بچیاں وہاں کفری ہو کر دف بخاری تھیں، قریب ہی ایک مسجد تھی، بتایا گیا "حضور ﷺ نے یہاں ہجرت کی پہلی نماز جمعہ ادا فرمائی تھی" قلعے اور مسجد کے درمیان ایک احاطہ تھا اور احاطہ میں ایک چھوڑتے کے آثار تھے، وہاں رسول اللہ ﷺ نے ایک صحابیٰ کی درخواست پر نماز ادا کی تھی، پکلوں پر آنسو آبشار کی طرح گرنے لگے، حضور ﷺ یہاں سے آگے بڑھے تو پرثرب مدینہ بن گیا اور طیبہ منورہ اور پھر یہ شہر دنیا میں سکون، ایمان، شفا اور قبولیت کا مرکز ہو گیا، یہ شہر کیا ہے؟ آپ اس کی حدود میں داخل ہوتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سلسلے کوکنوں پر چلتے چلتے اسی وادی میں آگئے جہاں گلاب کی نرم پیتاں بھی ہیں اور ہوا عنبر اور ملک کے بطن سے جنم لے رہی ہے، دنیا بھر کے درخت دن کو آجیجن اور رات کو کاربن ڈائلی آکسائیڈ بناتے ہیں ماسوائے میلین کے اشجار کہ یہ بے ادبی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے عربی کا ایک شعر پڑھا، وہ کیا نازک احساس اور ہزاروں لاکھوں پھولوں کی گندمی فکر تھی، شاعر نے کہا "اگر تمہیں مدینے میں سکون نہیں ملتا تو پھر کہاں ملے گا، اگر تمہاری دعائیں میں قبول نہیں ہوتیں تو پھر کہاں ہوں گیں!!"

النصار کو بڑی شدت سے حضور ﷺ کا انتظار تھا، وہ روز صحیح گروں سے نکلتے اور شہر سے باہر آ کر آپ ﷺ کا انتظار کرنے لگتے، سورج ڈوبتا تو ساتھ ہی آس بھی ڈوب جاتی لیکن صحیح سورج کے ساتھ شوق دید پھر آنکھ کھول لیتا، اس دن بے انتبا گرمی تھی، لوگ شام سے پہلے ہی مایوس ہو گئے لیکن جو نبی حضور ﷺ کی اونٹی

نے قبائلیں قدم رکھا، ایک یہودی نے آپ ﷺ کو دیکھا اور "اے لوگو! تمہارا نجات ہندہ آگیا" کا نعرہ لگا کر گلیوں میں دوڑنے لگا، امید ہیں ایک بار پھر طلوع ہو گیں۔ چودہ دن بعد آپ ﷺ مدینہ کے لئے روانہ ہوئے تو سینکڑوں جاں ثار دائیں باسیں چل رہے تھے۔ یہ انصار تھے وہ انصار جنہوں نے آپ ﷺ کے راستے میں آنکھیں بچائیں۔ آپ ﷺ کے ساتھیوں کو اپنے گروں، بھتیوں، باغوں اور دکانوں میں حصہ دیا اور بدلتے میں حضور ﷺ کو پایا۔ تاریخ کو ختنیں کی وہ شام کبھی نہیں بھوتی جب میرے حضور ﷺ نے نو مسلم مکیوں کو مال خیمت سے زیادہ حصہ دیا، چند نادان انصار نے یہ تقسیم تاپنے کی آپ ﷺ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا "کیا تم کو یہ پسند نہیں لوگ اونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم محمد ﷺ کو لے کر اپنے گھر آؤ" انصار بے اختیار ہو کر چیخیں "ہمیں صرف رسول اللہ ﷺ درکار ہیں" اور پھر وہاں گریہ کا سیالب آگیا، داڑھیوں سے آنسو منکنے لگے، قریش اونٹ اور بکریاں لے گئے اور انصار کو حضور ﷺ مل گئے۔ یہ اعزاز اب دنیا کی کوئی طاقت اہل مدینہ سے نہیں چھین سکتی۔

انصار مہمان نواز تھے، اللہ کے نبی ﷺ سے بے انہما محبت کرتے تھے، آج بھی مدینہ کے شہری کسی اجنبی کو دیکھتے ہیں تو اُسے محمد کہہ کر پکارتے ہیں اور ساتھی کو یا صدیق اللہ ایہ دنیا کا واحد شہر ہے جس میں ہر مہمان، ہر اجنبی کا نام محمد اور ہر ساتھی صدیق ہے۔ انصار نے حضور ﷺ کی تواضع کی اور ان کی شلیس حضور ﷺ کے مہمانوں کی خدمت کر رہی ہیں۔ رمضان میں پورا مدینہ اشیاء خور و دنوش لے کر مسجد نبوی ﷺ حاضر ہو جاتا ہے دستر خوان بچا دیئے جاتے ہیں، میزبانوں کے پیچے مسجد نبوی ﷺ کے دالانوں، ستونوں اور دروازوں میں کھڑے ہو جاتے ہیں، حضور ﷺ کا جو بھی مہمان نظر آتا ہے وہ اس کی نالگوں سے لپٹ کر افطار کی دعوت دیتے ہیں۔ مہمان دعوت قبول کر لے تو میزبان کے چہرے پر روشنی پھیل جاتی ہے، نامنظر کر دے تو میزبان کی پلکیں گلی ہو جاتی ہیں، میں مسجد نبوی ﷺ میں داخل ہوا تو ایک سات آٹھ برس کا بچہ میری نالگ سے لپٹ گیا اور بڑی محبت سے کہنے لگا "بچا، بچا آپ میرے ساتھ بیٹھیں گے" میرے مخدود وجود میں ایک نیالگوں شعلہ لرز اٹھا، میں نے جھاک کر اس کے ماتھے پر بوسا دیا اور سوچا "یہ لوگ واقعی مستحق تھے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے اللہ کے کھر سے اٹھ کر ان کے گھر آئھرتے اور پھر واپس نہ جاتے۔"

وہاں روضہ اطہر کے قریب ایک دروازہ ہے، باب جبرائیل، آپ ﷺ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے جھرہ مبارک میں قیام فرماتے تھے، افطار کا وقت ہوتا، دستر خوان بچھتا، لگر میں موجود چند بکھوریں اور دودھ کا ایک آردہ پیالہ اس دستر خوان پر پہن دیا جاتا، حضرت بمال اذان کے لئے کھڑے ہوتے تو آپ فرماتے "عائشہؓ باہر دیکھو باب جبرائیل کے پاس کوئی مسافر تو نہیں" آپ اٹھ کر دیکھتیں، واپس آکر عرض کرتیں "یا رسول اللہ ﷺ وہاں ایک مسافر بیٹھا ہے۔" آپ ﷺ بکھوریں اور دودھ کا وہ پیالہ باہر بچھوادیتے، میں جو نبی باب جبرائیل کے قریب پہنچا، میرے چیزوں کے ناخنوں سے رانوں کی ہڈیوں تک ہر چیز پتھر ہو گئی، میں وہی

بینہ گیا، باب جبراہل کے اندر فرما ہٹ کر حضرت عائشہؓ کے چھرے میں میرے حضور ﷺ آرام فرمائے ہیں۔ میں نے دل پر ہاتھ درکھ کر سوچا، آج بھی رمضان ہے، ابھی چند لمحوں بعد اذان ہو گی، ہو سکتا ہے آج بھی میرے حضور ﷺ حضرت عائشہؓ سے پوچھیں "قداد کیمے باہر کوئی مسافر تو نہیں" اور ام المومنین عرض کریں گی "یا رسول اللہ ﷺ باہر ایک مسافر بیٹا ہے، شکل سے مسکین نظر آتا ہے، نادم ہے، شرمسار ہے، تھکا ہارا ہے، سوال کرنے کا حوصلہ نہیں، بحکاری ہے لیکن مانگنے کی جرأت نہیں، لوگ یہاں کشکول لے کر آتے ہیں یہ خود کشکول بن کر آگیا، اس پر رحم فرمائیں یا رسول اللہ ﷺ، یتھارہ سو والی ہے، بے چارہ بھکاری ہے" اور پھر میرا پورا وجود آگئیں بن گیا اور سارے اعضاء آنسو۔



اس سے پہلے کہ مہلت ختم ہو جائے

نواز شریف نے مولانا سے عرض کیا "حضرت آپ یہ حدیث مبارکہ کا بینہ کو سنادیں گے۔" مولانا نے درخواست قبول کر لی۔

یہ 1999ء کے تمبر کی بات ہے۔ مولانا طارق جبیل وزیر اعظم سے ملاقات کے لئے پرائم نظر ہاؤس گئے۔ نواز شریف ان دنوں بہت پریشان تھے۔ مولانا نے فرمایا، جناب عذاب و حشم کے ہوتے ہیں۔ زمینی اور آسمانی۔ زمینی آفتوں کے حل کے لئے تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے چند اصول وضع کر دیے ہیں۔ رہی آسمانی آفتیں تو ان کا صرف ایک ہی حل ہے "توبہ"۔ مولانا نے ساتھ ہی حدیث مبارکہ کا ذکر کیا اور فرمایا دنیا کے 25 مسائل ہیں۔ فرد ہو یا قوم انہیں 25 مسائل کا سچکار ہوتے ہیں۔ ان کا عالم اللہ کے رسول ﷺ نے کچھ یوں تجویز فرمایا۔ نواز شریف حدیث مبارکہ کرنے کر چونکہ اسے۔ مسائل اور ان کے حل یوں سامنے پڑے تھے جیسے میز پر قبوے کی پیالیاں، وزیر اعظم فرط جذبات سے کھڑے ہوئے اور مولانا سے بغل گیر ہو کر عرض کیا "حضرت آپ یہ حدیث مبارکہ کا بینہ کو سنادیں گے۔" مولانا نے درخواست قبول کر لی۔

مولانا طارق جبیل پچھلے بیٹھے اسلام آباد تشریف لائے۔ انہوں نے مجھے شرف بازیابی بخش، گفتگو شروع ہوئی تو نواز شریف کا ذکر ہوا۔ میں نے وہ حدیث مبارکہ دہرانے کی درخواست کی۔ مولانا دوز انو ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا۔ ایک بدو رسول اللہ ﷺ کے دربار میں حاضر ہوا اور عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ فرمایا، ہاں کہو۔ دربار میں اس وقت حضرت خالد بن ولید بھی موجود تھے۔ انہوں نے یہ حدیث مبارکہ تحریر کر کے پاس رکھ لی بعد ازاں یہ فرمان کنز العمال مند احمد میں نقل ہوا۔ بد نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ میں امیر (غنی) بننا چاہتا ہوں، فرمایا تقویٰ اختیار کرو عالم بن جاؤ گے۔ عرض کیا میں سب سے بڑا عالم بننا چاہتا ہوں، فرمایا تقویٰ اختیار کرو عالم بن جاؤ گے۔ عرض کیا، اچھا انسان بننا چاہتا ہوں۔ فرمایا، مغلوق کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہند کر دو باعزت ہو جاؤ گے۔ عرض کیا، اچھا انسان بننا چاہتا ہوں۔ فرمایا، لوگوں کو لفظ پہنچاؤ۔ عرض کیا، عادل بننا چاہتا ہوں۔ فرمایا، جو اپنے لئے اچھا سمجھتے ہو وہی دوسروں کے لئے پسند کرو۔ عرض کیا، طاقتور بننا چاہتا ہوں۔ فرمایا، اللہ پر توکل کرو۔ عرض کیا، اللہ کے دربار میں خاص (خصوصیت) درج

چاہتا ہوں۔ فرمایا، کثرت سے ذکر کرو۔ عرض کیا، رزق کی کشادگی چاہتا ہوں۔ فرمایا، ہمیشہ باوضور ہو۔ عرض کیا، دعاوں کی تقویت چاہتا ہوں۔ فرمایا، حرام نہ کھاؤ۔ عرض کیا، ایمان کی تکمیل چاہتا ہوں۔ فرمایا، اخلاق اچھے کرو۔ عرض کیا، قیامت کے روز گناہوں سے پاک ہو کر اللہ سے ملتا چاہتا ہوں۔ فرمایا، جنابت کے فوراً بعد غسل کیا کرو۔ عرض کیا، گناہوں میں کمی چاہتا ہوں۔ فرمایا، کثرت سے استغفار کیا کرو۔ عرض کیا، قیامت کے روز نور میں الحنا چاہتا ہوں۔ فرمایا، قلم کرنا چھوڑ دو۔ عرض کیا، چاہتا ہوں اللہ مجھ پر رحم کرے۔ فرمایا، اللہ کے بندوں پر رحم کرو۔ عرض کیا، چاہتا ہوں اللہ میری پر دہ پوشی کرے۔ فرمایا، لوگوں کی پر دہ پوشی کرو۔ عرض کیا، رسولؐ سے بچنا چاہتا ہوں۔ فرمایا، زنا سے بچو۔ عرض کیا، چاہتا ہوں اللہ اور اس کے رسولؐ کا محبوب بن جاؤں۔ فرمایا، جو اللہ اور اس کے رسولؐ کو محبوب ہے اسے اپنا محبوب بنالو۔ عرض کیا، اللہ کا فرماتبردار بنتا چاہتا ہوں۔ فرمایا، فرانش کا اہتمام کرو۔ عرض کیا، احسان کرنے والا بنتا چاہتا ہوں۔ فرمایا، اللہ کی یوں بندگی کر دیجئے تم اسے دیکھ رہے ہو یا جیسے دیکھ رہا ہے۔ عرض کیا، یا رسول اللہؐ کی گناہوں سے کون سی چیز معافی دلائے گی۔ فرمایا، آنسو، عاجزی اور بیماری۔ عرض کیا، کیا چیز دوزخ کی آگ مختدرا کرے گی۔ فرمایا، دینا کی مصیبتوں پر صبر۔ عرض کیا، اللہ کے غصے کو کیا چیز سرد کرتی ہے۔ فرمایا، چکے چکے صدق اور صدر جی۔ عرض کیا، سب سے بڑی برائی کیا ہے۔ فرمایا، بد اخلاقی اور بغل۔ عرض کیا، سب سے بڑی اچھائی کیا ہے۔ فرمایا، اچھے اخلاق، تو انجع اور صبر۔ عرض کیا، اللہ کے غصے سے بچنا چاہتا ہوں۔ فرمایا، الوں پر غصہ کرنا چاہوڑ دو۔ حدیث مبارکہ ختم ہو گئی۔

مولانا سید ہے ہو کر بیٹھے اور فرمایا۔ میں نے کابینہ کے ارگان سے کہا۔ ہم اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرتے ہیں لہذا ہم دنیاوی مسائل سے کیسے بچ سکتے ہیں۔ ہم سن جیٹ القوم اصراف کا شکار ہیں لہذا امیر (غنی) کیسے ہو سکتے ہیں۔ اللہ کی مخلوق کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں لہذا باعزت کیسے ہو سکتے ہیں۔ بے وضو ہتے ہیں لہذا ہمارا رزق کیسے کشادہ ہو سکتا ہے۔ توکل اختیار نہیں کرتے لہذا طاقتور کیسے بن سکتے ہیں۔ بد اخلاق ہیں لہذا ہمارا ایمان کیسے مکمل ہو سکتا ہے۔ بندوں پر رحم نہیں کرتے لہذا اللہ ہم پر کیسے رحم کرے گا اور صدقات سے پر ہیز کرتے ہیں لہذا اللہ کے غصے سے کیسے بچ سکتے ہیں۔ نواز شریف نے پوچھا "حضرت پھر ہمیں اللہ کی رحمت کے لئے کیا کرنا چاہیے۔" مولانا نے فرمایا جناب اللہ سے توبہ کریں اور عوام سے توبہ کی اپیل کریں۔ اللہ آنسو بہانے، گڑگڑانے اور معافی مانگنے والوں کو معاف کر دیا کرتا ہے۔ جناب وزیر اعظم یقین کر لیجئے، یہ مسائل زمینی نہیں آسمانی ہیں۔ جب تک اللہ کی مدد، اللہ کی رہنمائی اور اللہ کی رحمت نہیں آئے گی۔ یہ ملکِ محیک ہو گا اور نہ ہی اس ملک کے مسائل ختم ہوں گے۔ نواز شریف نے کہا "حضرت آپ مجھے تقریر لکھ دیں، میں قوم سے خطاب کروں گا اور اس سے توبہ کرنے کی اپیل کروں گا۔" میں نکل ختم ہو گئی، مولانا نے تقریر لکھا شروع کر دی لیکن نواز شریف کی مہلت ختم ہو گئی۔

مولانا طارق جیل جب یہ حدیث مبارکہ سارے ہے تھے تو میں سوچ رہا تھا، موجودہ حکمرانوں کو بھی اس حدیث کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی نواز شریف کو تھی۔ ان کو بھی یہ احساس دلانا ضروری ہے جو لوگ مہلت کو نعمت سمجھتے ہیں وہی لوگ دراصل خسارے میں رہتے ہیں۔ اللہ کے نام پر بننے والے ملک میں اللہ کا جس قدر مذاق اڑایا گیا۔ اللہ کے احکامات کی جس قدر خلاف ورزی کی گئی اب اللہ کے عذاب سے بچنے، اب اس سے معافی کا صرف ایک ہی راستہ ہے ”توبہ“۔ آئیے اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو کر گزر گزاں۔ اس سے اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگیں، اس سے توبہ کریں۔ اس سے پہلے کہ توبہ کے سارے راستے بند ہو جائیں۔ اس سے پہلے کہ مہلت ثُمٰ ہو جائے۔



کیفیت شیخ

یہ خوشاب کا نواں گاؤں تھا اور ہمارا تیسرا دن، ہم تینوں صبح سورے نکلتے، سارا دن ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں اور تیسرے سے چوتھے چک میں مارے مارے پھرتے، ہمیں نذری مالی کی تلاش تھی، وہ نذری مالی جو کبھی لاہور میں کام کرتا تھا پھر اس نے لاہور چھوڑا اور خوشاب اپنے گاؤں واپس آگئیا، میرے دوست شیخ زاہد کے پاس اس کا پندت نہیں تھا بس اسے اتنا معلوم تھا وہ خوشاب سے تائیگے پر گاؤں جاتا تھا، ہم نے ان تین دنوں میں وہ تمام گاؤں کھینچاں ڈالے جن تک کوئی تائیگہ، قتل گاڑی یا ریڑھا جاتا تھا لیکن ہمیں نذری مالی کا سراغ نہ ملا، ہم ہمت ہار گئے۔ ہم نے واپسی کا قصد کیا مگر شیخ زاہد مالی کے بغیر جانے پر تیار نہیں تھا، ہم اس کا مسئلہ سمجھتے تھے، وہ بیوی حاصلی اس کی آخری امید تھا، ہم جانتے تھے وہ نہ ملائی شیخ زاہد ہمت ہار جائے گا، وہ ایک چالیس پینتائیس برس کا جوان تھا لیکن حالات کے اتنے چکرنے اس کے چہرے پر جو لکھریں چھوڑی تھیں انہوں نے اسے ستر پچھتر برس کا ہنا دیا تھا، اب تو اس کی کھانی میں بھی بلغم کا بو جھو محسوس ہوتا تھا۔

مجھے معلوم ہے آپ کو شیخ زاہد اور نذری مالی کی کہانی میں کوئی ویچپی نہیں ہو گی لیکن اس کے باوجود اس کہانی میں کوئی ایسی بات ضرور ہے جس کے بغیر شاید ہم سب کی کہانیاں ادھوری رہ جائیں، جس کے بغیر شاید ہم سب اپنی اپنی کہانی میں کسی چیز کی کمی محسوس کریں، جس کے بغیر شاید ہم زندگی کا سارا گور کو دھنده سمجھنے پائیں۔ شیخ زاہد لاہور میں لو ہے کا کاروبار کرتا تھا اور نذری مالی اس کے گھر میں پوتوں کی گوڑی، وہ درختوں اور کیاریوں کو پانی دیتا تھا، شیخ زاہد ہر مہینے لاکھوں روپے کا تھا جبکہ نذری مالی صرف پندرہ سو روپے کا ملازم تھا۔ ایک روز شیخ زاہد دوپھر کے کھانے کے لئے گھر آیا، مالی لان میں پانی دے رہا تھا، شیخ زاہد گاڑی سے اتر، لان کے کنارے کنارے چلتا ہوا گھر کی طرف بڑھا، اس دوران نذری کی توجہ بٹ گئی، پاپ کا زادی ذرا سا نیز ہوا، پانی کا نیز ریلا کیاری کے کناروں سے گلرا یا، چھینٹے اڑے اور سیدھے شیخ زاہد کے سفید کرتے پر آگ رہے۔ شیخ ایک دھنے مزاج کا شخص تھا، وہ عموماً نوکروں کی اس حتم کی غلطیاں درگز رکر دیتا تھا لیکن اس دن اسے غصہ آگئیا، اس نے مالی کو محاذ دیا، مالی نے تاویل پیش کرنے کی کوشش کی، شیخ کو مزید غصہ آگیا اور اس نے اسی وقت اسے گھر سے نکال دیا، نذری مالی چلا گیا۔ وہ سال شیخ زاہد پر بڑا بھاری تھا، سب سے پہلے فیکٹری

پر ڈاکہ چڑا، ڈاکو ایک گڑوارو پے لوٹ کر لے گئے، کچھ عرصہ بعد بینک سے پچھدا ہوا اور فیکٹری بند ہوئی، اشائک اپنی چینی کریش ہوئی، شیخ کا سارا سرمایہ ڈوب گیا، بڑے بیٹے کے معدے میں کینسر طاہر ہو گیا باقی جمع پونچی اس کے علاج پر صرف ہو گئی، مال روڈ پر ایک کمرشل پلاٹ تھا وہ سالے نے بیجا اور رقم لے کر امریکہ بھاگ گیا، سال کے آخر تک شیخ زاہد حقیقتاً کوڑی کا محتاج ہو گیا تھا ان وہ جو کہتے ہیں شیخ کنگال ہوتے ہوئے بھی برسوں لگا دیتے ہیں شیخ بھی کسی نہ کسی طرح سفید پوشی کا بھرم بھاتا رہا مگر اگلے سال بیٹے نے بینکلے کا سووا کیا، سارا خاندان کرانے کے مکان میں آیا رقم کاروبار میں لگائی تھیں شراکت داری کی نذر ہو گئی، ان دنوں شیخ زاہد کی یہ حالت تھی وہ سونے کو ہاتھ لگاتا تھا تو وہ تابے کے بھاؤ بکتا تھا۔

شیخ نے خود کو زندہ رکھنے کیلئے روحانیت کا سہارا لیا، وہ درگاہوں پر آنے جانے لگا، اس دور میں اجمیر شریف سے کوئی بزرگ داتا صاحب کے دربار پر آئے، وہ بزرگ صاحب حال تھے، لوگوں کو پڑھ لیتے تھے، شیخ زاہد کسی کے ذریعے ان تک پہنچا، بزرگ نے توجہ فرمائی اور سکراکر بولے "اللہ ہمیں ہر مہینے لاکھوں روپے اس لئے دیتا تھا کہ تم ان میں سے نذر یہ مالی کو پندرہ سورو پے دے سکو مگر تم نے اسے اپنے رزق کے کھاتے سے خارج کر دیا اللہ نے تمہارا کھاتا بند کر دیا" شیخ زاہد نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا، بزرگ گویا ہوئے "ہم سب گارڈین ہیں، کیسے نکل ہیں، ہمارے دفتروں، ہمارے گھروں میں ایسے بے شمار لوگ ہوتے ہیں جو وادیوں ہزار روپے کے لئے خدمت کرتے ہیں، ان کا رزق ہمارے رزق سے دا بستہ ہوتا ہے، یہ لوگ اللہ کے صابر بندے ہوتے ہیں، اللہ ہمیں رزق عنایت کرتا ہے تاکہ ہم ان لوگوں کا حصہ ان تک پہنچا سکیں۔ ہمیں معلوم ہی نہیں ہوتا ہمیں کس مالی، کس چیز اسی، کس خانامے، کس چوکیدار اور کس ذرا سیور کے صدقے یہ ساری نعمتوں، یہ ساری آسانیوں مل رہی ہیں۔ وہ کون ہے جس کا شکر ہمارے رزق کو دعست دے رہا ہے مگر پھر ہمارا تکبیر، ہماری نبوت، ہمارا غرور ہمیں ذمک مارتا ہے اور کسی کمزور لمحے ہم اس ذریعے کو اپنی زندگی سے خارج کر دیتے ہیں اور پھر ان ساری آسانیوں، ساری نعمتوں کا سورج اس شخص کے ساتھ ہمارے ہخنوں سے رخصت ہو جاتا ہے، ہم لوگ کتنے بے دوقوف ہیں، ہم جب لوگوں کو تխواہیں دیتے ہیں تو ہم خود کو ان کا خدا سمجھ بیٹھتے ہیں، ہم یہ فراموش کر بیٹھتے ہیں، ہم تو فقط ایک کیسے نکل، ایک گارڈین ہیں۔ منی آرڈر پہنچانے والے ڈاکے، ہماری زندگی کی یہ ساری لش پش، یہ گاڑیاں، بیٹگے، دفتر اور چیک بکس اسی ڈیوٹی، اسی فرش کا معاوضہ ہیں، جس دن ہم نے ڈیوٹی چھوڑ دی، اللہ ہمیں توکری سے برخاست کر دے گا اور پھر اس کے ساتھ ہی یہ ساری چیک بکس، دفتر، بیٹگے اور گاڑیاں واپس لے لی جائیں گی، زندگی کی یہ لش پش بھج جائے گی۔"

شیخ زاہد اتحا اور نذر یہ مالی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا، چار دن تک میں بھی اس کے ساتھ مارا مارا پھر تھا رہا تھا ہماری تلاش شر بارہت ہو گئی، ہم لوگ واپس آگئے، چند روز بعد شیخ زاہد پھر نکل کھڑا ہوا، پندرہ دن بعد

اس کا بیٹا اسے واپس لایا، اس بارہم نے پہلی مرتبہ اس میں مسجد و ہبیت کی جھلک دیکھی، چند دن بعد وہ گھر سے بزری لینے لکلا اور خوشاب جا پہنچا، اس بار اسے لانے کی ذمہ داری ہماری تھی وہ تمیں لاری اڈے کے باہر فقیروں کے ساتھ بیٹھا ملا، اس کی حالت دیکھ کر ہمارے ضبط کے سارے بندنوٹ گئے، ہم اسے گلے لگا کر روپڑے، ہم لوگ اسے واپس تو لے آئے لیکن اب وہ شیخ زادہ نہیں تھا، وہ سرتا پا ایک تلاش تھا، اس کی آنکھیں ہر وقت کچھ کھو جتی تھیں وہ ہر چہرے کو غور سے دیکھتا تھا اور پھر اس سے پوچھتا تھا "تمہارا نام نذرِ تو نہیں" وہ نذرِ نام کے ہر شخص کی ہاتھوں سے لپٹ جاتا تھا، ہم نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا وہ خوشاب گیا اور پھر وہاں سے اس کی نیشن ہی واپس آئی۔

کل شام میں ایک دوست کے ہاں مدعو تھا، اس کے ملازم نے مجھے چائے کا کپ کپڑا تا چاہا، اس کا ہاتھ چھلکا اور ذرا سی چائے میرے جوتوں پر آگری، میرے دوست کو غصہ آگیا، وہ ملازم کو مارنے کے لئے انھا لیکن میں نے اس کا ہاتھ کپڑا لیا میں اپنے دل میں ایک اور شیخ زادہ کی قبر نہیں، ہنا نا چاہتا تھا۔



اللہ کا ہاتھ

آج تک صرف دو بندے ملے ہیں جن سے مل کر حقیقتاً خوشی ہوئی۔ ایک صاحب کراچی سے تشریف لائے، بزرگ میں تھے۔ انہوں نے کہا "میں معمولی درجے کا کاروباری شخص ہوں، اپنی تمام ضروریات پوری کرنے کے بعد مجھے ہر میسے پانچ ہزار روپے فتح جاتے ہیں، آپ کی نظر میں کوئی ضرورت مند ہو تو مہربانی فرمائ کر مجھے اس کا ایڈریلیس دے دیں۔ میں چپ چاپ اس کی خدمت کرتا رہوں گا۔" مجھے اس کی بات سن کر بے حد خوشی ہوئی، مجھے کیوں خوشی ہوئی، اس کی وجہ میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ دوسرے صاحب لاہور کے ایک کلرک تھے، کسی نے ان کے بارے بتایا، وہ دفتر سے واپسی کے بعد کافی چنے والے بچوں کو جمع کرتے ہیں، انہیں الف، ب، س، اور ایک دو تین سکھاتے ہیں، میں ان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ وہ دھرم پورہ میں ریلوے لائن کے ساتھ رہتے تھے۔ میں ان کے گھر پہنچا تو ان کے دروازے پر کافی تجمع کرنے والے بچوں کے تھیلے اور گھنٹر یاں پڑی تھیں، میں ان گھنٹر یوں اور تھیلوں میں سے راست بناتا ہوا ان کی بیٹھک میں داخل ہو گیا۔ بیٹھک میں دری پچھی تھی، دری پر پچھیں تیس پچھے بیٹھ کر الف انار اور بے کبری پڑھ رہے تھے، وہ ایک کونے میں بیٹھے ساعت اور گویاً سے محروم ایک پنجی کو اشاروں سے پڑھا رہے تھے۔ میں ان کے قریب بیٹھ گیا، ان کے چہرے پر ایک عجیب طرح کا نور اور ذات میں ایک الوکھا اطمینان تھا۔ مجھے پہ چلا، روز تین بچے ان کی بیٹھک کھل جاتی ہے، پچھے آنا شروع ہو جاتے ہیں، پچھے سب سے پہلے فضل خانے میں جاتے ہیں، وضو کرتے ہیں، ظہر کی نماز پڑھتے ہیں، مگر میں جو کچھ پکا ہوتا ہے، وہ کھاتے ہیں، ایک گھنٹہ پڑھتے ہیں اور پھر اپنے اپنے تھیلے انداز کر چلے جاتے ہیں۔ یہ دنیا کا واحد سکول تھا جس میں حاضری کا کوئی رجسٹریشن تھا لیکن اس کے باوجود جس پچھے نے ایک بار اس دلیل پر قدم رکھ دیا وہ پھر اس پیر خانے کا ہو کر رہ گیا، میں ایک گھنٹہ وہاں بیٹھا رہا۔ معلوم ہوا، اب تک اس سکول کی سینکڑوں برائیں کھل پچلی ہیں، حضرت صاحب ہر کلاس میں سے دو تین بچوں کو سلیکٹ کرتے ہیں، انہیں دو، دو، تین تین گھنٹے پڑھاتے ہیں جب وہ ان کے معیار کے مطابق "عالم" ہو جاتے ہیں تو وہ انہیں اپنے پاس بخاتے ہیں، ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور میٹھی آواز میں کہتے ہیں "بینا جاؤ اور اپنے جیسے دوسروں بچوں کو یہ سب کچھ سیکھا دو" وہ پچھے

انھتے ہیں اور کسی گندے نالے، کسی جوہر کے کنارے، پرانے کاغذوں کے کسی گودام کے باہر یا کسی بدبودار آبادی کے کسی سندھ منڈ درخت کے پیچے اس سکول کی برابری کھول لیتے ہیں۔ یہ دنیا کا واحد ادارہ ہے جس میں پورے سکول کے لئے ایک کتاب کافی بھی جاتی ہے۔ یہ پیچے کانے، چھپڑی کے کسی لکڑے یا درخت کی شاخ کو قلم ہناتے ہیں اور زمین کو سلیٹ اور پھر یہی سلیٹ اور قلم انہیں روشنی کی نافٹم ہونے والے وادی میں لے جاتی ہے۔ مجھے معلوم ہوا وہ کسی سے ایک پیسے قبول نہیں کرتے، اپنی معمولی سی آمدنی سے بچوں کو کھانا کھلاتے ہیں اور نہیں چائے بنایا کر پلاتے ہیں، میں نے ان کا ہاتھ پڑوما اور باہر آگیا، مجھے ان سے مل کر بے انتہا خوشی ہوئی، مجھے کیوں خوشی ہوئی، میں آپ کو اس کی وجہ بتانا چاہتا ہوں۔

میرے گھر میں جب بھی ٹیلی فون کی تھنٹی بجتی ہے، میں جو بھی خط کھولتا ہوں، جو بھی اسی میں پڑھتا ہوں، اس میں یا تو امداد کی درخواست ہوتی ہے یا کسی این بھی ادا کا تعارف یا پھر کالم لکھنے کا ملفوظ مطالبه، کوئی کہتا ہے میں پچاس لاکھ روپے کا مقرض ہوں، مجھے کسی سے پچیس تمیں لاکھ روپے لے دیں، کوئی کہتا ہے میں ملک سے باہر تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں میرے لئے میں پچیس لاکھ روپے کا بندوبست کر دیں، کوئی کہتا ہے میں میری آمدنی کم اور پچے زیادہ ہیں مجھے امریکہ کا دینہ لگوادیں، کوئی کہتا ہے فلاں بڑا شخص آپ کا واقف ہے یا آپ نے یہ رون ملک آباد فلاں شخص کے بارے میں کالم لکھا تھا آپ اس سے کہ کہ مجھے قرض حملے دیں یا پھر باہر سیٹ لے دیں، کوئی کہتا ہے ہم نے فلاں ہسپتال بنایا، فلاں تعلیمی ادارہ قائم کیا، آپ کالم میں اس کی تعریف کر دیں، ہمیں قربانی کی کھالیں مل جائیں گی اہل خیر ہماری امداد فرمادیں گے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سلسلہ جب دنوں سے بھینوں اور بھینوں سے برسوں تک بھیل جاتا ہے تو انسانی صبر جواب دے جاتا ہے اس وقت شدید خواہش پیدا ہوتی ہے اس ہجوم میں کوئی نہ کوئی ایسی آواز ہو جو قریب آ کر کہے ”میں امداد لینے نہیں، امداد دینے والا ہوں۔“ کوئی نہ کوئی ایسا ضرور ہو، جو کسی مدد امداد کے بغیر کوئی ادارہ چلا رہا ہو، جسے کچھ حاصل کرنے کا لائیج نہ ہو، جس نے اپنی ذات کو چندے کا بکس نہ بنایا ہو، یقین فرمائیے مجھے آج تک صرف یہ دو حضرات ملے ہیں جن کے وجود سے مجھے بھیک کی بوئیں آئی، پہلے صاحب نے جب یہ کہا ”میں ضرورت مندوں کی اتنی ضرورت پوری گر سکتا ہوں۔“ تو دل خوشی سے ہجوم اٹھا اور جب میں نے دوسرے عرش کیا ”حضور میں بچوں کے لئے پانی کا ایک کول اور ایک نئی دری پیش کرنا چاہتا ہوں۔“ تو وہ مکرائے اور آہستہ آواز میں بولے ”بیٹا ہمیں اس کی ضرورت نہیں، پانی کے لئے گھڑا موجود ہے، اس کا پانی سختا بھی ہوتا ہے اور مینھا بھی۔ آپ اس وقت جس دری پر بیٹھے ہیں وہ بھی تھیک نہاک ہے۔ ایک دو سال نکال جائے گی۔ اس دوران میری یہ یوں نئی دری ہن لے گی اور ہم اس کی جگہ وہ بچا دیں گے۔ چھت پر پنکھا موجود ہے، کتابوں کی ہمیں ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک کتاب دو تین سال نکال جاتی ہے، لکھنے کیلئے کاغذ اور پنسیلیں بچوں کو کوڑے سے مل جاتی ہیں، بچوں کی دال روٹی اور چائے کے لئے میری تنخوا کافی ہے، ہاں البتہ بھی بھی وضو کے لئے پانی کم پڑ جاتا ہے۔

لیکن وہ بھی بچے سرکاری نلکے سے مجرلاتے ہیں۔ بس اللہ کا کرم ہے ہم بہت سکھی، بہت خوش ہیں۔ "میں نے رقم کے لئے اصرار کیا تو ای خوبصورتی میں بولے" بینا اللہ کو اوپر والا ہاتھ بچے والے سے زیادہ پسند ہے، تم نہیں چاہتے ہم اللہ کے پسندیدہ لوگوں میں شامل رہیں۔" میں نے عرض کیا" میں اللہ کے لئے دینا چاہتا ہوں۔" انہوں نے تقبہ لگایا" لینے والا ہاتھ اللہ کا نہیں ہوتا، یہ ہاتھ" انہوں نے ہاتھ آگے بڑھایا" یہ ہاتھ جس دن پھیل گیا، وہ اللہ کا ہاتھ نہیں رہے گا،" میری آنکھوں میں آنسو آگئے میں نے عینک اتاری اور بڑی احتیاط سے وہ آنسو اپنے رومال میں سنjal لئے۔ وہ شخص بھکاریوں کے اس ملک میں میری زندگی کا پہلا حصہ تھا۔



مرمر میں ستونوں کی بہشت

”مسلم؟“ کیشٹر نے نوٹ ہاتھ میں پکڑا اور اپنی نیلی آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز کر دیں، میں نے صبا کی طرف دیکھا، اس نے کسما کر پہلو بدلا، میں نے کیشٹر کی آنکھوں میں جھائک کر گردان ہاں میں ہلا دی۔ کیشٹر نے پیچھے گارڈ کو اشارہ کیا، اس نے ہمارا دیا نوٹ لیا اور کیسین سے باہر آگیا، وہ ایک جیسم ہسپا نوی تھا، اس نے نرم آواز میں سرگوشی کی ”آپ لوگ جانتے ہیں، یہ چیز ہے یہاں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں۔“ ہم دونوں نے گردان ہلا کر تصدیق کر دی، اس نے ہمیں ملکوں نظروں سے گھورا اور اسی لمحے میں پوچھا ”آپ لوگ اندر جا کر نماز تو نہیں پڑھیں گے۔“ ہم نے بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دل پر باری پتھر کھکھ سرنگی میں بلاد دیا، وہ کیسین نہیں داخل ہوا اور ہمارا نوٹ واپس کیشٹر کو پکڑا دیا۔

چھوٹا سا بچائیک کھلا اور ہم مرمر میں ستونوں کی بہشت میں داخل ہو گئے، ایک بے عمل، کمزور اور ناقص مسلمان ایک سابق مسجد کے برہنہ فرش پر کھڑا تھا، اندر عبدالرحمن اول کی خوشبو بکھری تھی، مروان کا پوتا عبدالرحمن عباسیوں کی تواریخ سے پجتا پجاتا افریقہ پہنچا اور اپنے نہیاں سے پناہ چاہی، وضع دار بربروں نے اسے سینے سے لگایا، پانچ برس بعد وہ عبدالرحمن آؤئے انہیں کامالک تھا، وہ پادشاہ تو بن گیا لیکن دمشق کی یادوں نے اس کا دامن نہ چھوڑا، وہ ہر شام قلعے سے نکلتا اور درستگ گرم ٹیلوں پر کھڑا رہتا، ایک روز وہ پلنٹا تو وادی الکبیر کے بہتے پانیوں کے ساتھ ایک نیم تاریک گوشے میں اسے دمشق مل گیا، اس نے اسی وقت وہاں ایک شاندار شہر تعمیر کرنے کا حکم دیا، معمار کام میں جت گئے، وہ ہر شام نو تعمیر شہر کے نظارے کے لئے وہاں آتا، اس کے سامنے اٹیشیں بنیادوں میں اتریں، بنیادوں پر دیواروں نے سراخیا اور پتھر دیواروں پر چھتیں سائیل گئیں، اس نے شہر کے باہر بھور کا پہلا درخت لگایا اور اللہ کے حضور قرطبه کی طویل زندگی کی دعا مانگی، شہر مکمل ہو گیا اب جو بھی شہر کی فصیل میں داخل ہوتا دمشق مشق پکارنگتا، پھر ایک شام اس کا ماموںزاد سمجھی وہاں آیا۔ اس نے شہر دیکھا اور خاموش رہا، عبدالرحمن کی نظروں نے سمجھی سے پوچھا ”کیوں پھر؟“ سمجھی نے سینے پر ہاتھ رکھا اور مسکرا کر کہا ”سلطان معظم کوئی شہر مسجد امیہ کے بغیر مشق کیسے ہو سکتا ہے۔“ عبدالرحمن کے سینے پر گھونسا لگا۔ وہ واپس مزا اور التصر کی نیم تاریک گزر گا ہوں میں گم ہو گیا، اگلی صبح قرطبه کے لئے نیا

پیغام لے کر طلوع ہوئی، عبدالرحمن نے وادی الکبیر کے کنارے ایک قطعہ پسند کیا، زمین کا یہ لکڑا یہ سائیوں کی ملکیت تھا، عبدالرحمن نے وارثوں کو ایک لاکھ درہم پیش کر دیئے اور پھر اسی شام دنیا کی اس حیرت انگیز مسجد کی بنیاد رکھ دی گئی۔ روز جب سورج کی تماثل چنانوں کے بینے میں اتیرتی، عبدالرحمن اپنے محل سے نکلا اور سورج کی شعایمیں کند ہونے تک مزدوروں کے ساتھ ایشیں اور گاراڑ ہوتا یہ مشقت اس کے کندھوں، بازوؤں اور پشت پر شدت ہو گئی، رات جب کنزیں زخموں پر پھاہے رکھتیں تو وہ مسکرا کر پوچھتا "زہرہ دیکھو کہیں زخم تھیک تو نہیں ہو گئے۔" کنیرہ کہتی "سلطان ابھی تک خون رس رہا ہے۔" اس کے منہ سے الحمد للہ نکلتا اور وہ سرشاری کے عالم میں پکارتا "اے اللہ میں اس زمین پر تجارت اگر بنا رہا ہوں، ان زخموں کے صدقے مجھے بخش دینا۔" اندر نہیں تاریک ہال میں عبدالرحمن کے زخموں کی خوشبو بکھری تھی۔

مسجد قرطبه یورپ میں مسلمانوں کے کمال فن کی گواہ تھی، سنگ مرمر کے 1092 ستونوں پر دو دو محراجیں تھیں اور ان محراجوں کے اوپر چھپت، چھپت کو اندر سے لکڑی کا غلاف چڑھا دیا گیا تھا، پانچ سو بر س بعد جب مسجد کی سمجھیاں پادریوں کو پیش کی گئیں تو انہوں نے چھپت ادھیز دی، ان کا کہنا تھا چھپت کی لکڑی میں اتری آئیں انہیں سونے نہیں دیتی، یہ لکڑی بعد ازاں بازاروں میں بکی اور انڈس کے موسیاروں نے اس سے گزار ہوا۔ وہ صدیوں تک لوگوں کو کہتے رہے آؤ تھیں قرطبه کے بین سنا میں اور سنتے والوں کو گزار کے چوبی شکم سے چخنوں گی آوازیں سنائی دیتیں۔ المصور کے دور میں مسجد میں دوسرا سی فانوس تھے جن میں ہر روز دس ہزار شمعیں جلائی جاتی تھیں، رمضان کا پہلا دن آتا تو منبر کے سامنے ایک بڑی شمع جلا دی جاتی۔ یہ شمع آخری افطار کے بعد خود بخود بچھ جاتی، منبر کے سامنے لوہے کا جنگل تھا اور جنگل پر آٹھ تالے چڑھتے تھے، ہم دونوں جنگل کے سامنے کھڑے ہو گئے سامنے دیوار سے لے کر اوپر چھپت تک آیات کی روشنی بکھری تھی۔ میں نے سوچا وہ کون لوگ تھے جنہوں نے چھپتے چھوٹے چھوٹے موتی جڑ کر دیوار میں قرآن جڑ دیا، اندر سے جواب آیا یہ وہ لوگ تھے جن کی آنکھوں میں زم زم اور دلوں میں جھرا سود کی گرمائش تھی، اسی منبر کے سامنے جی ہاں اسی منبر کے سامنے ابن عمار، ابن حزم، ابن زیدون اور ابن رشد جیسے تابذ لوگ بیٹھتے تھے، یہیں کہیں ان پتھروں پر ان کے سجدے تحریر ہوں گے، میرے ماتھے پر پیٹ آگیا، مجھے زندگی میں پہلی بار اپنے پاؤں برے گئے۔ یہاں اوہڑا کیں طرف وہ قرآن مجید رکھا جاتا تھا جس کے درقوں پر حضرت عثمانؓ کے لمبومبارک کے نشان تھے، میں نے اس جگہ کی شاخت کے لئے دائیں باسیں دیکھا، وہاں تھیک اس جگہ ایک ہسپانوی گارڈ اپنے جو تے کی ایڑیاں بچا رہا تھا۔ میرے خطبے کے سارے تاریخوں میں اسے پرے دھکیلا اور اپنی پلکیں اس جگہ بچھا دیں اور پھر پہنچنے والیں کہاں سے آنسوالم آئے اور میں پانی بن کر بہتا چلا گیا۔



کاش میں

میدان عرفات میں ہزاروں لاکھوں مسلمان تھے، سب کی آنکھیں ادب سے جھکی تھیں اور ماتھوں پر عقیدت کے قطرے سے چمک رہے تھے، انہوں نے سراخایا، لوگوں کے اس ہجوم کو دیکھا اور دل ہی دل میں اللہ سے عرض کیا "یا پروردگار ان عقیدت مندوں میں وہ کون خوش نصیب ہو گا جسے تو حج مبروکہ کی سعادت بخشنے گا" پوچھنے والے صاحب حال، صاحب الہام تھے۔ انہیں جواب ملا "مقبول ترین حج کی سعادت علی ہجوری کے سوا اُسی کو نصیب نہیں ہو سکتی۔" بزرگ اشٹے اور علی ہجوری کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، ہجوری کے چند حاجی دہان موجود تھے، ان سے پوچھا، معلوم ہوا علی نام کا کوئی شخص اس سال حج پر نہیں آیا۔ حیرت سوا ہوئی لہذا مناسک کے بعد ہجوری چلے گئے، شہر میں علی کی تلاش شروع کی۔ بڑے دنوں کی جدوجہد کے بعد پڑتے چلا، مضائقات میں علی نام کا ایک موپی رہتا ہے جو بڑا ہی ترقی، پر ہیزگار اور نمازی ہے۔ آپ اس کے پاس چلے گئے اور اس کا ہاتھ چوم کر پوچھا "اے اللہ کے مقرب بندے تمہیں حج مبروکہ کیسے نصیب ہوا۔" علی کا رنگ فتنہ ہو گیا، اس نے ان کا ہاتھ پکڑا، انہیں اندر لے گیا اور سوال کا پس منظر جانے کی خواہش کی، بزرگ نے ساری واردات بیان کر دی، سن کر علی نے روٹا شروع کر دیا، جب طبیعت سنبھلی تو گویا ہوا "حضرت میں ذات کا موپی، پرانے بد بودار جوتے گانٹھا میرا پیش، میں نے پیسہ پیسہ جوڑ کر حج کیلئے زادراہ جمع کیا، سفر کا وقت آیا تو ایک روز یہوی نے فرمائش کی، ہمسایوں میں گوشت بھونا جا رہا ہے۔ میں بھی گوشت کھاتا چاہتی ہوں، مجھے لا کر دو میں نے رقم گئی اس سے گوشت کی گنجائش نہیں نکلتی تھی۔ ناچار میں نے ہمسائے کا دروازہ کھکھایا اور اس سے تھوڑے سے گوشت کی درخواست کی، ہمسایہ بہت بھلا مانس تھا، وہ شرمندہ سا ہوا اور سر جھکا کر بولا "میرے بھائی ہمارا گوشت آپ لوگوں پر حلال نہیں۔" میں نے اس سے عرض کیا "بھائی تم بھی مسلمان، میں بھی مسلمان پھر حلال حرام کا کیا معاملہ۔" اس کی شرمندگی بڑھ گئی، وہ بھماری آواز میں بولا "حضرت میں پیشے کے لحاظ سے مزدور ہوں، پچھلے دو ہفتتوں سے بے روزگار تھا، گھر میں فاتے تھے، آج صح بھوکے بچوں کے چہرے دیکھنے گئے تو باہر نکل گیا، شہر سے باہر ایک گدھا مرا پڑا تھا، اسے دیکھا تو یاد آیا اللہ نے بھوکے پر حرام حلال کر دیا تھا، میں نے اس کا گوشت کاٹا، گھر آیا، پکایا اور بچوں کو کھلا دیا تو میرے بھائی یہ گوشت ہم پر حلال تھا لیکن آپ

کے لئے حرام۔ "علی نے جھر جھری لی اور آنکھیں پوچھ کر بولا" حضرت یہ سن کر میں نے جنگ ماری اور خود سے کہا تم پر تف ہو تمہارا ہمسایہ مردار کھانے پر مجبور ہے اور تم جج پر جا رہے ہو، میں نے اسی وقت جج کی رقم اس کو پیش کر دی، جائے نماز بچھا کر اللہ سے اپنی غفلت پر تو بہ کی اور اس سے عرض کیا، یا میرے پروردگار علی صرف نیت کر سکتا تھا اب تو اس کی نیت ہی قبول کر لے۔"

یہ واقعہ مدت پہلے میں نے کسی مذہبی کتاب میں پڑھا تھا، اسے پڑھ کر احساس ہوا، اللہ کی سلطنت میں اس کے بندے قیام و وجود اور مناسک و ذکر سے کہیں افضل ہیں، کسی بھوکے کو کھانا کھلادینا، کسی یتیم کی پروردش، کسی بیمار کا علاج اور کسی بے آسرا کو آسرا دے دینا سوال کی عبادت، سوال کی ریاضت سے عظیم ہے۔ جج تمام آزاد اور صاحب حیثیت مسلمانوں پر فرض ہے لیکن اگر صاحب حیثیت اور آزاد مسلمان کا ہمسایہ روز بھوکا سوتا ہو، اس کے آگے پیچھے یتیم پچے بھیک مانگتے ہوں اور یہودہ عورتیں سرچھانے کا نجحکانہ جلاش کرتی ہوں تو اس کے اس جج کی کیا حیثیت ہوگی، اللہ اس کی عبادت کیوں قبول کرے گا؟ ذرا سوچنے اگر کسی صاحب حیثیت شخص کے قرب و جوار میں لوگ بیماریوں سے مر رہے ہوں، لوگ غربت کے باعث اپنے گردے پھرے ہوں، اپنے بچوں کا سودا کر رہے ہوں تو اتنا اس شخص کا جج قبول کرے گا؟ اس کا جواب صرف علماء کرام دے سکتے ہیں۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں اس سال ایک لاکھ 81 ہزار 3 سو پاکستانیوں نے جج کی درخواست دی، ان تمام لوگوں نے ایک لاکھ 5 ہزار 8 سوروپے فی کس ادا کئے، یہ رقم جمیعی طور پر 19 ارب 18 کروڑ 15 لاکھ 40 ہزار بھتی ہے، حکومت اس سال ڈیڑھ لاکھ لوگوں کو جج پر بھجوائے گی۔ یہ سب لوگ عازیز میں جج ہیں۔ اللہ ان کے جج قبول کرے لیکن افسوس شاید ان میں علی جیسا کوئی شخص نہیں ہوگا جو ذات کا موصی ہو، جس نے اپنا زاد رہ بھائے کے حوالے کیا ہو اور ہو حاضری کے بغیر جج مبروك کی سعادت پا گیا ہو۔

ڈاکٹر مقبول جعفری میرے ایک مہربان ہیں، کراچی کے ایک بڑے ہپتال کے شعبہ حادثات میں خدمات سر انجام دیتے ہیں۔ انہوں نے مجھے ایک واقعہ سنایا۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس رات تین بجے دو میاں یوں آئے، ان کے ساتھ چھوٹی پیچی تھی، پیچی کو ہیسے کی شکایت تھی، ڈاکٹر صاحب نے کہا "پیچی کو فوراً داخل کرنا پڑے گا۔" یہ سن کر والدین نے روتا شروع کر دیا، ڈاکٹر صاحب نے وجہ پوچھی تو باپ بولا "ڈاکٹر صاحب میرے دو بچے ہیں، دونوں صحیح سے دست اور اٹھوں کا بیکار تھے۔ میرے پاس ڈاکٹر اور دو اکے لئے چیز نہیں تھے لہذا دونوں بچے گھر پر پڑے رہے، ابھی آدھہ گھنٹہ پہلے میرا جتنا فوت ہو گیا اور بیٹی نے ترپنا شروع کر دیا، ہم دونوں میاں یوں نے بیٹی کی لفڑی کرے میں چھوڑی، گھر کو تالا لگایا اور بیٹی کو لے کر آپ کے پاس آگئے، اب آپ کہتے ہیں پیچی کو داخل کرنا پڑے گا۔ آپ خود بتائیے جس مرد، عورت اور سات سال کی بیٹی نے چار دن سے کھانا نہ کھایا ہو، جن کے گھر میں معصوم بچے کی لفڑی پڑی اور جن کی جیب میں کفن اور قبر کے لئے پیسے ہوں وہ بیٹی کے داشتے کی فیس کہاں سے دیں گے وہ بیٹی کو دوائیں کہاں سے لا کر دیں گے۔ آپ کی

مہربانی، آپ ہمیں واپس جانے دیں، ہم دونوں بچوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیں گے۔" ڈاکٹر صاحب نے یہ واقعہ سنایا کہ مجھ سے پوچھا۔ "کیا بچے کی اس فرش کے بعد اللہ تعالیٰ کراچی کے عاز میں کا حج تقبل کرے گا۔" میرے پاس ان کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا، میں نے یہ واقعہ اپنے ایک دوست کو سنایا وہ حج کی فیض جمع کرنے جا رہا تھا، اس نے اسی وقت دو ڈرافٹ بنوائے ایک حج کے لئے جمع کر دیا، دوسرا بچوں کے ہسپتال میں دے آیا اور پھر میرے گلے لگ کر بولا "کاش میں ذات کا سوچی ہوتا، کاش میرا نام ملی ہوتا۔"



حیات بھی مختصر ہوتی ہے اور حکومت بھی

ایلووستار دو حصوں میں تقسیم تھا، شمالی حصے میں امراء کی کوٹھیاں اور فارم ہاؤسنگ تھے جبکہ جنوبی سمت میں جھونپڑپی، جھوپٹی جھوپڑیوں میں درجن درجن لوگ رہتے تھے۔ جنوبی حصے کے لوگوں کو شمال میں جانے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ امراء ان گندے، میلے کچلے لوگوں کو اپنی سڑکوں، گلیوں اور کلبوں کے قریب برداشت نہیں کرتے تھے۔ 1925ء کی ایک گرم رات وہ ایلووستار کی ایک جھونپڑی میں پیدا ہوا۔ وہ دسوائی بچہ تھا لہذا اس کی پیدائش والدین کے لئے خاص خوشی لے کر نہیں آئی تھی۔ اس کے والد اسکول ماسٹر تھے، آمدی کم تھی اور مسائل زیادہ چنانچہ والدین کا ہاتھ بٹانے کے لئے وہ چینیوں میں منڈی میں کیلے بیچتا تھا، وہ ایک عام سوکھا سڑا سانوجوان تھا، جس کی شخصیت میں کوئی کشش نہیں تھی۔ قبے میں چلتے پھرتے وہ شمالی علاقے کی کوٹھیوں اور یاغات کی طرف دیکھتا اور اس ہوڑہ کے پوچھتا کیا میں بھی ایک ہوں گا۔ جواب آنے سے پہلے ہی اس کی گردان نئی میں بل جاتی۔

والد نے قرض لے کر اسے سنگا پور بھیجا جہاں سے وہ طب کی تعلیم پا کر واپس آیا۔ وہ اپنے قبے کے چند ڈاکٹروں میں سے ایک تھا، سرکاری نوکری ملی لیکن چھوڑ دی۔ 1957ء میں اس نے پارلیمنٹ پریکٹش شروع کی۔ پریکٹش چل پڑی، وہ رات گئے تک مریض دیکھتا رہتا، آمدی میں تو اضافہ ہو گیا لیکن وہ ابھی تک ایلووستار کے جنوبی حصے ہی میں مقیم تھا۔ جھونپڑپی سے اٹھ کر کوٹھی میں جانے کا خواب ابھی اس کی پلکوں پر ہی لرز رہا تھا۔ 1957ء میں اس نے لکھتا شروع کر دیا، اس کے مفاہی میں مقامی اخبارات میں شائع ہونے لگے، لوگ اس کی تحریر سے چونک اٹھے۔ اس کی باتوں میں عجیب طرح کی کشش اور درباری تھی، دیکھتے ہی دیکھتے وہ عوام میں مشہور ہونے لگا۔ 1964ء میں اس نے ایکشن لڑا، کامیاب ہوا اور پارلیمنٹ میں جا بیٹھا۔ 1969ء میں وہ ایکشن ہار گیا۔ وہ پارٹی کا باقی تھا، پارٹی نے اسے نکال دیا۔ اس نے پارٹی سے نکل کر "The Malay Dilamma" کے نام سے بڑی شاندار کتاب لکھی۔ اس کتاب نے مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ وہ پورے ملک میں مشہور ہو گیا۔ اس کی مقبولیت دیکھ کر پارٹی نے اسے واپس لے لیا۔ وہ 1974ء میں دوسری بار رکن پارلیمنٹ ہوا۔ اسے وزیر تعلیم ہنا دیا گیا۔ چار سال بعد وہ ڈپٹی وزیر اعظم بن گیا اور 1981ء میں وزیر اعظم، یوں ایک طویل مدت بعد وہ وقت آگیا جب وہ ایلووستار کے شمالی حصے میں منتقل ہو

سکتا تھا۔ وہ امیر کہلا سکتا تھا لیکن اس وقت اس نے عجیب فیصلہ کیا، اس نے کہا ”میرے پاس دو راستے تھے میں اپنے خاندان کو امیر بنادیتا یا پھر پوری قوم کا مقدار بدل دیتا۔ میں نے دوسرے راستے کا انتخاب کیا، میں خود تو جھوپنپڑی میں رہا لیکن میں نے پوری قوم کو محلات میں لا بھایا۔“

یہ ایلو رستار ملائیشیا کا ایک قصہ ہے اور سکول ماشر کے اس دوسری بیچ کا نام مہاتیر محمد، مہاتیر کے فلسفہ ترقی کے چار بنیادی عناصر تھے۔ وہ کہتا تھا شخص ہو یا قوم وہ قرض لے کر بھی امیر نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی قوم قرضوں سے امیر ہو سکتی تو پورا افریقہ اس وقت یورپ ہوتا۔ کوئی قوم تعلیم کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی، کوئی قوم جب تک صنعت اور تجارت کے شعبوں میں داخل نہ ہو ترقی نہیں پاسکتی اور چونکہ جب تک آپ محروم طبقوں کو مرکزی دھارے میں شامل نہیں کرتے آپ ترقی نہیں کر سکتے۔ اس کا کہنا تھا آپ بھوکے کو ایک پھلی دے دیں اس کا ایک دن آرام سے گزر جائے گا لیکن آپ اسے مجھلی پکڑنے کی کندھی دے دیں تو وہ عمر بھر کے لئے خود لفیل ہو جائے گا۔ اس نے اقتدار سنبھلاتے ہی چند دلچسپ فیصلے کئے۔ اس نے ملائیشیا کے تمام دیہاتوں میں سینڈری سکول کھوول دیئے، دیہاتی بچوں کو سکالر شپ پر شہر کے کالجوں میں داخل کرایا اور یونیورسٹیوں میں گاؤں کے طالب علموں کا کوئی مخصوص کر دیا۔ ان اقدامات کے نتیجے میں ملائیشیا کے دیہات میں تعلیم سو فیصد ہو گئی۔ اس نے سرکاری خرچ پر باصلاحیت نوجوانوں کو امریکہ اور یورپ کی یونیورسٹیوں میں داخلے دلائے، اس نے یورپ اور امریکہ میں کام کرنے والے مالی نوجوانوں کو پیشکش کی ”آپ جو معافی امریکہ میں لے جائیں اس تجواہ پر ملائیشیا“ جائیں۔ یہ اعلیٰ تعلیم یافت نوجوانوں اپنے آئے اور انہوں نے تیسری دنیا کے ملک کو پہلی صفت میں لا کھڑا کیا۔ اس نے بڑس بھر اور بڑنس میں تیار کرنے کے لئے پا قاعدہ یونیورسٹی بنائی۔ اس کا کہنا تھا اگر آپ معاشر ترقی چاہتے ہیں تو پہلے مقامی لوگوں کے ذہن کو ترقی دیں، اس کا خیال تھا کسان کبھی ترقی نہیں کر سکتے کیونکہ یہ لوگ گزارے سے آگے سوچ نہیں سکتے۔ یہ عمر بھر سال کا غد جمع کرتے رہتے ہیں۔ لہذا جن ممالک میں کاشنکار زیادہ ہیں وہ ہمیشہ پسمندہ رہتے ہیں۔ اس نے ہماری میں پہلی مرتبہ کسانوں کو کاروباری سوچ دی، انہیں بڑنس میں بنایا۔ اس نے 1990ء میں ویژن 2020 کی بنیاد رکھی۔ اس کا خیال تھا 30 برس میں ملائیشیا ترقی یافت ہو جائے گا لیکن اس کے تصور سے کہیں پہلے 1996ء ہی میں ملائیشیا ایشیان نائیگر بن گیا، اس کی ترقی کی سالانہ شرح 8.6 ہو گئی۔ ملک میں سو فیصد روزگار ہوا، لوگوں کی آمدی میں اضافہ ہوا اور غربت مکمل طور پر ختم ہو گئی۔ آج یہ صورت حال ہے وہ ملک جس میں کبھی شہنشاہ اور رہبر کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اس میں دنیا کی بلند ترین عمارت اور سلیکان ویلی سے بڑی کپیوٹ مارکیٹ ملٹی میڈیا پر کوڈیڈور ہے۔ کوالا لمپور کی ایک شاہراہ پر بلند عمارت دیکھ کر کسی امریکی نے پوچھا تھا ”یہ کس ملک کی اداو سے ہے؟“ مالی کا یہ نہ لے جواب دیا ”یہ عمارت کسی ملک کی امداد کے بغیر ہم نے خود بنائی۔“ امریکی نے فوراً جواب دیا ”یہ ہو ہی نہیں سکتا، اتنی شاندار عمارت کسی ایشیانی ملک نے امریکہ کی مدد کے بغیر بنائی ہو۔“ یہ امریکی مہاتیر سے واقع نہیں تھا ورنہ اسے معلوم ہوتا مہاتیر ایسے مجرزے کر سکتا ہے۔

مہاتیر محمد پہلے 22 برس سے مسلسل وزیر اعظم چلا آ رہا ہے۔ وہ عوام کے ووتوں سے منتخب ہوتا آ رہا ہے، اس وقت اس کا شمار ایشیاء کے طویل الدت وزیر اعظم میں ہوتا۔ اس کی یہ مقبولیت اس کی محنت اور نیک

نئی کی مر ہون ملت ہے لیکن اس نے 28 جولائی کو اعلان کر دیا" میں اکتوبر 2003ء میں ریناڑ ہو جاؤں گا۔" اس کے اس اعلان پر اس کی پارٹی نے بڑا خوبصورت تبرہ کیا اس نے کہا "شاید ایک ہزار برس تک ملائشیا کو دوسرا مجاہیر نصیب نہ ہو۔" میں سوچتا ہوں کبھی کسی مورخ نے مجاہیر اور پاکستانی حکمرانوں کا مقابلی جائزہ لیا تو اس کے ہاتھ کیا آئے گا یقیناً صرف ایک نقطہ اس کے ہاتھ آئے گا، مجاہیر نے اپنے خاندان کو امیر ہنانے، ایلوستار کے جنوہی حصے سے شمال میں منتقل ہونے کی بجائے دوسرا راستہ منتخب کیا تھا۔ پوری قوم کا مقدر بدلتے کا فیصلہ کیا تھا جبکہ پاکستان کا ہر حکمران اپنے آپ اور اپنے خاندان کو امیر ہنا تا رہا۔ جسونپر ڈپنی سے محلاں میں منتقل ہوتا رہا۔ چنانچہ حکمران امیر ہو گئے اور ملک غریب۔

یقین کیجئے دنیا میں صرف مجاہیر محمد جیسے لیدر ہی ٹا جیات حکمران رہتے ہیں جبکہ پرویز مشرف، نظراللہ جمالی اور چودھری شجاعت جیسے لوگوں کی جیات بھی مختصر ہوتی ہے اور حکومت بھی۔





شاید کبھی نہیں

وہ شمال مشرقی بریزیل کے ایک انتہائی پسماندہ علاقے میں پیدا ہوا، والدین گردن تک غربت اور بے بی میں فتن تھے۔ نام اس کا لوز اینا سیولا لادی سلوا تھا۔ اس کا پورا بچپن محرومی اور غربت میں گزارا۔ تعلیم، سکول اور یونیفارم کا تو تصور بھی گناہ تھا وہ تو بچپن میں بچوں کی طرح کھیل بھی نہیں سکتا، جوئی ذرا بڑا ہوا، والدین نے اسے پاش کی ایک ڈبیا اور برش لے دیا، وہ صحیح سویرے گھر سے نکل جاتا اور شہر میں پھر پھر کر لوگوں کے جو تے پاش کرتا، لوگ اسے "لولا" پکارتے تھے۔ لوگ اسے اب بھی لولا ہی پکارتے ہیں۔ وہ لڑکیں میں داخل ہوا تو موگ پھلی بیچنے لگا، وہاں سے لوہے کی ایک مل میں بھرتی ہو گیا۔ سارا سارا دن لوبا کوئتا، لوہے کی سرخ سلانیں بھٹی سے کھینچتی، انہیں کام اور سبھا اٹھا کر رکوں ہیں فالک۔

یہ اس کا بچپن، لڑکیں اور جوانی تھا۔ اس کے ہاتھوں پر ابتدائی زندگی کی مشقت ابھی تک نقش ہے۔ آج جب دنیا بھر کے سفارتی تماںندے، بڑے بڑے سیاستدان، بنس میں، وائزور اور اپنی اس سے ہاتھ ملاتے ہیں اور نہیں کہ اس کے ہاتھوں کے کھرد رے پن کی نشاندہی کرتے ہیں تو وہ قبیلہ لگا کر کہتا ہے "یہ مزدور کے ہاتھ ہیں، اصلی اور سچے مزدور کے ہاتھ" اس نے دس سال کی عمر میں پڑھنا شروع کیا، وہ سارا دن مشقت کرتا تھا اور شام کو کتابیں کھول کر بیٹھ جاتا تھا، یہ سلسلہ بھی زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ وہ خود کہتا ہے "میں کتاب کھولتا تو پہلیں آنکھوں پر جھک جاتیں، گردن سینے سے لگ جاتی اور ناخنوں اور حلقوں سے خراۓ اٹنے لگتے، میں نے ایک دن خود سے کہا، لولا پڑھانی تمہارے بس کی بات نہیں، شاید کسی بھی دس بارہ گھنٹے کام کرنے والے مزدور کے بس کی بات نہیں لہذا میں نے پڑھنا چھوڑ دیا لیکن اس مشق کے دوران مجھے لفظوں اور ہندسوں کی شاشت ہو گئی۔ مجھے بڑی حد تک پڑھنا اور معمولی حد تک لکھتا آگیا۔ میں نے آنکھہ زندگی میں لکھنے پڑھنے کی اس استعداد کو شائع نہیں ہونے دیا۔" لکھنے پڑھنے کی اس مشق کے دوران اشتراکیت پر چند کتابیں اس کے ہاتھ لگ گئیں، وہ بائیں بازو کی تحریک سے متاثر ہو گیا اور اس نے مزدوروں کے حقوق کی بیگن شروع کر دی، مزدوروں کو مجمع کیا، یونیمن بنائی اور سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا، اس کی لگن چیزیں، کام کرنے کا جذبہ تھا۔ سیاست میں اخلاص اور سادگی تھی اور سب سے بڑھ کر وہ پہلا سیاستدان تھا جو خود مزدور ہو، وہ

کر مزدوروں کے حق کے لئے لڑ رہا تھا لہذا مزدور ہاری اور چھوٹے غریب کسان اس کے گرد جمع ہونے لگے، کوئی دل درخت، قطرہ سیلا ب اور چنگاری بھانڈر بننے لگی۔ یہاں تک کہ اس نے 1980ء میں اپنی سیاسی جماعت بنانے کرتے ہی سیاست کے دریا میں چھلانگ لگادی۔

لوالا ڈی سلووا کا خیال تھا ”جب تک حکومت مزدوروں کے ہاتھ نہیں آتی، تہذیلی نہیں آسکتی۔“ مزدور اور کسان اسے چاہتے بھی بہت تھے، لولانے گزشتہ برس برازیل میں زرعی اصلاحات کا مطالبہ کیا، حکومت نے مراجحت کی، لولانے کسانوں کو اشارہ کیا اور پائچ سو بے زمین خاندانوں نے صدر کرڈو سو کے زرعی فارم پر قبضہ کر لیا۔ حکومت نے بعد ازاں پولیس اور فوج کی مدد سے قبضہ چھڑایا۔ لوالا ڈی سلووانے تین مرتبہ صدارتی ایکشن لڑا، وہ تینوں مرتبہ ہارا لیکن اکتوبر 2002ء کے ایکشن میں وہ بھاری میمندیت کے ساتھ صدر منتخب ہو گیا۔ عوام نے اسے برازیل کی تاریخ میں سب سے زیادہ ووٹ دیئے۔ اسے 61 فیصد ووٹ ملے۔ یوں جوتے پاش کرنے والا ایک ایسا شخص دنیا کی تویں بڑی میمیٹ کا سربراہ بن گیا، جس کا بھپن، جوانی اور ادھر عمری کا رخانوں اور طنوں میں گزری تھی جس کے پاس کسی سکول، کسی کالج اور کسی یونیورسٹی کی ڈگری نہیں تھی۔

لوالا ڈی سلووا کی کامیابی نے پوری سرمایہ دار دنیا کو ہلا دیا، برازیل میں عالمی مالیاتی اداروں کے 260 ارب ڈالر پہنچنے لگے۔ اس وقت ملٹی نیشنل کمپنیوں کا دو تھائی سرمایہ برازیل میں لگا ہے، ایک یا ائم بآس و کے زر در و صدر کے انتخاب کے بعد یہ سرمایہ خطرے کا شکار ہو گیا۔ دوسرا لوالا ڈی سلووانے کروڑ سو چھیس شخص کو نکست دی جسے جدید برازیل کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ 1993ء کے آخر میں برازیل میں افراط زر کی شرح 5 ہزار فیصد ہو چکی تھی کروڑ سو نے معاشری اصلاحات کیس جس سے برازیل کی میمیٹ کو سہارا ملا۔ افراط زر 1998ء میں پائچ ہزار فیصد سے صرف اڑھائی صد فیصد پر آگئی اور 2000ء میں چھٹی صدرہ گئی، جو کسی اقتصادی میجرے سے کم نہیں تھی۔ 2000ء میں برازیل کا جی ڈی پی تھا 588 ارب ڈالر تھا، اس وقت برازیل دنیا کی تویں بڑی میمیٹ ہے، اسے اتنی بڑی میمیٹ کروڑ سو نے بنایا تھا لیکن لوالا ڈی سلووانے 30 اکتوبر 2002ء کو اس کروڑ سو کو چاروں شانے چت کر دیا۔ یوں برازیل کی تاریخ میں باسیں بازو کا پہلا مزدور صدر طلوع ہوا جس نے پوری سرمایہ دار دنیا کو جزوں سے ہلا دیا۔ لوالا ڈی سلووا کا انتخاب تیسری دنیا کے محروم ممالک کے لئے پیغام ہے کہ اب بھی اگر کوئی جوتے پاش کرنے والا، موجود پھٹلی بیچنے والا اور لوہے کے کارخانے میں لوہا کوئٹے والا مزدور چاہے تو وہ دنیا کا نقشہ بدلتا ہے، ایک چینی چلاتی سیاست طاقت بن کر طلوع ہو سکتا ہے۔

آئیے اب پاکستان کی نئی جنم لئی اسلامیوں پر نظر ڈالتے ہیں اور خود سے پوچھتے ہیں کیا ان ایک ہزار سیاستدانوں میں لوالا ڈی سلووا جیسا کوئی شخص ہے، مزدوں، ہاریوں، کسانوں اور بے روزگاروں کے اس ملک میں بے روزگاروں کسانوں، ہاریوں اور مزدوں کا بھی کوئی تمثیلہ اسکلی پہنچا ہے۔ انہوں آپ کو ان

اس بیویوں میں ایک بھی ایسا شخص نہیں ملے گا جس کے ہاتھوں میں مشقت کی گر ہیں اور مزدور یوں کا کھر دراپن ہو، جو اس ملک کی اکثریت کا نمائندہ ہو، کیا پھر یہی وہ تبدیلی ہے جو نے جس کے خواب دیکھتے تھے۔ کیا یہی وہ روشن صحیح ہے جس کے انتظار میں ہماری آنکھیں پتھر اور ہماری سائیں برف ہو گئی تھیں، کیا اس ملک میں کبھی ایسا ممکن ہو گا؟ کیا اس ملک میں بھی لولا ذیہ سلوا جیسا کوئی شخص طلوع ہو گا۔ کیا ہم بھی کسی ایسے شخص کو حکومت کا حق دیں گے جو حقیقتاً عوام کی اکثریت کا نمائندہ ہو، جس کے پیچھے دوست کی طاقت اور لوگوں کا اعتماد ہو! شاید نہیں، شاید کبھی نہیں کہ لولا جیسے لوگ ان ملکوں میں طلوع ہوتے ہیں جن کا ضمیر زندہ ہو، جنہیں اپنے مستقبل سے دلچسپی ہو اور جو اپنے ملک سے محبت کرتے ہوں۔



دو ٹکے کا آدمی

یہ 1996ء کے نومبر کی ایک نرم سہ پھر تھی، اسلام آباد کی شاہراہوں پر ٹرینک روائی دواں تھی، اچانک پولیس کی ایک گاڑی ہوڑ بجاتی ہوئی آئی۔ اس میں سے پولیس کے تین اہلکار اترے، انہوں نے سفید دستانے چڑھائے، سکندرز کے سونچ آف کے اور دائیں بائیں دونوں اطراف کی ٹرینک روک کر کھڑے ہو گئے۔ چند ہی لمحوں میں دور دور تک گاڑیاں کھڑی ہو گئیں۔ ایک پورٹ کی طرف سے پر دنوں کوں کی گاڑیاں آئیں، ہوڑ بجے اور یہ قافلہ شپش کے ساتھ ایوان صدر کی طرف مزدگی، جب یہ گاڑیاں گزر گئیں تو ایک عام ہی گاڑی کا شیشہ نیچے سر کا اور ایک بزرگ نے منہ باہر نکال کر کاشیبل سے پوچھا "بیٹا! ابھی یہاں سے کون گزر رہتا" کاشیبل نے بیزاری سے جواب دیا "ہوڑ بخاب صدر سے ملٹھ گئے ہیں" بزرگ نے شیشہ اور پر کیا اور موبائل پر کسی کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسرا طرف سے ہیلو ہوئی تو بزرگ نے نہس کر کہا "خوبیہ صاحب وزیر اعظم تو میں ہوں مگر میری گاڑی ہجوم میں پھنسی ہوئی ہے اور آپ پورے پر دنوں کوں سے گزر رہے ہیں، میں سوچ رہا ہوں آپ کے ساتھ اپنا عہدہ بدلتا لوں۔"

یہ ملک معاراج خالد تھے اور یہ واقعہ ان کی وزارت عظیمی میں چیش آیا۔ دنیا میں بے شمار وزیر اعظم گزرے ہیں، بے شمار وزیر اعظم اس وقت بھی موجود ہیں۔ دنیا میں بے شمار وزیر، وزیر اعلیٰ اور پسیکر بھی گزرے ہیں، بے شمار وزیر، وزیر اعلیٰ اور پسیکر اس وقت بھی موجود ہیں لیکن ان میں ملک معاراج خالد جیسا کوئی تھا اور نہ ہی کوئی ہو گا۔ ایک ایسا شخص جو جیسوں کے باڑے میں پیدا ہوا، جس نے تین سال کی عمر میں زندگی کا بوجھ سر پر انحالیاً، جو مسلسل دو برس تک ایک ہی کرتا پہنچتا رہا، جس کا سارا بچپن سالن کی ایک رکابی اور ایک ٹکڑے کے ارد گرد گھومتا رہا، ان جیسا کوئی دوسرا شخص ہو گا، شاید نہیں۔

"ہے میرے بیٹے تھے اور میں ان کا بالا، میں نے بے شمار شاہیں ان کے ساتھ گزاریں۔ بتایا کرے تھے" جب میں سکول داخل ہوا تو فیس کے چیزیں نہیں ہوتے تھے، میں نے اس کا یہ حل نکالا، میں دو ڈھنی (گوالا) بن گیا، میں سرویاں ہوں یا گرمیاں رات تین بجے انتہا، سائیکل کے دائیں بائیں دو ڈھنگی دو ڈھنیاں" پاندھتا، دو گھنٹے سفر کرتا، لا ہور پہنچتا، دروازے دروازے دو دو حصہ پہنچتا، مسجد میں جا کر کپڑے بدلتا اور

سکول چلا جاتا۔" ایک روز انہوں نے جوتے اتار کر پاؤں لان کی گھاس پر رکھے اور مسکرا کر بولے "بچپن میں میرے پاس جوتے نہیں ہوتے تھے۔ سکول کے لئے بوٹ ضروری تھے۔ میں نے جیسے تیسے دودھ بیچ کر بوٹ خرید لئے۔ اب مسلسل یہ تھا اگر میں گاؤں میں بھی یہ بوٹ پہننا تو وہ خراب ہو جاتے لہذا میں گاؤں سے والد صاحب کی دلیسی جوتی پہن کر آتا۔ شہر میں جہاں دودھ کے ذوبہ رکھتا تھا وہاں میں اپنے بوٹ، بھی کپڑے میں پیٹ کر چھپا جاتا تھا، میں وہاں جوتے بدلتا اور سکول چلا جاتا، شام کو میں والد کو جوتے واپس کر دیتا تھا اس دوران وہ سارا دن نگہ پاؤں پھرتے تھے" میں ان کی باتیں سنتا تھا اور دیر تک جیز توں میں گم رہتا تھا" کیا یہ اسی ملک کا شہری، اسی ملک کا سیاستدان ہے۔" ہر بار میرا دماغ جواب دیتا" نہیں یہ کوڈیں میں پھنسی وہ کون ہے جو غلطی سے ادھر آگئی تھی۔"

ملک صاحب کوں کر یقین نہیں آتا تھا ان کا تعلق اسی ملک کی سیاست سے ہے، وہ وزیر تھے تو وزیر نہیں لگتے تھے، وزیر اعلیٰ ہوئے تو یقین نہیں آتا تھا وہ واقعی وزیر اعلیٰ ہیں، تمیں کروں کے پرانے گھر میں رہتے تھے، ہاتھوں میں فائلوں اٹھا کر آتے تھے۔ دروازے پر کال بل تک نہیں تھی، لوگ وزیر اعلیٰ کے دروازے کا کندہ ابجاتے تھے۔ پنجاب کی "فرست لیڈی" سکول میں پڑھاتی تھیں، وہ روز رکش پر سکول جاتی تھیں، گھر کا یہ عالم تھا، صحیح سوریے لوگ انہیں گھیر لیتے، وہ قشی خانے میں شیوکر رہے ہوتے بافضل فرمادی ہے ہوتے۔ لوگ دروازے سے چپ کر اپنے سائل ننانے رہتے۔ وہ وزیر تھے، وزیر اعلیٰ، پیغمبر یا وزیر اعظم وہ تقریبات میں وقت پر چکختے، اکثر ایسے ہوتا وہ پنڈاں میں پہنچنے والے پہلے شخص ہوتے تھے۔ اس سلوک پر وہ بھی ہر ایسی مناتے تھے، چپ چاپ کی کونے میں بینڈ کر سکریٹ پیٹے رہتے تھے، لا الہ موی میں میرے بھائی کا ولیہ تھا، میں نے مہمانوں کو ایک بجے کا وقت دیا تھا، میں ہوں سے دور تھا، گھری پر نظر پڑی تو ہوں کی طرف دوڑ پڑا۔ دوستوں نے وجہ پوچھی تو عرض کیا، ایک بجنتے میں پائی منٹ ہیں ملک صاحب نجیک ایک بجے پہنچ جائیں گے، ابھی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ملک صاحب گاڑی سے اتر رہے تھے، انہیں پر ہوں کوں سے چڑھتی، کبھی ہوڑ والی گاڑی استعمال نہیں کی۔ چھوٹی سی گاڑی میں ہمیشہ اگلی سیٹ پر بیٹھے، وزیر اعظم تھے تو چڑھائی کو بالے کی بجائے کاغذ اٹھاتے اور خود ہی متعاقہ آفیسر کو تھما آتے۔ میں نے عرض کیا، مجھے اخزو یو دیں، میں آپ کی سوانح عمری لکھتا ہوں، فرمایا "سوانح عمریاں ان کی لکھی جاتی ہیں جنہوں نے زندگی میں کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہو، میں تو ملک کو کچھ بھی نہیں دے سکا میری سوانح بھی منافت ہوگی۔" میں نے عرض کیا "بابا جی سونے کے غار میں رہ کر پاؤں کی مٹی بچالینے سے بڑا کارنامہ کیا ہوگا۔" بولے "بھارت میں ایسے درجنوں لیڈر ہیں سیاست اور اقتدار جن کا لباس تک نہ بدل سکا۔"

ایوب خان کا دور تھا، بابا جی نے "ٹھیکرہ بھر جان" کے عنوان سے پنفلٹ لکھا، اخباروں میں چچا ہوا تو اس وقت کے گورنمنٹ پاکستان مویں لے بیان جاری کیا۔ یہ دو نگہ کا آدمی ہماری حکومت کا کیا بجاڑکتا

ہے۔" بجزل صاحب نے تھیک فرمایا تھا، ملک صاحب واقعی دو لگنے کے آدمی تھے لہذا وہ ایوب کا کچھ بگاڑ سکے اور نہ ہی اس کے بعد آنے والی کسی حکومت کا، لیکن اس کے باوجود دو لگنے کے اس شخص میں کوئی ایک بات تھی جو سونے کے بنے سنبھری لوگوں میں نہیں تھی۔ ایوب خان ہوں، ذوالتفقار علی بجنو، بنیظیر یا تواز شریف، یہ لوگ کیا جائیں ان دو ملکوں کی قیمت، ان کی قیمت تو حضرت ابو بکر صدیقؓ جانتے ہیں یا پھر ان کے آقا علیہ السلام، بدرؓ کی جگ کے لئے ساز و سامان کی ضرورت پڑی تو کسی نے گھر کا پوچھائی سامان پیش کر دیا اور کسی نے نصف، آپؓ کے پاس نوٹ پھولے چند برتوں اور پرانے مکبوں کے سوا کچھ نہیں تھا، آپؓ وہ سب کچھ لے کر حاضر ہو گئے، پوچھا گھر والوں کے لئے کیا چھوڑا۔ عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ﷺ، ہمارے بابا جی کے پاس بھی وہی دو لگنے تھے اور انہوں نے یہ دو لگنے اپنے ایوب میں ڈبو کر اس ملک کو پیش کر دیئے، یہ درست ہے یہ دو لگنے کا آدمی زندگی بھر کسی حکومت کا کچھ نہ بگاڑ سکا لیکن مجھے یقین ہے روز قیامت یہ دو لگنے کا شخص صدیقوں کی صفت میں اٹھایا جائے گا۔ ان صدیقوں کی صفت میں جو غربت میں پیدا ہوتے ہیں، عمر بھر دنیا کے تختوں پر بیٹھتے ہیں لیکن جب فوت ہوتے ہیں تو گھر سے کافن تک نہ لٹکا، ملک صاحب کہا کرتے تھے "جن ملکوں کے سیاستدان امیر ہوتے ہیں وہ ملک ہمیشہ غریب رہتے ہیں۔"

آئئے اس غریب ملک کے آخری غرب سیاستدان کو دفن کر دیں، دو لگنے کے ساتھ ہے چودہ کروز لوگوں کے آخری لیڈر را دفن کر دیں۔

(نوٹ یہ کالم جناب ملک معراج خالد کے انتقال پر لکھا گیا)



آب حیات

"کھانے میں بہت احتیاط بر تے تھے، ان کا کھانا تھا، ایک ناشتا اور ایک کھانا کافی ہے۔ گوشت سے پرہیز کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے گائے دودھ دینے کے لئے پیدا کی تھی لیکن ہم اسے ذبح کر کے کھا جاتے ہیں اور دودھ باہر سے منگواتے ہیں۔ سیال خوراک کے قائل تھے۔ تازہ بچلوں کا جوس اور دودھ پیتے تھے، سوتے بہت کم تھے، جو وقت مٹا اسے لگھنے پڑھنے میں صرف کرتے۔ جہاز میں ہوتے یا موڑ کار میں ان کا قلم چلتا رہتا، روزے رکھنے کے شوقین تھے، زندگی بھر روزے کے بغیر مطب نہیں گئے۔ وقت کو، اپنی مصروفیات کو اور حالات کو ایک معمول پر لے آئے۔ فرماتے تھے، یہ کیسا ملک ہے جو اپنے بچوں کو تعلیم نہیں دے سکتا، ان کے دل میں بچوں کے لئے خصوصی لوگوں کا تھا۔ نیا میں جہاں تھی، ہوتے ایک دن بچوں کے ساتھ گزارتے۔

یہ ہمارے حکیم سعید تھے۔ 17 اکتوبر اس ملک کے ان چند عظیم لوگوں میں سے ایک کا یوم شہادت ہے جس پر ہم بلاشبہ فخر کر سکتے ہیں۔ 16 سے 18 اکتوبر 2002 تک میں کراچی رہا۔ حکیم سعید کے اداروں کی سیر کا اتفاق ہوا۔ شہید کے پرانے رفتار سے ملاقات ہوئی۔ شہید کی صاحبزادی محترمہ سعدیہ راشد سے حکیم صاحب کے معمولات سننے کا موقع ملا۔ جوں جوں شہید کا ذکر ہوتا گیا دل میں ان کی قدر، ان کی محبت یو ہتی گئی۔ واقعی حکیم صاحب نے جتنا کام، وہ کسی عام شخص کے بس کی بات نہیں۔ روزہ ہمدرد میں بوریوں کے حساب سے ڈاک آتی تھی اور وہ نہ صرف یہ تمام خط پڑھتے تھے بلکہ خود اپنے ہاتھ سے جواب بھی لکھتے تھے۔ حکیم صاحب کی ذاتی زندگی کے بارے میں تحقیق کرنے والے ادارے "اوارہ سعید" نے اب تک ان کے ہاتھ سے لکھے ہوئے 12 لاکھ، خطوط، رقعے اور پیغام جمع کئے۔ شہید نے زندگی میں 2 سو کتب لکھیں۔ 72 ہزار صفحات تحریر کئے۔ ذاتی لاہوری میں سازی ہے چار لاکھ کتب تھیں۔ تمام اخبارات پڑھتے تھے۔ 20 میں الاؤای اور قوی جرائد مستقل ان کے زیر مطالعہ رہتے تھے۔ مطالے کے دوران مختلف حصے نشان زدہ کرتے جاتے تھے۔ بعد ازاں ان کا عملہ اخبارات سے وہ حصے کاٹ لیتا تھا، یہ تراشے ان کی لاہوری کے "کلپنک سیکشن" میں جمع ہو جاتے تھے۔ ہمدرد یونیورسٹی کی لاہوری میں اس وقت پاکستان کا سب سے بڑا "کلپنک

سیشن" ہے اس میں 1210 موضوعات پر لاکھوں تراشے ہیں۔ یہ تمام تراشے حکیم صاحب کے نشان زدہ ہیں۔ شہید نے وقت کو تقسیم کر رکھا تھا۔ وہ بیتھتے کامیک دن ہمدرد انڈسٹری میں گزارتے۔ ایک دن ہمدرد پلیک سکول اور یونیورسٹی کو دیتے اور دو دن مطب کرتے تھے، وہ گورنر تھے تو اس وقت بھی باقاعدگی سے مطب آتے تھے، مریض دیکھتے تھے، ذاتی گازی اور ذاتی ڈرائیور استعمال کرتے تھے۔

بڑے لوگوں کی باتیں بھی بڑی ہوتی ہیں۔ جب وہ کسی تقریب، کسی شادی میں شرکت کے لئے جاتے تھے تو مطب کے ریکارڈ سے اس جگہ کے مریضوں کے نام پتے ساتھ لے جاتے تھے۔ راتے میں رک کر کسی مریض کے دروازے پر دستک دیتے، سلام کرتے اور فرماتے، میں ادھر سے گزر رہا تھا، سوچا آپ کی عیادت کرلوں۔ اب آپ کیسے ہیں، مریض حکیم سعید کو دیکھ کر ششدروہ جاتا۔ وہ اپنی آمدی، اپنی کمالی کو قوم کی امانت سمجھتے تھے۔ 19 جنوری 1948ء کو پاکستان آئے۔ 28 جون 1964ء کو اسے فاؤنڈیشن کی شعلہ ادارہ پاکستان کے چند بڑے کاروباری اداروں میں شمار ہونے لگا۔ کم جنوری 1964ء کو اسے فاؤنڈیشن کی شعلہ دے دی گئی۔ جب یہ پوری طرح پھل پھول گیا تو حکیم صاحب نے اس کی ساری آمدی پاکستان کے لئے وقف کر دی۔ اب اس ادارے کی ایک پانی پر حکیم صاحب کے خاندان کا کوئی احتراق نہیں، ہمدرد کی ایک پراؤکٹ کروزوں اربوں کا بنس کرتی تھی لیکن شہید نے پوری زندگی اسی معمولی گھر میں گزار دی جس میں وہ بھرت کے بعد تھبرے تھے۔ اس ایک مکان کے سوابوری دنیا میں ان کے خاندان کے پاس کوئی جائیداد نہیں، اخراجات کے معاملے میں بہت حساس تھے، وہ کہا کرتے تھے ایک لشون بیپ سات پیسے میں آتا ہے لیکن لوگ اسے بڑی بے دردی سے خالع کرتے ہیں۔ زندگی کے ایک طویل عرصے تک وہ اشتہاروں کی صاف پشت پر لکھتے رہے۔ کہتے تھے کاغذ کا حصہ ضائع نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کفران نہت ہے!

شہید کو تعلیم کا جنون تھا، 1983ء میں شہر سے باہر 1260 ایکڑ اراضی خریدی، یہ ایک مکمل دیرانہ تھا لیکن وہاں کھڑے ہو کر کہا "مجھے یہاں بچے کھیلتے دکھائی دیتے ہیں" میں نے 17 اکتوبر 2002ء کو دا قی خزاروں بچے کھیلتے دیکھے۔ یہ دیرانہ آج مدینہ الحکمت کہلاتا ہے۔ یہاں ہمدرد پلیک سکول کی شاندار عمارت ہے، کالج آف میڈیسین، کالج برائے طب شرقی، انسٹی ٹیوٹ آف فارماکولوژی اینڈ ہریل سائنسز، انسٹی ٹیوٹ آف اسیجوکیشن اینڈ سوٹل اینڈ میکنالوجی، ہمدرد سکول آف لا اور لاکھوں کتب پر مشتمل ایک لاجبری بیت الحکمت ہے۔ میں نے ساتھا جنگل میں منگل ہوتا ہے لیکن میں نے یہ منگل دیکھا ہیلی مرتبہ۔ مدینہ الحکمت کا ایک اور کمال وثیق سکول ہے، اس سکول میں علاقے کے دیہاتی بچے انہیں کامیابی کا اس رومنوں میں انہیں اساتذہ سے ہی سلیسیس پڑھتے ہیں جو پلیک سکول کے طالب علموں کو ہر حالیا جاتا ہے لیکن یہ ساری تعلیم مفت ہوتی ہے۔ ان دیہاتی طالب علموں کو یونیفارم اور کتب بھی ملتی ہیں۔ وثیق سکول میں اس وقت ساڑھے چار سو بچے پڑھ رہے ہیں۔ مجھے ان چہروں پر ایک ایسا نور دکھائی دیا جو صرف علم کی روشنی سے جنم لیتا ہے۔

آپ ہمدرد سکول کے ایڈنٹریٹر کے دفتر میں داخل ہوں تو سامنے شہید کی ایک بڑی تصویر آؤزیں۔ آپ تصویر میں وہ سینکڑوں نئے نئے بچوں کے درمیان کھڑے ہیں۔ تصویر پر کہش لگا ہے ”میرے نو نہالوں میں اب بھی تمہارے ساتھ ہوں۔“ مدینہ الحکمت سے واپس آتے ہوئے میں نے سوچا انسان موت کو ٹکست نہیں دے سکتا لیکن وہ لوگ جو قافی دنیا میں غیر قافی کام کر جاتے ہیں وہ بھی غیر قافی ہو جاتے ہیں۔ وہ موت کو ٹکست دے دیتے ہیں۔ اس ملک میں جب تک کوئی غریب، کوئی نادار، کوئی مسکین بچہ ہمدرد کی ہمدردی سے فیض یا ب ہوتا رہے گا، حکیم سعید زندہ رہے گا، حکیم سعید ہمارے ساتھ رہے گا کہ مرتے قافی لوگ ہیں جنہوں نے شہادت کا علم و حکمت میں قدم رکھ دیا وہ خضری عمر کو پہنچ گئے۔ انہوں نے آب حیات پیا۔



بُونوں کا دلیس

رفیع الدین احمد 1970ء میں اقوام متحده میں ملازم ہوئے اور 29 سال کی خدمات کے بعد 1999ء میں ریٹائر ہو گئے۔ زندگی کے ان تینتی برسوں میں وہ متعدد کلیدی عہدوں پر فائز رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے حکومت پاکستان سے درخواست کی اگر انہیں شویارک کے پاکستانی مشن میں ایک میز اور ایک کری دے دی جائے تو وہ پاکستان کے لئے بلا معاوضہ کام کرنے کے لئے تیار ہیں۔ یہ درخواست اقوام متحده میں پاکستانی سینئر احمد کمال کے ذریعے اس دور کے سینئر ٹرینی خارجہ شمشاد احمد کے حضور پہنچی، سینئر ٹرینی خارجہ نے شکریہ کے ساتھ یہ درخواست مسترد کر دی۔ چند ہی روز بعد اقوام متحده کے انتہائی اہم ادارے یو این ڈی پی نے بھارتی معاوضے پر انہیں اپنا مشیر بنایا۔ وہ اقوام متحده کے خواتین کی ترقی سے متعلق ادارے "یو این آئی ایف ای ایم" کے ایئڈوائزرا اور ولڈ نور ازم آر گنائزیشن کے نمائندے بھی منتخب ہو گئے، 2003 کا اپریل آیا تو اقوام متحده کے سینئر ٹرینی جzel کوئی عنان نے رفیع الدین احمد کو عراق کے لئے اپنا خصوصی مشیر چن لیا، یہ عہدہ لمحہ موجود میں اقوام متحده کی سب سے اہم پوزیشن ہے۔

جناب رفیع الدین احمد کی مثال نے ایک بار پھر ثابت کر دیا، ارض پاک کو حقیقتاً اچھے، قابل اور مخلص لوگوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہماری 55 سالہ تاریخ ایسے لوگوں کی حوصلہ شکنی کی گواہ ہے۔ 1961ء میں ایوب خان نے ملکی قوانین کو شریعت کے قاب میں ڈھانے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت پوری دنیا میں دو بڑے مسلم دانشور تھے، ایک جناب پروفیسر حمید اللہ اور دوسرے ڈاکٹر فضل الرحمن۔ پروفیسر صاحب پیرس میں مقیم تھے اور ڈاکٹر صاحب کینیڈا کی میکل یونیورسٹی سے وابست تھے۔ ایوب خان نے دونوں سکالروں کو پاکستان بانے کا فیصلہ کیا۔ یہ فریضہ فرزند اقبال جاوید اقبال کو سونپا گیا۔ جاوید اقبال دسمبر 1961ء میں کینیڈا اور پیرس گئے، پروفیسر حمید اللہ نے تو فوراً انکار کر دیا، پروفیسر صاحب کا کہنا تھا "میں حیدر آباد سے نکلا تو سیدھا پاکستان گیا لیکن پاکستان کی یونیورسٹیوں کے باسیوں نے مجھے وہاں آباد نہیں ہونے دیا جبکہ ڈاکٹر فضل الرحمن نے یہ درخواست قبول کر لی۔ ایوب خان نے انہیں اسلامی نظریاتی کوئی کام کا سربراہ بنا دیا لیکن مقامی علماء نے ان کے خلاف فتویٰ جاری کرنا شروع کر دیئے، وہ دلبرد اشتہ ہو کر واپس چلے گئے جہاں انہیں شکا گو یا یونیورسٹی نے قبول

کر لیا اور وہ ویس انتقال فرمائے آپ ڈاکٹر عبدالسلام کو لے چکے، ڈاکٹر صاحب نے 1961ء میں گورنمنٹ کالج کو جوانئی کیا، وہ کوئی کام کرنا چاہتے تھے، انہوں نے انتظامی سے درخواست کی "میں کوئی سنجیدہ کام کرنا چاہتا ہوں۔" کانچ انتظامی نے انہیں فٹ بال نیم کا کوچ بنادیا۔ انہوں نے کچھ عرصہ بعد دوبارہ درخواست دی تو انہیں ہائل کے وارڈن کی ذمہ داریاں سونپ دی گئیں، وہ 1954ء میں ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ انہیں اپریل کالج لندن نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور تھیورنیکل فریکس کا سربراہ بنادیا۔ وہاں سے وہ اٹلی گئے اٹلی کی حکومت نے ٹریسٹ میں ان کے نام سے ایک لیمارٹی بنائی، انہیں 1979ء میں نوبل پرائز طلا، معروف مصور گل جی ان سے ملنے گئے، پاکستان کا ذکر آیا تو ڈاکٹر صاحب کھڑے ہوئے اور گل جی کو سینے سے لگا کر بچوں پھوٹ کر روپڑے۔ انہیں عمر بھری شکوہ رہا پوری دنیا انہیں ہیر و بھختی ہے لیکن اہل دن کی نظرؤں میں وہ کافر ہیں۔

بھارت کے موجودہ صدر ڈاکٹر عبدالکلام 1972-73ء میں ہائینڈ سے پاکستان آئے، وہ پاکستان اٹاک انجی کمیشن میں نوکری کے خواہاں تھے، کمیشن نے انہیں "نالائق" قرار دے کر مسترد کر دیا۔ چھ ماہ پاکستان رہنے کے بعد وہ واپس لوٹ گئے۔ وہ ہائینڈ سے بھارت گئے، بھارت نے انہیں میزائل پروگرام میں نوکری دے دی، انہوں نے بھارت کو نہ صرف ایشی طاقت بنا دیا بلکہ اسے میزائل میکنالوجی میں بھی عالمی طاقتوں کے برابر لاکھڑا کیا۔ خود ڈاکٹر عبدالقدیر پاکستان آئے تھے تو سوت، ٹالی اور بوٹ والے باپوؤں نے انہیں مسترد کر دیا تھا۔ یہ تو اپنے ہوا ذوق افقار میں بھٹاؤں ایس واپس گھنٹے لائے، ورنہ آج ہم بھارت کا ایک پسمندہ صوبہ بن کر زندگی گزار رہے ہوتے۔

یہ کیا ہے؟ ایسا کیوں ہے؟ پوری دنیا اپنے ٹیکٹ کی قدر کرتی ہے، وہاں تو یورپ کے تین سرمایہ دار ملک کارل مارکس کو اپنا شہری قرار دے کر اس کی فرضی قبریں بنالیتے ہیں چار چار سو سال بعد ناٹراڈیمس کی ہڈیاں نکال کر واپس فرانس لائی جاتی ہیں، روس کو ڈیگال فرانس قرار دے دیتا ہے لیکن ہمیں دیکھئے ڈاکٹر عبدالسلام ہو، ڈاکٹر فضل الرحمن، پروفیسر حمید اللہ، ڈاکٹر عبدالکلام یا پھر رفیع الدین احمد ہمارے پاس ایسے لوگوں کی گنجائش نہیں، ہم لوگ کیا جنتے جا رہے ہیں۔ ہم لوگ کیا بننا چاہتے ہیں۔ مجھے طفیل نیازی مرحوم کی بات رہ رہ کر یاد آتی ہے، مرحوم کہا کرتے تھے ہم واپس عبور کرتے ہیں تو بھگوان ہوتے ہیں واپس آتے ہیں تو لوگ ہمیں سمجھ رکھتے ہیں۔ آخر ہم ہیں کیا! طفیل نیازی مرحوم کو یہ بات پوری زندگی سمجھنے آئی۔ فنکار تھا سمجھی کیسے سکتا تھا اسکی باتیں سمجھنے کے لئے تو انسان کو یوپا ی ہوتا چاہیے اور یوپا یہ کہتا ہے بونوں کے دلیں میں بونے خود کو بلند قامت ثابت کرنے کے لئے ہر لئے شخص کے پاؤں کاٹ دیتے ہیں۔ ہم اس ملک کو بونوں کا دلیں بناتے چلے جا رہے ہیں، اگر ہم نے پاؤں کاٹنے کا یہ سلسلہ بند نہ کیا تو یقین سمجھے عالم چناؤں کا یہ ملک کو ڈوؤں کی چھوٹی سی بستی بن کر رہ جائے گا ایسی ہستی جس کا آسمان بھی دس فٹ اونچا ہو گا۔



بے اولاد

گوجرانوالہ کے کسی پہلوان کا تھال ہو گیا۔ جنازے میں شریک ایک شخص نے دوسرے سے پوچھا ”پہلوان جی صاحب اولاد تھے یا بے اولاد“ دوسرے نے افسوس سے گردن ہلائی اور تاسف سے جواب دیا ”بے چارہ بے اولاد ہی چلا گیا“ وہاں تیرا شخص بھی موجود تھا، وہ فوراً بولا ”یارو کیوں جھوٹ بول رہے ہو، میں خود جانتا ہوں، پہلوان جی کے 6 بیٹے اور 2 بیٹیاں ہیں۔“ یہ تیرا شخص اکھاڑے کی روایت سے واقع نہیں تھا۔ پنجاب میں جب کوئی پہلوان چھینچنے پھینکنے ہو جاتا ہے تو وہ اپنا اکھاڑہ بناتا ہے اور پھر اس میں نوجوانوں کو سختی لازمی کی تربیت دیتا ہے۔ ان نوجوانوں میں سے اگر کوئی اس کے پائے یا اس سے بہتر کشتمی لڑتا ہے تو وہ اپنے استاد کا وارث کہلاتا ہے، وہ اس کا برخوردار، اس کا بہننا کہلاتا ہے۔ اگر کوئی استاد پوری کوشش کے باوجود اپنا وارث، اپنے پائے کا کوئی شاگرد پیدا نہ کر پائے تو وہ بے اولاد یا بے وارث کہلاتا ہے اور اس کی آخری زندگی عجیب بے چارگی، عجیب بے بسی میں گزرتی ہے۔ یہ روایت کلاسیکی موسیقی میں بھی موجود تھی۔ بڑے استاد اپنے شاگروں سے پہچانے جاتے تھے جس استاد کے جتنے نامور اور بڑے شاگرد ہوتے تھے وہ اتنا ہی بڑا خان صاحب اور گرو کہلاتا تھا۔ یہ اکھاڑے اور یہ تین ٹھیکیں فن کی ”ایکس ٹینیشنز“ ہوتی تھیں، یہ آرٹ کے ادارے تھے مگر افسوس وقت کے ساتھ ساتھ یہ ادارے یہ روایات ختم ہوتی گئیں، تمام شعبوں کے گرو، خان صاحب اور پہلوان بے اولاد مرنے لگے اور ہم ہر شبہ زندگی میں چیچھے سرکتے چلے گئے، محروم ہوتے گئے۔

آپ عمران خان کی مثال ہیں، عمران خان نے کینسر ہسپتال بنا کر کمال کر دیا تھا۔ یہ کمال عمران خان کے علاوہ بھی سینکڑوں ہزاروں لوگ کر سکتے تھے مگر جو کام عمران خان کر سکتے تھے یا کر سکتے ہیں وہ دنیا میں کوئی دوسرا شخص نہیں کر سکتا اور وہ کام ہے نئے پرسار، نئے کرکٹ پیدا کرنا، عمران خان اگر کینسر ہسپتال کے ساتھ ساتھ کرکٹ کی کوئی شاندار اکیڈمی قائم کرتے اور پورے ملک سے نوجوان جمع کر کے انہیں بال کرنے اور ہٹ لگانے کی تربیت دیتے تو کمال ہو جاتا۔ عمران خان اس ملک کو دس میں نئے عمران خان دے جاتے تو کرکٹ میں انقلاب آ جاتا تھا افسوس شے سے شجاع جعلے کا سلسہ بند ہو گیا، بانگ کا وہ کرشمہ جس نے کبھی پوری دنیا کو بہوت کر دیا تھا وہ عمران خان کے کریز سے باہر نکلتے تھی دم توڑ گیا۔ یہی غلطی ابرار الحنف کر رہے ہیں۔

ہسپتال بہت ضروری ہیں ان کے ساتھ ساتھ اس فن اور اس طرز فن کا زندہ رہنا بھی ضروری ہے۔ جس نے ابرار الحق کو ہسپتال بنانے کے لئے قابلٰ بنایا، میری ان سے بھی بھی درخواست ہے وہ ہسپتال کے ساتھ ساتھ میوزک اکیڈمی بھی بنائیں تاکہ آئندہ بھی ایسے ابرار الحق پیدا ہوتے رہیں جو اپنے اپنے نارواں میں ہسپتال بناسکیں۔

آپ تازہ ترین مثال ہیں، نوابزادہ نصر اللہ اس ملک کے آخری حینوں سیاستدان تھے، انہوں نے پوری زندگی جمہوریت کے لئے وقف کر دی وہ کون سی ایسی تحریک تھی جس میں نوابزادہ صاحب شامل نہیں رہے۔ وہ کون سا اتحاد تھا نوابزادہ صاحب نے جس کی قیادت نہیں کی۔ اس ملک میں حکومتیں تو بہت نہیں لیکن اپوزیشن! جی ہاں نوابزادہ نصر اللہ کے بغیر پاکستان میں کوئی اپوزیشن، اپوزیشن نہیں کھلا سکتی۔ پاکستان کے ہر حکمران نے نوابزادہ صاحب کے خلاف بیان دیا لیکن جب وہ اقتدار سے الگ ہوا تو وہ سیدھا نوابزادہ صاحب کے پاس گیا اور یہ نوابزادہ صاحب ہی تھے جو اسے لے کر لکھ اور اسے دوبارہ اقتدار تک پہنچا کر دم لیا، پاکستان میں سیاست کوئے کی کان ہے۔ اس کان میں جوداٹل ہو گیا اس کے ہاتھ، پاؤں اور منہ سب کچھ کالا ہو گیا لیکن نوابزادہ صاحب واحد سیاستدان تھے جنہوں نے 85 سالہ زندگی میں 70 سال اس کان میں گزارے مگر سیاست کا کوئی چھیننا ان کے دامن پر نہ گرا۔ وہ جس طرح سیاست میں آئے تھے، اسی طرح دامن جھاڑ کر دیاں پلے لگتے کھینچتے ہیں شایدی پاری، ایسی اور ووٹ کے بغیر سیاست مکن ہو لیکن ذہانت، فطانت، خطابت، جمالیاتی ذوق، حسن مزاج اور شعروخن کے بغیر سیاست مکمل ہوتی ہے اور نہ ہی سیاستدان۔ نوابزادہ صاحب وہ آخری شخص تھے جو اس معیار پر پورے اترتے تھے، شعرداں تک پہنچاتے تھے۔ بات نہیں کرتے تھے، علم کے موتی رولتے تھے، جوان کے پاس بیٹھ گیا اس کے تن بدن سے جہالت اس طرح حل گئی جس طرح دلائی صابن سے میل۔ وہ سیاست، ادب اور ذوق کے اس قافلے کر آخری فرد تھے جسے ان زمینوں سے گزرے مدیں ہو چکی ہیں، خود فرماتے تھے ”میں نے نہرو، ابوالکلام، حسرت، عطا اللہ شاہ بخاری، ایوب خان اور بھنو کے ساتھ سیاست کھیلی لیکن آج.....“ سامنے ملک حاکمین اوگھر ہے تھے ان کی طرف اشارہ کر کے بولے ”لیکن آج کل سیاستدانوں کی بجائے ان لوٹوں سے معاملہ کر رہا ہوں“

نوابزادہ صاحب کی رحلت بلاشبہ نقصان عظیم ہے لیکن اس سے بڑا نقصان ان کا ”بے اولاد“ چلے جانا ہے، اللہ نے انہیں پچاسی لوے سال عمر بخشی، وہ ستر پچھتر ہر س ”ایکنو پالینکس“ میں رہے لیکن وہ اس ملک کو اپنا کوئی وارث دے کر نہیں گئے، ان کا کوئی ایسا شاگرد نہیں جس سے ہمیں نوابزادہ صاحب کی وضع داری شعر نہیں، خطابت، درویشی اور بزرگی کی خوشبو آتی ہو۔ جو سیاست کے اس بازار میں مول نہ کہتا ہو، جو خریداں جاسکے، جھکایا، ڈرایا اور ہلایا نہ جا سکے جسے فرعون ہو یا نمرود کسی دربار میں کلہ حق سے روکا نہ جا سکے۔ انہوں اس ملک میں نوابزادہ صاحب جیسا کوئی دوسرا شخص نہیں، انہوں نوابزادہ صاحب اس ملک کو دوسرا نصر اللہ نہیں

دے سکے۔

ہمارے دیہات میں غلے کے اگر چالیس گودام بہہ جائیں تو کاشتکاروں کے ماتحت پر لکھر نہیں آتی لیکن پنجی کا ایک مرد تباہ ہو جائے تو پورے گاؤں کے آنسو نہیں تھتے۔ نوازراہ صاحب جیسے لوگ اس ملک کی پنجی تھے لیکن افسوس انہوں نے اپنی "ایکس ٹینشن" پر توجہ نہیں دی، اپنے فن، اپنے ہنر کو اکیدہ نہیں بنایا چنانچہ آج ہر رخصت ہونے والا شخص اس ملک کے اندھیرے میں اضافہ کر جاتا ہے، روم کے ایک بادشاہ کا سپہ سالار مر گیا۔ لوگوں نے روتا شروع کر دیا تو بادشاہ نے غصے سے کہا "بے وقوف فوجی مرا ہے تکوار نہیں، سامنے دیکھو" سامنے سپہ سالار کا بیٹا باپ کی تکوار اٹھائے کھڑا تھا۔ افسوس ہم رویہوں جیسے بھی نہیں ہیں لیکن ہمارا ہر سالار بے اولاد مرتا ہے، کسی ایک ہاتھ سے تکوار گرتی ہے تو کوئی دوسرا ہاتھ اسے اٹھانے کے لئے آگے نہیں بڑھتا۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

پانچ برس نہیں پانچ سو سال

جناب عالی! اسے بھی فقط پانچ سال ہی ملے تھے، اتنا قابل وقت اور اتنی بڑی سلطنت، شاید اسی لئے اس نے تاسف سے ہاتھ ملے اور اپنے رب سے شکوہ کیا۔ ”افسوس افتادار میرے ہاتھ آیا تو میری زندگی کا سورج داخل رہا تھا، افسوس عید بھی آئی تو شام کو۔“

باپ نے اس کا نام فرید خان رکھا، وقت نے اسے شیر شاہ کہا اور تاریخ نے اس کے ساتھ سوری لگا کر بہیش کیلئے امر کر دیا، وہ گھوڑے پالنے اور گھوڑے بیچنے والے کا بینا تھا، سوتیلی ماں کے لگئے زخمیوں نے اسے گھر چھوڑنے پر محروم کر دیا اور سوتیلے بھائیوں کے خوف نے چھوٹے موٹے سرداروں کی چاکری پر لیکن اللہ نے اسے جرات بخشی تھی، ہوشلا بھی، عصی بھی اور نیک بھی۔ الہا جب اس کا سامنا ظیہور الدین با بر سے ہوا تو با بر نے پیچھے مزکرا پنے سرداروں سے کہا۔ ”اس پر کڑی نظر رکھو، مجھے اس کی پیشانی پر بادشاہت کی جھلک نظر آتی ہے۔“ با بر کی پیشان گولی بیج ٹابت ہوئی اور گھوڑے پالنے والوں کا بینا 1540ء کو ہندوستان کی عظیم سلطنت کا مالک و مختار بن گیا۔

شیر شاہ سوری 1540ء سے 1545ء تک ہندوستان کا بادشاہ رہا، کہنے کو تو یہ پانچ سال تھے لیکن حقیقتاً اسے دار الحکومت میں بیٹھنے کے لئے ایک مہینہ نہیں ملا، وہ مسلسل حالت جنگ میں رہا، بھی بنگال میں جنگ کر رہا ہے، بھی مالوہ کے لئے لڑ رہا ہے، بھی قاعد رائے بینا، بھی ملتان، بھی سندھ، بھی راجپوتانہ اور بھی احمدیر کے لئے یہاں تک کہ 1545ء کو کالجہ کا قلعہ فتح کرتے کرتے خود بھی پارووں کا شکار ہو گیا لیکن اس افراتفری، اس بھاگ دوڑ کے باوجود ہندوستان کو جو نظام، جو انتظامی ضابطہ دے گیا اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں لتی۔ یہ ہندوستان کا پہلا فرماں رو تھا جس نے سلطنت کو ضلعوں اور تحصیلوں میں تقسیم کیا، اس کی سلطنت 47 ضلعوں پر مشتمل تھی، ان اضلاع کو ”سرکار“ کہا جاتا تھا یہ لفظ آج بھی حکومت کاری کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، اس نے تحصیلوں کو مختلف دیہات میں تقسیم کیا، ان دیہات میں چوکیدار، پٹواری اور نمبر دار حکومت کے نمائندے ہوتے تھے، یہ عہدے آج بھی قائم ہیں، یہ ہندوستان کا پہلا حکمران تھا جس نے زمین کو بھیگوں میں تقسیم کیا، ہر بھیگے کے لئے الگ خسرہ نمبر طے کیا۔ جس نے مایہ کا نظام دیا، جس نے

جاگیر داری نظام ختم کیا، جس نے ڈپنی گھنٹر کے عہدے کی بنیاد رکھی، جس نے مرکزی فوج کا تصور دیا، جس نے فوج کے لئے "پے سکیل" ملے کے، جس نے روپے کو سولہ آنوں، دواں ہنڑیوں، چار چوتھوں اور آٹھ دوسریوں میں تقسیم کیا، یہ ہندوستان کا پہلا بادشاہ تھا، جس نے مالیات، دفاتر اور امور خارجہ کی وزارتیں قائم کیں، جس نے سیکریٹریٹ کا تصور دیا، اٹیلی جس کا نظام مرتب کیا، محمد ڈاک بنایا، جس نے چیف جسٹس، سیشن اور سول جوں کے عہدے قائم کئے، اس کے دور میں چیف جسٹس قاضی القضاہ، دیوانی عدالت کا سربراہ میر عادل، فوجداری کیسروں کی عدالت کا انچارج قاضی، ضلع کانچ (سیشن) منصف اور تحصیل کانچ (سول) امین کہلاتا تھا، یہ شاید دنیا کا پہلا حکمران تھا، جس کا قلمبند تھا صوبے کا گورنر "سویلین" ہوتا چاہے، اس سے پہلے اور اس کے بعد ہندوستان کے زیادہ تر گورنر فوجی کمانڈر رہے، یہ پہلا حکمران تھا، جس نے معیشت کو سلطنت کی بنیاد قرار دیا، جس نے تجارت کے لئے باقاعدہ ضابطہ اخلاق طے کیا، جس نے بیردنی تاجریوں کو تحفظ اور سرمایہ کاری کا شاندار ماحول فراہم کیا اور رہی مواعصلات تو اس سلسلے میں شیر شاہ سوری کا تاریخ میں کوئی بدلتی نہیں، اس نے پانچ برسوں میں چار بڑی سڑکیں بنائیں، پہلی سڑک بندگی دیش کے سارے گاؤں سے آگری، آگرہ سے دہلی، دہلی سے لاہور اور لاہور سے پشاور تک آتی تھی، دوسری ہزار کوں لمبی یہ سڑک جرنیلی سڑک یا شاہراہ عظیم کہلاتی تھی، دوسری سڑک آگرہ سے بنارس تک میسری آگرہ سے جو دو پور اور جو توز اور چھوٹی لاہور سے میان جاتی تھی، اس نے ان سڑکوں کے کنارے درخت لگوائے، ہر دو کوں بعد سرای میں تعمیر کرائیں، کنونیں کھدوائے اور ڈاک خانے قائم کئے۔

ضلع سے لے کر جرنیلی سڑک تک اس کا ہر نظام، ہر انتظام پانچ سو سال گزرنے کے بعد بھی کسی نہ کسی شکل میں آج تک پاک و ہند میں موجود ہے، اس کا کوئی ایسا کارنامہ نہیں جس کا اثر سمندر پار کر کے دوسری تہذیبوں تک نہ پہنچا ہو، آپ جی کی روڑ پر سفر کر کے دیکھ لیں آپ کو آج بھی اس کے لگائے درخت لمبیں گے، اس کی تحریر کردہ سرائیں اور باڈلیاں دکھائی دیں گے، وہ کہا کرتا تھا، جس ملک میں انصاف نہ ہو اور جس میں تاجرخ حفاظت نہ ہو وہ ملک خوشحال نہیں ہو سکتا، وہ پہلا اور شاید ہندوستان کا آخری حکمران تھا، جس کے عہد میں ضلعی حکومتیں تاجریوں کے مال کی ذمہ دار ہوتی تھیں، اگر کہیں کوئی تاجریت جاتا تو ضلعی حکومت برخاست ہو جاتی، کسی مورخ نے اس کے بارے میں کہا تھا "مغلوں کے ایک ہزار سال اور شیر شاہ سوری کے پانچ برس ترازو کے پلڑوں میں رکھے جائیں تو اس افغان زادے کا پلڑا فوراً زمین پر آ گے گا"۔

جناب عالی یہ ہوتا ہے حکومت اور اسے کہتے ہیں حکمران، تاریخ میں پانچ سال، دس سال اور پچاس سال کوئی معافی نہیں رکھتے۔ تاریخ کو اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی زمین پر پرویز مشرف کا سکھ چلتا ہے رفیق تاریخ کا یا سردار فاروق احمد اخباری کا، لوگوں کو کچھ فرق نہیں پڑتا کوئی چیف ایگزیکٹو ہے، صدر ہے یا وزیر اعظم، تاریخ تو کام دیکھتی ہے۔ لوگ تو اہل احسان کو پوچھتے ہیں، آپ پانچ سال حکمران رہیں، دس سال یا بیس سال، آپ کے لئے بیس سال نظرے لگیں گے، لوگ دس سال آپ کو سیلوٹ کریں گے یا آپ کے لئے پانچ سال بگل بھیں کے

کیا فرق پڑتا ہے تاریخ تو کام دیکھتی ہے۔ خدمات کا تجھیں لگاتی ہے لیکن اس کے بعد کیا ہوگا اقتدار تحلیل ہو جائے گا، سارا کروفر، سارا مطہر اس ستر کر کوئز کی کتابوں میں جا چھپے گا۔ لوگ آپ کو بھی اسی طرح بھول جائیں گے جس طرح انہوں نے ایوب خان، سکندر میرزا اور چودھری فضل اللہ کو فرماؤش کر دیا تھا لیکن شیر شاہ سوری آج پانچ سو سال بعد بھی زندہ ہے، وہ آج بھی ہندوستان کا حکمران ہے، لوگوں کے دلوں میں آج بھی اس کا سکر چلتا ہے اور جب تک جرنیل سڑک کا ایک فٹ بھی قائم ہے، زمین کو بھیگوں میں مایا جاتا ہے، لوگ چونیوں اور انھیوں کا ذکر کرتے ہیں اور عدایتیں باقی ہیں، شیر شاہ سوری کا اقتدار قائم رہے گا، شیر شاہ سوری زندہ رہے گا۔

جناب صدر! پانچ برس نہیں، پانچ سو سال کے لئے حکومت کی دعا کریں۔

(نوٹ یہ کالم جزل پرویز مشرف کے اس بیان سے متاثر ہو کر لکھا گیا جس میں انہوں نے فرمایا
ملکی مسائل کے حل کے لئے 5 سال کم ہیں)



تاجیات صدر

1925ء کو کاکو اقبیلے کے ایک غرب مسلم گھرانے میں پیدا ہوا، ماں باپ نے اس کا نام عیدی رکھا لیں دنیا اسے عیدی امین کے نام سے جانتی ہے۔ وہ بچپن میں جسمانی طور پر م-striped لیکن ذہنی لحاظ سے غبی تھا، یادداشت کمزور تھی، پڑھائی میں دل نہیں لگتا تھا اور کتابوں سے اسے چھوٹھی۔ آنے والی زندگی میں اس نے کشش اور بائسگ کو مشغله اور فوجی نوکری کو اپنا مقصد بنایا۔ 1946ء وہ سال تھا جب عیدی پر ایجنسیت ملازم کی حیثیت سے برٹش آرمی میں داخل ہوا، اس میں سینٹر آفیسر کے احکامات تسلیم کرنے کی خداداد صلاحیت تھی لہذا وہ 1950ء تک لیفٹینٹ کے عہدے پر ترقی کر گیا یوس عیدی یونگنڈا کا دوسرا مقامی شخص کہلا یا جسے برطانوی فوج کا اعتماد حاصل ہوا۔ 1951ء کو اسے ہیوی ویٹ باکس کا اعزاز حاصل۔ اس نے 1960ء تک یہ اعزاز برقرار رکھا۔ 1962ء میں یونگنڈا آزاد ہوا، لانگو اقبیلے کا ملٹن اوبوئے و وزیرِ عظم ہنا اور سر ایڈورڈ فریڈک پہلے گورنر جنرل اور پھر صدر، ملٹن اوبوئے ایڈورڈ فریڈک کو اقتدار سے بے دخل کرنا چاہتا تھا جس کے لئے اسے فوج کی حمایت درکار تھی۔ اس وقت تک عیدی امین ایک جو نیز آرمی افسر تھا۔ ملٹن کو عیدی میں ایک وفادار ساتھی کی جھلک نظر آئی۔ لہذا اس نے سینٹر افروں کو پائی بس کر کے اسے ترقی دینا شروع کر دی۔ 1966ء میں ملٹن ایڈورڈ فریڈک کو ہٹانے میں کامیاب ہو گیا۔ ملٹن کی اس پیش قدمی میں عیدی نے اس کا ساتھ دیا۔ ملٹن نے عنان صدارت سنبھالتے ہی اسے کمائٹ رانچیف بنادیا۔ آرمی چیف بننے کے بعد عیدی نے محسوس کیا یونگنڈا میں اقتدار تو فوج کا مرہون منت ہے۔ لہذا وہ خود سربراہ کیوں نہ بنے، اس نے ملٹن کے خلاف سازش کا جال بننا شروع کر دیا۔ 1971ء میں ملٹن سنگا پور گیا تو عیدی نے اقتدار پر قبضہ کر لیا، 20 فروری 1971ء کو قضائی اور آرمی کے تمام افروں نے عیدی امین کو یونگنڈا کا باوردی صدر تسلیم کر لیا یہاں سے عیدی امین کی اصل کہانی شروع ہوتی ہے۔ عیدی امین ایک دلچسپ کردار تھا۔ دنیا نے اسے افریقہ کا قصائی، گک ڈیڈی، اور "اے کے اے" کے خطاب دیئے۔ اسے خود بھی اپنے آپ کو خطاب دینے کا بہت شوق تھا، اس نے باقاعدہ تقریب منعقد کی اور خود کو "فائل سلطنت برطانیہ اور شہنشاہ سکات لینڈ" کا خطاب دے دیا، اس نے 1965ء میں خود کو فائلڈ مارشل اور 1976ء میں یونگنڈا کے تاجیات صدر کے عہدے پر ترقی دے دی، وہ ہر وقت فوجی وردی پہنچنے پھرتا تھا، اس نے ایک روز پوری یوئیفارم اور تمام فوجی اعزازات کے ساتھ سوئنگ پول میں چھلانگ لگادی اور اسی

حالت میں دیر تک تیرا کی کرتا رہا، 1971ء کے "انقلاب" کے دو ان اس نے سابق حکومت کے تمام بڑے عہدیداروں کے سرا تردا کرفیز ریس رکھا دیئے تھے، جب بھی کوئی مہمان آتا وہ یہ سڑا اینٹک نیبل پر سجادیتا، وہ شدید موٹاپے کا شکار تھا۔ اسے گیس کی شکایت تھی، کابینہ کے اجلاس کے دوران جب اسے "باد شکم" بھی کرتی اور وہ اس عذاب سے خلاصی کے لئے کھڑا ہوتا تو کابینہ کے ارکان بھی اس کے ساتھ کھڑے ہو جاتے اور پھر انہیں عیدی کی فراقت تک بیٹھنا نصیب نہ ہوتا، اسے ہین الاقوامی لیڈر بننے کا شوق تھا چنانچہ وہ اندر پیش میڈیا میں رہنے کیلئے بڑی ولچپ رکتیں کرتا۔ اس نے 1972ء میں 60 ایشیائی باشندوں کو یونگنڈا سے نکال کر بڑا نام کیا، اس نے فلسطینی مجاہدین کو پناہ دی، تمام برطانوی اور امریکی کمپنیاں سرکاری تحویل میں لے لیں اور آخر میں اس نے تزاہی پر حملہ کر دیا مگر مشہور ہونے کی یہ کوشش اسے مہنگی پڑی، تزاہی نے عیدی کی فوج کا ذلت کر مقابلہ کیا، یونگنڈا کی فوج پسپا ہوئی اور اس کے پیچھے تزاہی کی فوج یونگنڈا میں داخل ہو گئی۔ یونگنڈا نیشنل بریشن آرمی نے تزاہی کا ساتھ دیا، یوں کپالا پر قبضہ ہو گیا۔ 1979ء میں عیدی امین یونگنڈا سے فرار ہوا، کرنل قذافی نے اسے لیبیا میں پناہ دی، وہ دس تک طرابلس میں پناہ گزیں رہا جب وہاں اس کے لئے حالات سازگار نہ رہے تو اس نے سعودی حکومت سے درخواست کی، سعودی عرب نے اسے سیاسی پناہ دے دی، عیدی امین تا حال جدہ میں شاہی مہمان ہے، سعودی حکومت اسے 1400 ڈالر ماہانہ خرچ دیتی ہے، ایک ماہ پہلے تک دو بیٹے میں ایک دن فیلڈ مارشل کی وردی پہن کر جدہ شہر میں رہتا تھا، لوگ اس جیسم شخص کو حیرت سے دیکھتے تھے اور پھر ایک دوسرے سے پوچھتے تھے "یہ کون ہے؟" مگر افسوس ہتھے والوں میں 19 نیصد لوگ اس کے نام، اس کے عہدے اور اس کے مرتبے سے ناواقف ہوتے تھے، وہ یونگنڈا کا تاجیات صدر اور فیلڈ مارشل تھا لیکن اپنی سلطنت سے سینکڑوں ہزاروں میل دور جدہ میں بے نام بے شناخت زندگی گزار رہا تھا۔

عیدی امین جولائی کے شروع میں شدید علیل ہو گیا اسے ہپتال پہنچایا گیا تو وہ قوے میں چلا گیا۔ ڈاکٹروں نے مایوسی سے سر ہلا دیا۔ وہ آخری وقت اپنے وطن میں گزارنا چاہتا تھا۔ اس کی شدید خواہش تھی اسے کپالا کے کسی خاموش قبرستان میں دفن کیا جائے۔ اس کے خاندان نے "تاجیات صدر" کی یہ آرزو یونگنڈا حکومت تک پہنچا دی لیکن حکومت نے عیدی امین کو زندہ حالت میں قبول کرنے سے انکار کر دیا، ہاں البتہ سعودی حکومت کی سفارش پر اتنی اجازت ضروری دے دی "اگر عیدی امین کی لغش لا لی جائے تو اسے سرکاری اعزازات کے بغیر عام شہری کی حیثیت سے دفن کیا جا سکتا ہے۔" جولائی کے وسط میں چند لمحوں کے لئے اس کا قومانوٹا تو اس نے ڈاکٹر کے کانوں میں سرگوشی کی "پلیز کھڑکی کھول دیں، افریقہ کی ہوا ہمیں بہت خوبصوردار ہوتی ہیں، شاید کوئی بھولا بھٹکا جھوٹا کا ادھر آ نکلے" ڈاکٹر نے کھڑکی کھول دی، ہوا اندر آئی لیکن یہ جدہ کے وہ گرم پھیڑے تھے جن میں سمندر کے نمکین پانیوں اور پڑوں کی کسلی بدبو کے سوا کچھ نہیں تھا، ڈاکٹر واپس مڑا لیکن اس کا باور دی میریض دنیا سے رخصت ہو چکا تھا وہاں عیدی امین کا خاکی وجود تو پڑا تھا لیکن خود عیدی امین جا پکا تھا۔

جناب صدر

جناب صدر ایک لمحے کے لئے جی ہاں آپ صرف ایک لمحے کے لئے اپنے آفس کا دروازہ بند کر دیں، ٹیلی فون کے سونچ آف کر دیں، تمام ملاقاتیوں کو ملاقاتی کرے میں بھجوادیں، نیبل یا پ بجھاویں، ٹینک اتار کر میز پر رکھو دیں، کرسی صدارت سے نیک لگائیں اور ایک لمحے کے لئے جی ہاں ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کر کے سوچیں، آپ پر اللہ تعالیٰ کی کتنی رحمتیں، کتنے کرم اور کتنی عنایتیں ہیں۔ اس کے رحم اور اس کے کرم کی کتنی بارشیں ہیں جو آپ کی چھت پر برس رہی ہیں، ذرا سوچنے کتنے لوگ تھے جو لوگ پڑ کر پاکستان پہنچ کے، آپ کا خاندان ان خوش نصیبوں میں سے ایک تھا، کتنے لوگ ہیں جنہیں پاک آرمی میں کمیشن ملا، آپ ان خوش نصیبوں میں سے ایک تھے کتنے لوگ ہیں جنہیں مجرم کے بعد ترقی کا موقع ملا، آپ ان خوش نصیبوں میں سے ایک تھے کتنے لوگ ہیں جنہیں جزل بننے کا موقع ملا، آپ ان خوش نصیبوں میں سے ایک تھے آرمی چیف ہیں جنہیں ملک پر حکومت کا موقع ملا، آپ ان خوش نصیبوں میں سے ایک تھے اور کتنے چیف ایگزیکٹو ہیں جنہیں اقتدار کے دوران صدر کہلانے کا موقع ملا آپ ان خوش نصیبوں میں سے ایک ہیں۔

جناب صدر آپ پر اللہ کی اور بھی کئی عنایتیں، کئی کرم اور کئی رحمتیں ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ نے آپ کو بیکاریوں سے بچائے رکھا، حادثوں سے محفوظ رکھا، حاسدوں کے حسد اور دشمنوں کے کینے سے بچا کر رکھا، آپ کو ہبھوئی مینڈیت سے بچایا، جو لوگ آپ کیلئے گزرا کھووتے رہے اللہ تعالیٰ نے انہیں اس گزرا ہے میں اتار دیا۔ آپ کو معطل کرنے والے خود معطل ہو گئے۔ آپ کو ”جالاوطن“ رکھنے والے خود جلاوطن ہو گئے اور آپ کو گھر بھجوانے والے خود گھر چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے پایاں اختیارات دیے، ہر وہ طاقت، ہر وہ قوت جو آپ کے راستے میں مزاحم ہوئی، شتم ہو گئی۔ آپ نے وقت مانگا پسرویم کو رث نے آپ کو تین سال دے دیے، آپ نے آنکھیں میں تبدیلی کی اجازت مانگی عدیہ نے دے دی، آپ نے نیب بنا لیا، ہن گیا، آپ نے چوروں ڈاکوؤں اور لیسوں کو گرفتار کرنا چاہا گرفتار ہو گئے اور آپ نے تعمیر نو کا کام شروع کیا ڈیلوٹ ہو گیا۔ آپ نے جو چاہا وہ ہوا، جو سوچا وہ تجھیں کو پہنچا اور آخر میں آپ اللہ تعالیٰ کا کرم ملاحظہ کیجئے، اس رب کا نات نے آپ کو پاکستان کا سب سے بڑا عہدہ یعنی صدارت بھی عطا کر دی۔۔۔۔۔ اس ملک میں کوئی اختیار، کوئی

قوت اور کوئی طاقت ایسی نہیں بھی جس پر اللہ نے آپ کو دسترس نہ دی ہو، اللہ نے آپ کو ہر اس انعام سے نوازا جس کی کروڑوں اربوں لوگ صرف خواہش کر سکتے ہیں۔ آپ سے پہلے لوگ شریف خاندان کو اس ملک کا خوش نصیب ترین خاندان کہتے تھے لیکن اب اس ملک میں آپ اور آپ کے خاندان سے زیادہ خوش بخت کوئی نہیں، وہ طاقت، وہ اختیار جو نواز شریف دو تھائی اکثریت اور ہمیں میںدیث کے بعد بھی حاصل نہ کر سکا اللہ نے آپ کو ایک دوست لئے بغیر عطا کر دیا۔ اب آپ کی کوئی ایسی خواہش نہیں بھی ہوگی جو پوری نہ ہوئی ہو، آپ اور آپ کے والدین کی کوئی دعا ایسی نہیں ہوگی جسے خدا کی بارگاہ سے قبولیت نہ ملی ہو۔ لہذا جناب صدر اب آپ کی باری ہے، اب آپ نے قدرت کو حساب دینا ہے۔

جناب صدر سبکی وہ لمحہ، یہی وہ مقام ہے جس کے بعد ایک طویل نشیب ہے۔ اس سے اوپر کوئی عہدہ نہیں اور اس کے بعد کوئی اختیار، کوئی طاقت اور کوئی قوت نہیں سوائے خدا کے چنانچہ جناب صدر اب یہ قوم آپ سے دست بستہ عرض کرتی ہے، خدا کے لئے اس قوم کو اس کا حق دے دیں۔ اس پر رحم گریں، اس پر مہربانی فرمائیں۔ جناب صدر لوگ رو رہے ہیں۔ جناب صدر لوگ اپنے پچھے چھ رہے ہیں، جناب صدر لوگ اس ملک سے ہجرت کر رہے ہیں۔ جناب صدر لوگ ظلم کا شکار ہیں، جناب صدر لوگ جہالت کی پچھی میں پس رہے ہیں، جناب صدر لوگ طبقاتی تقسیم کی آگ میں جل رہے ہیں۔ جناب صدر لوگوں کو انصاف نہیں مل رہا، روزگار نہیں مل رہا، پایا جوں مل رہا، اونچی نیپل مل رہی، پیز اونچیں مل رہا، پیٹ نہیں مل رہی، جناب صدر رہم جانتے ہیں یہ سب چیزیں مشکل ہیں، یہ مسئلے ایک رات میں حل نہیں ہو سکتے، نشیب میں گرتی چنان کو روکنا آسان نہیں ہوتا لیکن جناب صدر آپ ایک کام تو کر سکتے ہیں، آپ ایوان صدر کی چومنی سے اتر کر اپنے گواام، اپنی رعایا کے درمیان تو رہ سکتے ہیں، آپ سادگی تو اختیار کر سکتے ہیں، انصاف تو قائم کر سکتے ہیں، مساوات تو رکھ سکتے ہیں، آپ ان مشکل حالات میں دونہیں تو قوم کے ساتھ اپنے پیٹ پر ایک پتھرو تو باندھ سکتے۔ جناب صدر یہ تو کوئی مشکل کام نہیں!

جناب صدر اگر کوئی شخص کرنا چاہے تو اونٹ چرانے والے کا بینا عمر فاروق کہلا سکتا ہے، کسان کے بیٹے کو تاریخ ماڈوزے نگک کے نام سے یاد کر سکتی ہے، موچی کا بینا سنان بن سکتا ہے اور عمومی کاشت کار کا بینا جارج واشنگٹن بن کر طلوع ہو سکتا ہے آپ پر اللہ تعالیٰ کا کرم ہی بہت ہے، اس کی عنایات اور رحمتوں کا کوئی حساب ہی نہیں، آپ اگر کرنا چاہیں تو اس ملک میں کیا نہیں ہو سکتا جناب صدر دنیا میں صدر زندہ نہیں رہتے محض زندہ رہتے ہیں، دنیا میں شبل کمر ایجاد کرنے والے کی ستراوشاہوں سے زیادہ عزت ہے جناب صدر اس ملک میں بہت صدر گزرے ہیں سید خان بھی صدر تھے لوگوں کو ان کی قبر نگک یاد نہیں فضل الہی بھی صدر تھے آج ان کی قبر پر پھول چڑھانے والا کوئی نہیں، غلام اسحاق خان بھی صدر تھے آج لوگ یہ نہیں جانتے وہ کہاں رہتے ہیں، فاروق لغاری بھی صدر تھے آج لوگ انہیں فراموش کر چکے ہیں اور رفیق تاریخ بھی تھے ایک بخت بعد لوگوں

سے پوچھ لجئے گا لوگ ان کی شکل تک بھول جائیں گے۔
 جتاب صدر ایک لمحے کے لئے جی ہاں آپ صرف ایک لمحے کے لئے اپنے آفس کا دروازہ بند کر کے سوچئے جتاب صدر نعمتیں، عنایتیں، کرم اور رحمتیں قرض ہوتی ہیں جو لوگ اللہ کا یہ قرض نہیں اتنا رتے خدا ان سے ناراض ہو جاتا ہے اور جن سے خدا ناراض ہو جاتا ہے۔ زمین ان کے لئے سمٹ جاتی ہے اور آسمان ان کے لئے نیک ہو جاتا ہے۔

(نوٹ یہ کالم جزل پر وزیر مشرف کے صدر بننے پر تحریر کیا گیا)



وائیٹ پیپر

کلنگ کے مقام پر آخری لڑائی ہوئی، شام کے وہ شماں ہندوستان کا بلا شرکت غیرے مالک تھا، وہ گھوڑے سے اترا، سامنے میدان میں ہزاروں فیش بکھری تھیں، اس نے زندگی میں اتنی فیشیں نہیں دیکھی تھیں، اس نے اپنے مشیر سے پوچھا "کتنے لوگ مارے گئے؟" مشیر نے سینہ پھلا کر جواب دیا "ایک لاکھ" وہ بیچے بیٹھ گیا۔ اس کے سینے سے ہوک آئی اور ہندوستان کا سب سے بڑا فتح پھوٹ کر روپڑا۔ اس کی مال دستاع سیمیتی فوج نہیں کر رک گئی، وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا "اشوک تم نے لاکھ لوگ مار دیئے، ان کا کیا قصور تھا" وہ بلک کروتا رہا، آنسو تھے تو وہ ایک نیا انسان تھا، اس نے نیام سے تواریکالی، دریا میں پھینکی اور ہندوستان ترک کر دیا۔

Kashif Azad @ OneUrdu.com

اشوک کے باپ نے سول شادیاں کیں، اس کے سو بیٹے تھے، اشوک پیدائش بادشاہ تھا، وہ دنیا کا سب سے بڑا فتح بننا چاہتا تھا، اس نے فتوحات کا آغاز اپنے بھائیوں سے کیا، اس نے ایک ایک کر کے اپنے تمام بھائی مردا دیئے، آخر میں وہ بادشاہ بن گیا۔ اقتدار کی ہوں زیادہ تھی اور سلطنت چھوٹی، لہذا فتح عالم بننے کے لئے گھر سے نکل کھڑا ہوا، راستے میں جو آیا کچل دیا، جس نے سراخیا روندہ لالا، ہزاروں لاکھوں لوگ اس کی خواہش کا ایندھن بن گئے لیکن کلنگ کی فتح نے اس کی کایا پلت دی، اس نے سراخیا۔ سامنے اس کی فوج کھڑی تھی، اشوک کے پاس اس وقت دنیا کی سب سے بڑی اور انتہائی چدید فوج تھی، اس کے پاس سات لاکھ پیادے، تیر انداز اور گھر سوار تھے۔ اس نے یہ سو رے پورے ہندوستان سے چن چن کر اکٹھے کئے تھے۔ اس نے کلنگ کے میدان میں فوج کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ سات لاکھ فوجی بے روزگار ہو گئے۔

وہ واپس پہنچا، ہندوستان ترک کیا۔ بودھ ہوا اور حکومت کاری کے چند اصول وضع کئے۔ یہ اصول اس کی سلطنت کے ایک ایک شہر، ایک ایک گاؤں میں کنڈہ کر دیئے گئے۔ اس نے پورے ملک سے چن چن کر ایماندار، مہربان اور حقیقی لوگ اکٹھے کئے اور انہیں "مہامیر" کا خطاب دے کر مختلف علاقوں کا والی بنا دیا۔ ان لوگوں نے سب سے پہلے برہمن اور شور کا تصور توڑا، امیر اور غریب کی تفریق ختم کی اور پھر خدمت میں جت گئے، اشوک کی حکومت کاری کے دو ہڑے اصول تھے، خدمت اور انصاف، اس نے پوری سلطنت میں سڑکیں

بنا میں، سڑکوں کے کنارے درخت لگوائے، کنوں میں کھدوائے، مسافر خانے تعمیر کرائے، درس گاہیں اور منڈیاں بناؤں۔ وہ دنیا کا پہلا بادشاہ تھا جس نے جانوروں کے ہسپتال کا تصور دیا، جس نے عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دیئے، جو یہ کہتا تھا بچوں کی پرورش حکومت کا فرض ہے، جو یہ سمجھتا تھا جو حکمران عوام کو روشنی، تعلیم اور دوائی دے سکے اسے حکومت کا کوئی حق نہیں۔ رہا انصاف تو اس کی سلطنت کے آخری گاؤں میں بھی کسی کے ساتھ کوئی ظلم ہوتا تو سب کو معلوم ہوتا دنیا کی کوئی طاقت ظالم کو اشوک سے نہیں بچا سکتی، کنکن کی فتح تک وہ صرف ثالی ہندوستان کا بادشاہ تھا لیکن جوں جوں اس کی خدمت اور انصاف کی شہرت پھیلی اور گرد کی ریاستیں بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئیں یہاں تک کہ وہ اشوک سے اشوکا عظیم بن گیا، اس کی سلطنت اوڑیسہ سے ٹکلت اور بیگانے سے دکن تک پھیل گئی، وہ گودار سے کابل تک بادشاہ بن گیا پورے ہندوستان پر حکومت کا اعزاز صرف تین بادشاہوں کو حاصل ہے، اشوک عظیم، اور نگزیب اور آخر میں تاج برطانیہ، ان تینوں میں اشوک پہلا شخص تھا۔

فوج کے بغیر حکومت کا تصور اس کا خدمت اور انصاف سے ہوا کارنامہ تھا، اس کے پاس سات لاکھ فوج، دس ہزار جنگی رتھا اور نو ہزار فریضہ تھی تھے، اشوک کے اشوک کم سے یہ ساری طاقت بے روزگار ہو گئی، اس کے مشیروں نے سمجھا یہاں پناہ جاننے کے، میں اور یہاں کے طالع آزماس سرحدوں پر کھڑے ہیں۔ ہماری پاس فوج نہ ہوئی تو وہ حملہ کر دیں گے، اشوک مسکرا یا اور سر پر ہاتھ پھیر کر بولا "میں سات لاکھ کے بجائے سات گروڑ کی فوج تیار کروں گا۔" مشیروں نے حیرت سے دیکھا، اشوک نے کلام جاری رکھا۔ "فوجوں کی ضرورت ان بادشاہوں کو ہوتی ہے جن کے عوام ان سے خوش نہیں ہوتے، میں اپنے شہریوں کو اتنا سکھو، اتنا جان، اتنا آرام اور اتنا انصاف دوں گا کہ اس ملک کا بچہ بچہ اپنی سرحدوں کی حفاظت کرے گا۔ اشوک نے اپنا یہ دعویٰ بھی کر دکھایا، اس کے دور میں کوئی بیرونی حملہ آور ہندوستان میں داخل ہوا اور نہ ہی کسی اندر ہونی شورش نے سراخایا یوں وہ پہلا بادشاہ تھا جس نے فوج کے بغیر ہندوستان یعنی ملک پر حکومت کی، اشوک کی موت کے بعد 47 برس تک اس کا نظام قائم رہا مخلائق سازشیں شروع ہوئیں، اس کا پوتا برہندر ناتھ قتل ہوا، گپتا خاندان بر سر اقتدار آیا، فوج بنی اور اس کے بعد ہندوستان ایک بار پھر قتل و غارت گری میں جلا ہو گیا۔

اشوک کہتا تھا خدمت اور انصاف ہو تو فوج کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی روپے پیسے کی، میرا خیال ہے اشوک کا یہ فلسفہ ادھورا تھا، وہ گریجوائیٹ نہیں تھا شاید اس نے بھول گی جو حکمران عوام، ملک اور قوم کے لئے جیتے اور سرتے ہیں انہیں اپنی تین سالہ کارکردگی بتانا نہیں پڑتی، اصلی اور سچے منصف کو یہ نہیں کہنا پڑتا "میں انصاف کرتا ہوں" وعدے کے کچے لوگوں کو یہ باور نہیں کرتا پڑتا "میں وعدے کا پکا ہوں" اور بخوبی کاشت کرنے والوں کو یہ اعلان نہیں کرنا پڑتا میں کرشمہ ساز ہوں، آپ شاہراہ ریشم پر سفر کریں آپ کو راستے میں آج بھی اشوک کے کتبے نظر آئیں گے، ہزاروں سال بعد آج بھی ہندوستان میں اشوک کے

کھداۓ کنوئیں اور سرکیں موجود ہیں، یہ سرکیں، یہ کنوئیں اور یہ کتبے جیخ جیخ کر کہد رہے ہیں حکران پچ ہوں، مخلص ہوں اور انہوں نے اہل زمین پر احسان کئے ہوں تو انہیں واہیت پہنچ شائع نہیں کرانا پڑتا۔ لوگوں کے حافظے کمزور ہوتے ہیں یہ درست ہے لیکن جن پر احسان کئے گئے ہوں ان کی شلیں تک اپنے محضوں کو یاد رکھتی ہیں۔ اہل سندھ آج بھی محمد بن قاسم کی یاد مناتے ہیں اور یہ اس ملک کی چوتھی نسل ہے جو قائد اعظم محمد علی جناح کی تصویر کی طرف پشت نہیں کرتی! محضوں کو کوئی نہیں بھولتا جناب صدر! صرف بادشاہ ہوتے ہیں جو عافلوں سے مخوب ہو جاتے ہیں۔ صرف حکران ہوتے ہیں جو فراموش کر دیئے جاتے ہیں۔

(نوٹ: جزل پروین مشرف کی حکومت نے اپنی تین سالہ کارکردگی پروایت پہنچ شائع کیا، یہ کالم

اس واہیت پہنچ پر لکھا گیا)



دس بائی تیرہ فٹ

شاہی محل کے تین گراؤنڈ میں لوہے کی ایک کوٹھری ہے جس کی لمبائی دس اور چوڑائی تیرہ فٹ ہے عراق کے سابق صدر آج کل اس گراؤنڈ، اس کوٹھری میں قید ہیں، اس گراؤنڈ سے چند قدم آگے بڑھیں تو اس محل کی حدیں شروع ہوتی ہیں جو کبھی صدر کا شاہی مسکن تھا، اس محل میں سو بیٹھ روم تھے، اس کے ڈرائیک رومن، کھانے کے کمروں، لابی اور دربار ہال کی دیواروں پر سونے اور چاندی کا کام تھا، اس کے سارے ہینڈ لیٹر، سارے یمپ، سارے گلوب الٹی سے بن کر آئے تھے، پردے خالص چینی سک کے تھے اور انہیں فرانسیسی درزیوں نے سیا تھا، صدر کا بیٹھ روم زمین پر جنت تھا، دیزرت قالین، دور دور تک روشنیوں اور انہیں ہیروں کے سمنے پہنچتے تھے، پر دوں کافی فرم بلتے اور پہنچنے کے مطابق ہلک کا درجہ حرارت، صدر پہلو بدلتے تھے تو کمرے کا درجہ حرارت بھی بدلتا تھا لیکن آج اس بیٹھ روم میں امریکی فوج کا آیک میجر بولوں سمیت سوتا ہے، رہے دوسرے بیٹھ روم تو ان شاہی آرام گاہوں پر کیلیغور نیا کے فوجی جوانوں کا قبضہ ہے جبکہ اس محل کا معمدار، اس محل کا ماگ گراؤنڈ کے دس فٹ لمبے اور تیرہ فٹ چوڑے میل میں زندگی کے باقی دن گزار رہا ہے، صدام حسین جی ہاں اس ملک، اس معمدار کا نام صدام حسین ہے، یہ صدام حسین آج پلاسٹک کے سینڈل پہنتا ہے، اس کے تن پر عربوں کا روایتی چغہ ہوتا ہے اور یہ امریکی فوجیوں کے لئے پکایا جانے والا کھانا کھاتا ہے، اسے روز تین گھنٹے کے لئے کوٹھری سے باہر نکالا جاتا ہے، ان تین گھنٹوں میں وہ ورزش کرتا ہے، چہل قدمی کرتا ہے اور کوٹھری کے گرد گئے پوتوں کی گوڑی کرتا ہے، کوٹھری کے اندر اس کے پاس ایک فولڈنگ بیڈ ایک چھوٹا ڈایک، پلاسٹک کی ایک کرسی، پانی کی ایک بوٹل، برف کا ایک تھرماس، ایک جائے نماز اور کتابوں کا ایک ریک ہے، اس کا زیادہ وقت قرآن مجید کی تلاوت اور عربی کتب کے مطالعے میں گزرتا ہے، اس کے غدوں بڑھ چکے ہیں، ڈاکٹروں کا کہنا ہے صدام حسین کے جسم پر کینسر کی ابتدائی علامات ظاہر ہو رہی ہیں، اس کی ایک آنکھ میں بھی مسلسل درد رہتا ہے، دوستے قبل اسے بلیک ہاک کا پڑ کے ذریعے ہبتال لے جایا گیا، ڈاکٹر نے بلی معاٹے کے لئے اس کا خون لیا تو اس نے دلکی لجھے میں سرگوشی کی "میں آج سوچتا ہوں کاش میں سیاستدان کی بجائے محض ایک ڈاکٹر ہوتا۔"

یہ صدام حسین جب شام کو اپنی کوئھری سے باہر آتا ہے، اپنے گھنٹوں پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ سیر حیاں اترتا ہے، چندیاں آنکھوں سے آگے چھپے دیکھتا ہے، میں فت کے چین میں چہل قدمی کرتا ہے، پودوں کی گوڑی کرتا ہے، کیا روپوں میں پانی دیتا ہے اور دور محل کے ستونوں اور سفید مرمر میں چھتوں کو دیکھ کر منہ ہی منہ میں کچھ بڑا بڑا تھا تو کوئی سورج سکتا ہے یہ وہی صدام حسین ہے جو آج سے 26 برس پہلے فوجی وردی پاکن کر اقتدار میں داخل ہوا تھا اور اس کے بعد جس نے 24 برس تک وردی اتنا ری اور نہ ہی اقتدار، جو مسلسل 24 برس تک تیل کے دوسرا بڑے ذخیرے کا مالک رہا، جس کے اکاؤنٹس میں آج بھی اربوں ڈالر ہیں جس کا ایک ایک لفظ قانون کی حیثیت رکھتا تھا، جس نے 1994ء میں صدارت کے ساتھ ساتھ وزارت عظمی کا عہدہ بھی سنیال لیا تھا اور جس کے بعد وہ دنیا کا واحد حکمران، بن گیا جو یہک وقت آرمی چیف بھی تھا، صدر بھی اور وزیر اعظم بھی، جس نے 15 اکتوبر 1995ء کو ریفرنڈم کرایا اور 91 فیصد عوام نے جسے اگلے سات برس کے لئے صدر منتخب کر لیا، جس کے پاس ملک کے چھ بڑے عہدے تھے، جو ملک کا سربراہ (صدر) بھی تھا، انقلابی کنسل (آری سی) کا چیئر مین بھی تھا، حکومت کا سربراہ (وزیر اعظم) بھی تھا، عراقی مسلح افواج کا کمانڈر بھی تھا، عراق کا وزیر دفاع بھی تھا اور عراق کی واحد سیاسی جماعت بعث پارٹی کا سیکرٹری جزل بھی تھا۔ جس نے اپنے آپ کو فیلڈ مارشل بھی قرار دے دیا تھا اور جس نے ملک میں دو قسم کی فوجیں تیار کی تھیں، ایک عراقی کی قومی فوج اور دوسری صدام حسین کی ذاتی فوج لیکن آج وہی صدام حسین اپنے ہی محل کے گراونڈ میں دس فٹ لمبی اور تیرہ فٹ چوڑی کوئھری میں پڑا ہے اور پلاسٹک کے سینڈلوں کا ایک جوڑا، ایک عربی چڑ، ایک فولڈنگ بیڈ، ایک ڈیک، ایک کرسی، ایک جائے نماز اور کتابوں کا ایک ریک اس کی کل کائنات ہے اور وہ امریکی ڈاکٹر کے کان میں سرگوشی کرتا ہے۔ ”کاش میں سیاستدان کی بجائے محض ایک ڈاکٹر ہوتا۔“

صدام حسین صحیح تھا یا غلط اس کا فیصلہ تاریخ کرے گی۔ صدام حسین نے امریکہ سے مکرا کر صحیح کیا یا غلط، ہم اس کا فیصلہ بھی آنے والے کل پر چھوڑتے ہیں۔ ہم تو بس آج کا فیصلہ کرتے ہیں، ہم تو بس یہ طے کرتے ہیں جو اقتدار 24 برس کی رفاقت کے بعد بھی صدام حسین کا نہ ہو سکا وہ کسی اور کا کیا ہو گا؟ وہ اقتدار تمام عمر کس کے ساتھ چلے گا، جس اقتدار کو صدام حسین کا ریفرنڈم، اس کا فیلڈ مارشل کا عہدہ، اس کی سیکرٹری جزل شپ، اس کی وزارت دفاع، اس کی کمانڈر شپ، اس کی وزارت عظمی، اس کی آری سی کی چیئر مین شپ، اس کی وردی اور اس کی صدارت نہ پچا سکی۔ وہ اقتدار تمام عمر کس کی میخی میں رہے گا، صدام حسین کی یہ کوئھری، دس بائی تیرہ فٹ کا یہ سیل دنیا کے ان تمام حکمرانوں کے نام اللہ کا پیغام ہے جو اپنے اقتدار کو لو ہے کی بیان اس پلانا چاہتے ہیں، جو آخری سانس تک حکومت کرنا چاہتے ہیں، جو وردیوں، عہدوں اور فوجوں کو اپنی بنا سمجھتے ہیں، جن کا خیال ہے وہ اور ان کا اقتدار قائم ہے تو دنیا میں اُن ہے، دنیا میں سورج کی دنستک اور چاند

کی آہٹیں ہیں۔ وہ ہیں تو کہ ارض پر ہوا میں چلتی ہیں اور وہ ہیں تو نجع کے علم سے رزق جنم لیتا ہے، یہ صدام حسین پیغام ہے اس دنیا کے ان تمام حکمرانوں کے نام کہ یہ زمین، اس زمین کے تمام باری اور ان باسیوں کے گرد کچھ نقصے، حدیں اور سرحدیں صرف اور صرف اللہ کی امانت ہیں اور جس نے اللہ کی امانت کو اپنی ملکیت ہنانے کی کوشش کی اس کا انجام بھی دس بائی تیرہ فٹ کی کوئھری ہو گا۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

پتوں پر جمی ریت

"میرے محل میں 160 افراد ملازم تھے، یہ میرا ذاتی شاف تھا، یہ لوگ ہر وقت میرے اشارے کے منتظر رہتے تھے لیکن اب" کہنے سال خاتون نے مختندی سانس بھری، ٹشو پہپہ سے آنکھیں پوچھیں اور گلوگیر آواز میں بولی "اب میرے پاس صرف دو ملازم ہیں ایک عورت میرے لئے کھانا بناتی ہے اور دوسرا ذرا سیور ہے، زندگی انتہائی مشکل ہے، ہاتھ ٹنگ رہتا ہے بعض اوقات دوستوں سے بھی رقم مائلنا پڑتی ہے۔" یہ ایران کے سابق شاہ رضا پہلوی کی ملکہ فرج کے خیالات ہیں۔ فرج دیبا نے پچھلے بیٹتے نیوارک نامنزکی ڈیبورا سولومن کو انعرویو دیا۔ فرج پہلوی 1979ء میں ایرانی انقلاب کے وقت شاہ کے ساتھ امریکہ فرار ہو گئی تھی، شروع شروع میں وہ شاہ کے ساتھ ماری بھرتی رہی، یہ دنوں گرتے پڑتے کسی ملک میں داخل ہوتے، وہاں سے انہیں چھڑاؤں میں لکل جائے کا حکم ملتا، وہ اسی دوسرے "دوسٹ" کی چوکت پر آگرتے وہ بھی انہیں جلد ہی چلتا کر دیتا، ان کی بادشاہت چھن پھکی تھی، سوئز لینڈ کے بیکوں میں پڑا پیسہ ضبط ہو چکا تھا، دشمن ملک ملک ان کا چیچھا کر رہے تھے اور امریکہ نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا چنانچہ ایک کسپری اور خود ترسی تھی جس میں شاہ نے قاہرہ میں 1980ء میں دم توڑ دیا، اسے اسی مکان کے صحن میں چپ چاپ دفن کر دیا گیا۔ جس کے بعد فرج آزاد ہو گئی، وہ مصر سے امریکہ آگئی اور پچھلے 25 برسوں سے امریکہ میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہی ہے۔ اس نے یہ 25 برس ان زیورات کے بل بوتے پر گزار دیئے جو وہ تہران سے ساتھ لائی تھی۔ یہ ایک ایسی خاتون کی درد بھری کہانی ہے جو میں برس تک تیل کی دولت سے ملامال ایک جدید اور شاندار ملک کی خاتون اول رہی، یہ خاتون ایک ایسے بادشاہ کی بیوی تھی جس کے ایک اشارے سے دنیا ادھر سے ادھر ہو جاتی تھی، جس کے خاوند نے ایک روز ایرانی شہنشاہیت کا اڑھائی ہزار سالہ جشن منانے کا فیصلہ کیا۔ ماہرین نے تاریخ کی کتابیں کھنگالیں تو معلوم ہوا، ایران میں بادشاہت کو ابھی فقط ایک ہزار چار سو چند رہ سال گزرے ہیں۔ جب شاہ کو اس صورت حال سے مطلع کیا گیا تو اس نے کیلندر کو ایک ہزار پنچتیس برس آگے کرنے کا حکم جاری کر دیا اور دچھپ بات ملاحظہ کیجئے کیلندر واقعی آگے کر دیا گیا۔ شاہ نے ایک روز اپنے وزیر دربار امیر عباس ہویدا سے وقت پوچھا، اس نے جواب دیا "چھ بجے ہیں۔" شاہ نے مجلس شوریٰ کے صدر مہندس ریاضی سے پوچھا اس نے بھی عرض کیا "چھ بجے ہیں" شاہ نے اپنی گھری اتاری اور غصے سے بولا

"یہ بد بخت پانچ بجارتی ہے۔" شاہ نے نائم درست کرنے کے لئے ناب کو چکلی میں دبایا تو امیر عباس ہویدا چلا یا "قریبان شوم یہ آپ کیا کر رہے ہیں، آپ کے غلام یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ حضور کو گھری درست کرنے کی رسمت اٹھانا پڑے، آپ اس کو نہیں رہنے دیں، ہم 35 ملین عوام اپنی اپنی گھریاں ایک گھنٹہ پیچھے کر لیتے ہیں۔" جس کے ایک وزیر اعظم منوچہر اقبال نے بھری پارلیمنٹ میں کہا میں شہنشاہ کا نوکر نہیں بلکہ چاکر (گھوڑوں کی خدمت کرنے والا) ہوں۔ جلوگوں کو اپنے پیش لفظ اور تحملوں والا قرآن مجید پیش کرتا تھا، جس نے ایک آرڈر کیا اور ایران میں موجود 44 ہزار امریکیوں کو سفارت کاروں کا درجہ مل گیا۔ جس نے سرکاری سٹھ پر دو مردوں کی آپس میں شادی کرائی اور دعوت ولیم میں تمام فوجی جریلوں، ہیوروکریٹس اور وزراء نے شرکت کی جس نے ایک حکم جاری کیا اور ایران میں داڑھی رکھنے پر پابندی لگ گئی اور جو دوبار میں آتا تھا تو قصیدہ گو کہتے تھے جو کچھ آپ نے عوام کے لئے کیا اتنا کچھ ایران کے سارے شہنشاہوں نے اڑھائی ہزار سال میں نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ آپ کو ایک سو بیس سال کی عمر عطا کرے لیکن یہ شہنشاہ 71 برس کی عمر میں قاہرہ کے ایک معمولی گھر میں اس طرح فوت ہوا کہ اس کے سرہانے کوئی طبیب تھا اور نہ ہی سورۃ یاء میں پڑھنے والا کوئی قاری، اس ویانے میں فقط فرج دیبا کی سکیاں اور شاہ کی شہنشاہیت کی بوسیدہ یادیں، اس بے مراد بادشاہ کو جنازہ تک نصیب نہ ہوا، صرف دو چار بندے تھے جنہوں نے مکان کے سخن میں اسے فن کیا اور دعا کر کے گھروں کو لوٹ گئے، آج بادشاہ کی اعلیٰ بچانے کے لئے اس مکان کے باہر فتح کارڈ گھرے رہتے ہیں جبکہ اندر اندر حیرے مزار پر کوئی چراغ جلتا ہے اور نہ کوئی فاتحہ پڑھتا ہے اور رہتی ایران کی آخری ملکہ تو ہے 25 برس سے زیور رنجی کر گزارہ کر رہی ہے۔ اپنا نواٹ خود دھوٹی ہے، مارکیٹ سے اپنا سودا خود لاتی ہے خادم چھٹی پر چلی جائے تو اسے اپنا کھانا بھی خود اسی بنا پڑتا ہے، شام آتی ہے تو فرج دیبا پہلوی پر یا سیت کے لبے دورے پڑتے ہیں، وہ بے تحاشہ شراب چیتی ہے اور دیواروں کو خادم سمجھ کر حکم جاری کرتی ہے لیکن افسوس جب اقتدار ختم ہوتا ہے تو دیواریں بھی اپنا سایہ واپس نکل لیتی ہیں۔

کہہ ارض پر، تاریخ اقوام عالم میں محمد رضا شاہ پہلوی جیسے بادشاہ اور فرج دیبا بھی کتنی ملکائیں گزری ہیں، کتنے لوگ تھے جنہیں اپنے اقتدار اپنے اختیار پر مان تھا، جو سورج کو بجھ جانے اور ہواویں کو خیبر جانے کا حکم دیتے تھے، جو خود کو مقدر ساز سمجھتے تھے اور جلوگوں کو سائیں بھی گن کر دیتے تھے لیکن پھر کیا ہوا یہ تمام ملکائیں اور یہ سارے بادشاہ کشکوں بن کر گلی گلی پھرے، ایک ایک سانس اور ایک ایک لقے کہتے ہوئے اس عارضی جہان سے رخصت ہو گئے لیکن یہ انسان ہی کا کمال ہے۔ یہ پرانے بادشاہوں کی نعشوں پر کھڑا ہو کرتا جا پہنتا ہے اور پھر یہ گمان کرتا ہے وہ اور اس کا اقتدار قیامت تک جاری ہے گا، میں ان چھوٹے چھوٹے بادشاہوں سے عرض کرنا چاہتا ہوں آپ تاریخ کی کھڑکی ذرا سی کھوں کر دیکھیں جس دنیا پر شاہ ایران کا اقتدار قائم نہ رہا اس صفحی، ستی پر آپ کا اختیار کتنی دیر ہے گا، آخر خشک پتوں پر جمی رہتی دیر قائم رہتی ہے، آخر صحرائیں گرے ادلوں کی زندگی کتنی ہوتی ہے!

شوکت عزیز میرے بھائی ہیں

میں جاگنگ مشین سے اتر آیا۔

میرا پر اجسم پینے میں شرابور تھا، سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی، دل پسلیوں کا پتھرہ توڑ کر باہر آنے کے لئے بے تاب تھا اور نالکیں تحکاوت سے چور ہو چکی تھیں، میں نے تو لیے سے گردن صاف کی، یعنک اتار کر منہ پوچھا اور مشین کے میز پر جگ کیا۔ میں نے 45 منٹ میں پانچ کلو میٹر جاگنگ کی تھی۔ ریڈنگ دیکھ کر میری گردن میں تناؤ آگیا، میں نے آنکھوں میں سکندر اعظم سافاتھانہ غرور بھرا اور ہال میں موجود "حضرت مخلوق" کو دیر تک "کوئی ہے جو ہمارا مقابلہ کر سکے" جیسی نظروں سے دیکھتا رہا، میرا سینہ خوشی، اعتاد اور تقاضر سے لبایا تھا۔ میں نے اپنے ساتھی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور رسم زمان کے لئے میں پوچھا" دیکھا میرا مشینا، میں نے 45 منٹ میں پانچ کلو میٹر لئے" میرے ساتھی نے قبیلہ لکھا اور موبائل فون کے ہٹنوں سے کھیلتے ہوئے بولا" لیکن ہوتم وہیں جہاں پہلے تھے" میں نے غصے سے حیرت دنیا کے اس حیرت انسان کو دیکھا اور دانت کچکپا کر کہا" مشین کا میز جھوٹ بول رہا ہے، میری حالت دیکھو، میرا پسند، میری ہارت ہیت، میری نالگوں کی تحکاوت سب بکواس، سب جھوٹ ہے اور یہ بھی جھوٹ ہے، میں تمہارے سامنے پورے پینتالیس منٹ مشین پر بھاگتا رہا۔" میرے دوست نے ایک اور قبیلہ لکھا" نہیں، یہ سب حق ہے گرفتم ذرا شنڈے مانگ سے سوچو، تم مسلسل پینتالیس منٹ بھاگتے رہے، بھاگ بھاگ کر تمہاری نالکیں چور ہو گئیں، سانس پچھوں گئی، تمہارا جسم پینے میں بھیگ گیا لیکن جب تم مشین سے اترے تو تم وہیں تھے جہاں سے تم نے سفر شروع کیا تھا۔ ایسی مسافت، ایسی بھاگ دوڑ کا کیا فائدہ جس میں بندے کا پینڈا اسی نہ بجزے، وہ بھاگ بھاگ کر پاگل ہو جائے لیکن منزل کی دوری میں ایک اچھی کمی نہ آئے۔ سفر تو وہ ہوتا ہے بندہ خواہ چیزوں کی چال چلتا ہوا یا کچھوے کی طرح رینگتا ہوا، لمحہ بے لمحہ منزل کی طرف بڑھتا نظر آئے۔ دوریاں مٹتی اور قربتیں بڑھتی چھوٹیں ہوں، یہ کیا سفر ہوا۔ بندہ چل بھی رہا ہوا وہیں کا وہیں کھڑا بھی رہے۔ یہ سفر نہیں دھوکا ہے۔ اپنے آپ کو یہ قوف بنانے کی کوشش۔ خود کو دھوکہ دینے کی سعی ہے۔"

میں مشینی دور کا مشینی انسان ہوں، میشوں کی ریڈنگ، مشینوں کی چوری، برتنی آلات کی سکرینوں اور سکرینوں کی جلتی بھجتی بیجوں پر یقین رکھتا ہوں۔ میرے جیسے انسان کے لئے اپنے دور کی بات ماننا بہت مشکل

تحالیکن تمام تر سائنس پرستی کے باوجود میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ آیا تھا۔ واقعی جائینگ مشین پر بھاگ دوڑ سفر تو ہے لیکن ہے سفر رائیگاں۔ میں ہال سے باہر آ گیا۔ باہر اسلام آباد کی نرم شام افغان سے قطرہ قطرہ اتر رہی تھی، ہوا میں خندہ سے پانیوں سے دھلے گیسیوں کی خوبیوں اور مہندی لگے ہاتھوں کی حلاوت تھی۔ اس حلاوت، اس خوبیوں اور شام کی اس نری میں بہتے بہتے میں نے سوچا۔ شوکت عزیز صاحب بھی میرے ہی بھائی ہیں۔ جائینگ مشین پر کھڑے ہیں۔ مسلسل بھاگ رہے ہیں، نائلنیں حکمن سے چور ہیں، دل پسلیاں توڑ کر باہر آنے کے لئے بچل رہا ہے، سانس دھونکنی کی طرح چل رہا ہے اور جسم پینے سے شرابور ہے۔ مشین کا میزہتا رہا ہے مسافر بے شمار مسافتیں طے کر چکا ہے۔ لاتعداد قلمی اور بر جیاں فتح کر چکا ہے۔ وہ بھی میری طرح ریئنگ دیکھ کر سکندر اعظم ہو جاتے ہیں اور تفاخر سے اپنے آگے پیچھے دیکھتے ہیں پھر رسم زمان کے لمحے میں کہتے ہیں "کوئی ہے جو ہمارا مقابلہ کر سکے۔" کوئی جواب، کوئی آواز نہیں آتی لیکن جب شوکت عزیز صاحب میری طرح مشین سے اتریں گے، پیشہ پوچھیں گے اور پھر مانتے پر ہاتھ رکھ کر منزل کی طرف دیکھیں گے اور انہیں معلوم ہو گا۔ وہ اب بھی اتنی ہی دور ہے جتنی سفر سے پہلے تھی تو پھر ان کے کیا محسوسات ہوں گے! وہ کیا سوچیں گے، میں ہمam کے سرخ سمندروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

شوکت عزیز صاحب نے کل "نیوز" کے پری بجٹ سیکیوار سے خطاب کیا، انہوں نے فرمایا، ہم نے اقتصادی خود مختاری حاصل کر لی۔ ہم نے ڈالر کے سامنے بند باندھ دیے اسے 60 روپے سے کرنے نہیں دیا۔ ہم نے گرو تحریث تین اشایہ تین فیصد کر دیا، کمرشل بینکوں کی شرح سو کم کر دی۔ افراط زر تین فیصد پر لے آئے اور ہم نے زر مبالغہ کے ذخیرے 60 کروڑ ڈالر سے پانچ اشاریہ دوارب ڈالر کر دیے۔ میں شوکت عزیز صاحب کے خطاب سے بہت متاثر ہوا۔ متاثر تو میں گورنمنٹ بینک جناب عشرت حسین کی تقریر سے بھی ہوا جنہوں نے فرمایا تھا پاکستان کا قرضہ چار ارب ڈالر کم ہو گیا، اب بیرونی قرضے 37 ارب سے 133 ارب ڈالر ہو چکے ہیں۔ تیل کی درآمد کا مل پانچ سو ملین ڈالر کم ہو گیا، مالیاتی خسارہ سات سے پانچ اشاریہ تین پر آ گیا۔ یہ سب باتیں ٹھیک تھیں۔ میں اپنے ملک کے اتنے بڑے معاشی اور اقتصادی دماغوں کی محنت پر خوش تھا لیکن کیا کیا جائے، اس خوبیوں اور نرم شام کا میں جس کے سامنے کھڑا تھا، اس جائینگ مشین کا جس کے میز پر ابھی تک پانچ اشاریہ دو کلو میٹر کے ہند سے چمک رہے ہوں گے اور اپنے اس فلسفی دوست کا جو موبائل فون کے ہٹنوں سے کھیلتا ہوا میرے پیچے پیچے آ رہا ہے۔ میں نے سوچا، اگر ہماری حکومت اچھا کر رہی ہے تو معاشرے میں وہ اچھا نظر کیوں نہیں آ رہا، اگر خسارہ کم ہوا ہے تو ماہنگے، گامے تک اس کا اثر کیوں نہیں پہنچ رہا، اگر تیل کا درآمدی بل کم ہوا ہے تو اس فراوانی کا فیض جسم پر تیل ڈال کر ماچس علاش کرتے ہزاروں لاکھوں لوگوں تک کیوں نہیں پہنچ رہا۔ اگر بیرونی قرضوں میں کمی واقع ہوئی ہے تو اس معاشی، اس اقتصادی وسعت کا پھل عام شہریوں کو کیوں نہیں مل رہا۔ گرفراط زر کم ہوا ہے، گرو تحریث میں اضافہ ہوا ہے، مالیاتی ذخیرے ڈس-

گناہ بڑھتے ہیں تو عام لوگ اس کشادگی سے کیوں مبراہیں۔ انہیں اس کی مینڈک کا احساس کیوں نہیں ہو رہا۔ اگر شہر میں پانچ ہزار تنور لگتے ہیں لیکن لوگ اس طرح بھوکے سوتے ہیں، اگر پورے شہر میں شامیانے تاں دیئے جاتے ہیں لیکن لوگوں کے سروں پر اسی طرح سورج چلتا رہتا ہے اور پورا شہر قاضی بن جاتا ہے لیکن لوگوں پر اسی طرح خلُم جاری رہتا ہے تو ان قاضیوں، ان شامیانوں اور ان تنوروں کا کیا فائدہ، اگر کپاس کا پورا کھیت مل کر کسی کا ستر نہ ڈھانپ سکے تو اس کھیت کو جانہیں دینا چاہیے؟ اگر معاشی خوشحالی ہے تو وہ کہاں ہے۔ آپ کہہ رہے ہیں بارش ہو رہی ہے نحیک ہے لیکن مینڈک کا طلق تو سوکھا ہے، وہ مینڈک آپ کی بات پر کیے یقین کر لے لیکن نہیں مانیں گے۔ شوکت عزیز صاحب، عشرت حسین صاحب اور سی بی آر کے چیزیں من ریاض ملک صاحب بھی نہیں مانیں گے بالکل سرتاج عزیز صاحب، اسحاق ڈار صاحب اور مخدوم شہاب صاحب کی طرح نہیں مانیں گے۔ جنہیں بھی اپنے اپنے دور میں معیشت مصبوغی کپڑتی او ملک ترقی کرتا دکھائی دیتا تھا لیکن جب یہ لوگ جاگنگ مشین سے اترے تو ملک بھی وہیں کھڑا تھا اور معیشت بھی۔

شوکت عزیز میرے بھائی ہیں جاگنگ مشین کی جاگنگ کو سفر بھجو رہے ہیں اسے ترقی کہہ رہے ہیں۔

سر انور پرویز کی مثال

1935ء میں راولپنڈی خیلتا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، اس گاؤں میں ایک بڑی سڑک، ایک فوجی چھاؤں اور دور دور تک پھیلی غربت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس گاؤں سے 35 میل دور گوجر خان تھا اور گوجر خان سے تین چار میل دور ایک پسمندہ اور غیر معروف گاؤں "تحالی"۔ اس گاؤں کی ایک ہی خوبی تھی اور اس خوبی کا نام غربت تھا۔ انہوں نے اسی غربت میں آنکھ کھوئی، جوں جوں آنکھ کھلتی گئی غربت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ جوان ہوئے تو ان کے پاس بھرت کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ 1956ء میں کراچی سے بھری جہاز لندن جاتے تھے، ویزے کا ابھی رواج نہیں ہوا تھا وہ 21 برس کی عمر میں جہاز تک پہنچے اور دھکے کھاتے کھاتے بڑا پیٹھی گئے۔ ان دونوں الشیائی باشندے صرف بریٹنی فورڈ تک محدود تھے انہوں نے بھی دیں پناہ لی۔ ابتدائی توکری بس کنڈیکٹر کی تھی۔ وہ دن اور رات کا پیشتر حصہ بس میں تک بیچتے اور تک چیک کرتے گزارے، خود بتاتے ہیں انہوں نے بے شمار سردیاں ایک معمولی کوٹ میں جھیلیں۔ بس میں کھڑے رہ رہ کر ٹانگوں کی ہڈیاں پتھر اور گوشت لکڑی ہو جاتا تھا لیکن اور نائم کے چکر میں وہ مسلسل کام کرتے رہے تھے۔ انہوں نے یہ کام 1962ء تک کیا۔ 1962ء میں انہیں لندن میں ایک دکان مل گئی۔ یہ ایک کارز شاپ تھی جس کے کامیاب ہونے کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا لیکن انہوں نے سوچا توکری خواہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو وہ بہیش پرائی رہتی ہے جبکہ اپنا کام کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہوا پناہ ہوتا ہے۔ توکری چھوڑنے کا فیصلہ ان کے لئے بہت مشکل تھا، یہ فیصلہ ہر شخص کے لئے مشکل ہوتا ہے کیونکہ یہ ایک لگی بندھی آمدی ہوتی ہے جو آپ کو مخصوص دونوں میں ہر صورت مل جاتی ہے اور آپ اپنی زندگی کے معمولات کو اس کے ساتھ ٹینون اپ کر لیتے ہیں لہذا یہی وجہ ہے 99 فیصد توکر پیش لوگ زندگی بھرنے کی سے پچکے رہتے ہیں اور موت تک معاشی آزادی حاصل نہیں کر سکتے اور یہ بھی حقیقت ہے دنیا کا کوئی توکر پیش شخص معاشی طور پر کامیاب نہیں ہو سکتا کیونکہ معاشی کامیابی صرف اپنے کام، اپنی دکان اور اپنے کار و بار سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ مشکل ان کے لئے بھی موجود تھی لیکن انہوں نے جرأت سے کام لیا، کنڈیکٹر کی توکری چھوڑی اور اپنی ساری جمع پونچی دکان پر لگادی۔

یہ پرپون کی ایک چھوٹی سی دکان تھی جس پر روزمرہ کی چھوٹی چیزوں کی تجسس کی نہ صاف خرید لیا، کوئی شیپو، پیسٹ اور سگریٹ لے گیا، کسی نے ڈبل روٹی، دودھ اور چال خرید لئے اور کوئی ٹکلیا، ثاقبیاں اور چالکیٹ خریدنے آگیا، وہ خود ہاتھ سے کام کرتے تھے لہذا اللہ تعالیٰ نے برکت دی، دکان چل نکلی اور وہ جلد ہی کندھ کیٹری سے دو گنا، تین گنا اور پھر چار گنا کمانے لگے، آمدی بڑھی تو انہوں نے ملازم بھی رکھ لئے، اشیاء کی اقسام اور وہ رائی بھی بڑھا دی۔ گاہ کوں میں اضافہ ہوا تو دکان چھوٹی محسوس ہونے لگی، انہوں نے جگہ بڑھائی تو آمدی بڑھ گئی، یوں چلتے چلتے 1976ء آگیا۔ انہوں نے ہول یہاں بننے کا فیصلہ کیا، انہوں نے آکشن میں بیٹ وے کے نام سے اپنی پہلی کیش اینڈ کیری کھوئی، 1980ء کے بعد ان کے کاروبار کوپہ لگ گئے، ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری کیش اینڈ کیری کھلی، وہ گوداموں اور شاپنگ منشوں کے مالک بنتے چلے گئے یہاں تک کہ ان کا کاروبار پورے برطانیہ میں پھیل گیا، اس وقت انگلستان میں ان کی 28 بیٹ وے کیش اینڈ کیری ہیں۔ ان کے ادارے میں اڑھائی ہزار لوگ کام کر رہے ہیں۔ وہ برطانیہ کے دوسرے بڑے کیش اینڈ کیری گروپ کے مالک ہیں، ان کے پاس برطانیہ کی ایک لاکھ مرکب فٹ کرشل زمین ہے۔ ان کی فرم ہر سال ایک ارب پاؤ ٹنڈ کرتی ہے۔ ان کے پاس 175 ملین پاؤ ٹنڈ نقد ہیں جبکہ پاکستان میں وہ ایک بہت بڑے سینئٹ پلاٹس اور ایک بڑے کرشل پینک کے 25 فیصد شیئرز کے مالک ہیں۔ انہیں 1999ء میں برطانوی حکومت نے سر کا خطاب اور 2000ء میں پاکستان نے سب سے بڑا ایوارڈ ہلال پاکستان سے نوازا۔ ابھی چند دن پہلے سنڈے ناگز نے برطانیہ کے ایک ہزار ارب پتی شہریوں کی فہرست جاری کی۔ وہ اس فہرست میں 233 نمبر پر تھے۔ راولپنڈی کے اس شہری کا نام سر انور پردو ہے۔ یہ ایک ایسے شخص ہیں جن کا تعلق غریب گرانے سے تھا، جن کے پاس اعلیٰ تعلیم نہیں تھی، جن کے ہاتھ میں کوئی ہنر نہیں تھا لیکن بیان روز مخت انبیس فرش سے عرش تک لے گئی اور ان کا شمار برطانیہ کے امیر ترین شہریوں میں ہونے لگا۔ ان کی ترقی ایک بار پھر پاکستان کے چودہ کروڑ لوگوں کے سامنے سوال بن کر کھڑی ہے۔ یہ اس نظام، اس سسٹم سے پوچھتی ہے، یہ اس ملک کے حکمران طبقے سے سوال کرتی ہے کہ کیا اس ملک میں کوئی کندھ کیٹر جائز طریقے سے ارب پتی بن سکتا ہے، کیا پاکستان کا کوئی کریا نہ مرچنٹ ایمانداری اور محنت سے اس ملک میں کیش اینڈ کیری کا مالک بن سکتا ہے؟ شاید نہیں! پھر سوال پیدا ہوتا ہے وہ کیا چیز، وہ کیا جذبہ ہے کہ ایک عام سا، ان پڑھ پاکستانی جوں ہی اس ملک سے باہر قدم رکھتا ہے تو اس پر ترقی اور کامیابی کے دروازے کھل جاتے ہیں وہ کندھ کیٹر سے سر کے خطاب تک جا پہنچتا ہے، وہ معمولی گروپری شاپ سے بیٹ وے کا مالک بن جاتا ہے۔ شاید اس جذبے اس چیز کا نام سسٹم ہے۔ یہ ایک عادلانہ نظام ہی ہے جو یونیورسٹی کے ایک ناکام گریجوٹ کو بل گئیں بنا دیتا ہے اور جو ایک کندھ کیٹر کو برطانیہ کے امیر ترین لوگوں کی فہرست میں شامل کر دیتا ہے لیکن افسوس ہم 57 برس میں اس ملک میں کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکے جو لوگوں کے ترقی

کے جذبے میں اضافہ کرے، جو انہیں کامیابی کی نئی نئی راہیں دکھائے، ہم تو وہ لوگ ہیں جو اپنے ذہین، فطیں اور مختی لیکوں کو دھکے دے کر ملک سے باہر نکلتے ہیں، جب وہ وہاں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ہم ان کے گلے میں ”ہلال پاکستان“، ”ذال دیتے ہیں۔ میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا ایک شخص پاکستان میں رہتا ہے تو وہ دنیا کا نکما ترین شخص ہوتا ہے، لوگ اسے غبی اور کندڑ ہن سمجھتے ہیں لیکن وہ جو نہیں اس ملک سے باہر قدم رکھتا ہے دنیا بھر کی کامیابیاں اس کے سامنے بجھ رہیں ہو جاتی ہیں، کیوں؟ آخر کیوں؟ کسی کے پاس اس کا کوئی جواب ہے!



اسلامی معیار

بازار میں شور ہوا عرب آگئے۔ لوگ گروں، دکانوں اور محلوں سے نکلے اور شہر سے باہر آگئے۔ سامنے عرب تاجر ووں کا قافلہ پڑا اور ڈال رہا تھا۔ بوریوں اور تھیلوں سے سامان نکال رہا تھا، چست گھوڑوں کی چینی پر کا حصہ اس ڈالی جا رہی تھیں، اونوں کی گرد نیس رگڑی جا رہی تھیں۔ لوگوں نے بھاؤ ٹاؤ شروع کر دیا۔ اہل قافلہ کہتے رہے ”صح منڈی لگے گی تو سودا بچیں گے“، لیکن اہل شہر کا اصرار تھا ”بیس ہم تو ابھی خریدیں گے“، چھوٹے تاجر سردار کے پاس گئے، سردار نے بھی لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی، شام کے چھیتے سایوں کی طرف اشارہ کیا لیکن لوگ ماننے کے لئے تیار نہیں تھے لہذا مجبوراً منڈی لگا دی گئی، لوگ بولیاں دینے لگے، سودا مکنے لگا۔ اسی خرید و فروخت میں رات ہو گئی مشعلیں جلا دی گئیں، باقی سودے بازی مشعلوں کی روشنی میں ہوئی پوچھوٹنے تک میدان خالی تھا۔ قافلے کا سارا سامان فروخت ہو چکا تھا۔ یہ سیلوں کی ایک دور دراز بستی تھی اور یہ بارہویں صدی عیسوی کا ایک منظر ہے۔ یہ عرب تاجر بھری جہازوں پر سامان بھر کر سیلوں کے جزیرے پر اترتے تھے، لوگ مہینوں ان کا راستہ دیکھتے تھے جوئی ان کی آمد کی خبر گوئی، لوگ روپے، پیسے، سوتا چاندی لے کر قافلے کے گرد جمع ہو جاتے، بولی لگاتے اور خالی بوریاں تک خرید کر لے جاتے، اس وقت بوری، جاپانی اور چینی تاجروں کے قافلے بھی سیلوں آتے تھے لیکن عربوں کا مال معیار میں ان سے کہیں بہتر ہوتا تھا۔ یہ لوگ مسلمان تھے لہذا امال خالص اور تول میں بھی پورا ہوتا تھا۔ یہ لوگ زیادہ منافع لینے کے لئے قائل نہیں تھے، ان کے مال میں کوئی شخص ہوتا تو یہ لوگ بولی سے پہلے خریداروں کو عیوب بتا دیتے تھے، بعد از فروخت بھی کوئی شخص نکل آتا تھا تو یہ لوگ دوسرے پھرے میں واپس لے لیتے تھے، یہ لوگ کوئی چیز تول کر دیتے تھے تو لوگ چپ چاپ لے لیتے۔ آپ آج بھی سری نکا جائیں تو آپ کو دہاں جو ابراہیم، عمر، ابو بکر، عثمان اور محمد علی میں گے یہ تمام ائمیں گاہوں کی اولاد ہیں جو عرب مسلمانوں سے سودا خریدنے گئے اور ان کی ایمانداری اور اخلاق سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔

سری نکا ہی نہیں اس وقت کے 46% اسلامی حملہ میں اسلام کی بنیاد تاجروں نے رکھی تھی، اشاعت اسلام کے تین بڑے ذرائع تھے تاجر، صوفیا، اور مسلم فاتحین۔ تاجر اپنی تجارت سے لوگوں کو متاثر

کرتے، صوفیا کرام تبلیغ کرتے اور آخر میں محمد بن قاسم، جیسے پہ سالار لوگوں کو ظلم کی حکومت سے نجات دلا دیتے، بچوں، عورتوں اور بوزہوں کی جان بخش دی جاتی، انصاف اور مساوات قائم کر دی جاتی اور لوگ اپنے ہاتھوں سے بت توڑ کر حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے، مذہبی تبلیغ کی دس ہزار سالہ تاریخ میں اسلام واحد مذہب تھا جس نے دلوں تک پہنچنے کے لئے تجارت کو وسیلہ بنایا۔ اسلام نے تجارت میں ایک ایسا معیار قائم کیا، جس میں ملادت، ناپ تول میں کمی، ناقلوں چھپانے اور جھوٹ بولنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی، جس میں اپنے استعمال کے دو دفعہ میں بھی پانی ملانے کی ممانعت تھی۔ یہ معیار تجارت دنیا کے لئے نیا تھا الہذا وہ خریدار کسی مسلمان تاجر کی دکان، تھرے یا خیسے میں آ جاتا وہ سودے کے ساتھ ایمان کی دولت بھی لے کر جاتا، تھورام کندھے پر بوری رکھتا تو وہ محمد ابراہیم ہو چکا ہوتا تھا کیونکہ دنیا سے اسلامی معیار ختم ہو گیا۔ وہ اسلامی تجارت جس نے پوری دنیا میں اسلام کی خوبصورتی پھیلائی وہ آہستہ آہستہ ختم ہوتی چلی گئی حتیٰ کہ وہ وقت آگیا جب اسلامی دنیا میں کوئی کمپنی، کوئی ایسی پرائز کٹ شرحتی جو شیف میں پڑی ہو اور ہاتھ بے اختیار اس کی طرف انہوں جائیں۔ آپ دلچسپ بات ملاحظہ کرنے کے لئے اب لوگ حال گوشت تک غیر اسلامی ممالک کا پسند کرتے ہیں۔

آپ پوری دنیا کا جائزہ لیں آپ کو 61 اسلامی ممالک کی کپیاں، فیکٹریاں اور مصنوعات صفر نظر آئیں گی۔ دنیا میں کسی جگہ ان کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی، صرف مہاتم محمد ہیں جو کسی نہ کسی حد تک ملاشیں معیار قائم کر لے لیں کامیاب ہوئے ورنہ باقی تمام اسلامی ممالک مختلف خریداروں پر چلے ہیں۔ اس دنیا جس میں اس وقت امریکن کوالٹی، برلن کوالٹی، یورپی معیار، جاپانی، چینی حتیٰ کہ بھارتی معیار تک موجود ہے اس میں اسلامی معیار کا نام تک موجود نہیں، ہم جب بھی بازار جاتے ہیں تو اپنے ہندو کوالٹی مانگتے ہیں مصنوعات انحصار کران کے پیندے پر گلی مہر دیکھتے ہیں اگر وہاں کسی اسلامی ملک کا نام ہو تو واپس شیف پر رکھ دیتے ہیں۔ میں نے سینکڑوں ہزاروں مسلمانوں کو یہودی مصنوعات خریدتے اور استعمال کرتے دیکھا۔ ہم لوگ یہودی کپنیوں کی خوراک اور ادویات استعمال کرتے ہیں۔ ہم انہوں نیشاں کی جگہ ڈیوڈ اینڈ ڈیوڈ کا ریزو خریدیں گے۔ سگریٹ اور چائے کی پتی بھی یہودی کپنیوں کی استعمال کریں گے۔ میں نے امریکہ میں اپنے ایک دوست کو بھارتی ہندو کی دکان سے چاول خریدتے دیکھا، وجہ پوچھی تو اس نے قہقہہ لٹا کر کہا "اس مارکیٹ میں مسلمانوں کی دس دکانیں ہیں یعنی صرف اس ہندو کی دکان سے خالص اور معیاری چیز ملتی ہے" میرے دوست کا کہنا تھا ہم لوگ حال گوشت بھی اس ہندو کی دکان سے خریدتے ہیں۔ میں نے پورے عرب دنیا میں ڈن مارک کا حلال گوشت بکتے دیکھا جس کا مطلب 61 اسلامی ممالک میں کوئی ایسا ملک نہیں جو اچھا اور خالص گوشت ہی پیدا کر سکتا ہو، پاکستان دنیا میں بہترین کاشن پیدا کرنے والا ملک ہے لیکن پاکستان میں تھائی لینڈ، فلپائن اور چین کے سوتی کپڑے بکتے ہیں میں جب میڈیا میکل سٹور پر جاتا ہوں تو یورپ اور امریکہ سے درآمد کردہ دوائیں مانگتا ہوں۔ دکاندار کسی اسلامی ملک کی تیار کردہ دوادے تو میں مغدرت کر لیتا ہوں کیونکہ مجھے اس کے معیار پر اعتبار نہیں۔

میں چند روز پہلے لاہور کے ایک ریسٹوران کے واش روم میں داخل ہوا۔ کمود کے اوپر جلی حروف میں "امریکن شینڈر" لکھا تھا۔ مجھے بھی آگئی اور میں نے دل میں سوچا طبیارت ہمارے ایمان کا حصہ ہے لیکن ہم 61 ممالک اسلامی معیار کا کمود تک نہیں بناسکتے۔ اب ہمیں اونا، تسبیح اور جائے نماز بھی غیر مسلم بنا کر دیتے ہیں۔ افسوس وہ اسلام جسے تاجروں نے زمین کے آخری کونے تک پھیلایا آج وہی اسلام تاجروں کے ہاتھوں سست رہا ہے وہ معیار جس کی بنیاد اسلام نے رکھی تھی، وہ معیار آج میدان یو ایس اے کے نیچے دب چکا ہے۔



بلٹ پروف

فرعون تاریخ انسان کا پہلا حکمران تھا جس نے ایوان اقتدار کی حفاظت کا نہایت شاندار نظام وضع کیا۔ اس نے خواب دیکھا اور جو تصیع نے تعبیر کی، بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہوگا جو بڑا ہو کر تمہیں قتل اور تمہاری سلطنت تباہ کر دے گا۔ فرعون نے حکم دیا آج کے بعد بنی اسرائیل کا ہر بچہ پیدا ہونے والا بچہ قتل کر دیا جائے، فرعون کے حکم پر بنی اسرائیل کے ہزاروں بچے قتل کر دیئے گئے لیکن آخر میں معلوم ہوا فرعون کی موت اور مصر کی جاہی جس شخص کے ہاتھوں میں لکھی تھی وہ تو ایوان اقتدار میں پڑتا رہا، وہ تو بادشاہ کی خواب گاہ، بادشاہ کی آغوش اور بادشاہ کے دستر خوان پر جوان ہوا یوں بادشاہ دریائے نیل میں غرق ہو گیا اور اس کی سلطنت احرام مصر کی شکل میں عمرت کا انشان بن گئی۔ فرعون کے بعد امریکی دوسری قوم ہیں جنہوں نے ایوان اقتدار کا فول پروف سکوری سسٹم بنایا۔

دوسری جگہ عظیم کے بعد واپس اور صدر کی حفاظت کا شاندار انظام کیا گیا۔ 18 ہزار چھست، چالاک اور ذہین جوانوں کی ایک فورس بنائی گئی، یہ فورس دن رات امریکی صدر اور موت کے درمیان حائل رہتی ہے۔ صدر کی سیکورٹی کا انجارج امریکہ کا با اختیار ترین شخص سمجھا جاتا ہے وہ بغیر اطلاع کسی بھی وقت صدر کا شیدول تبدیل کر سکتا ہے، کسی بھی وقت، کسی بھی ایئر پورٹ پر صدر کا طیارہ اتار سکتا ہے، واپس کے نیچے ایک انتہائی مضبوط تہہ خانہ ہے۔ اسٹی جگہ کی صورت میں صدر اپنی کابینہ کے ساتھ اس تہہ خانے میں پناہ لے سکتا ہے، جس جگہ صدر بیٹھتا ہے، جہاں صدر کھڑا ہوتا ہے، اس کی فضا میں طیارہ جیسی اڑکلت، واپس کے گرد اینٹی میزائل تو پیس نصب ہیں جو خود کار نظام کے تحت چند سینڈ میں اپنے ہدف کا انشان بنای سکتی ہیں۔ امریکی قوم ہر سال اپنے صدر کی حفاظت پر پچاس ارب ڈالر خرچ کرتی ہے لیکن اس تمام تر انظام اور سسٹم کے باوجود جان ایف کینڈی 22 نومبر 1963ء کوڈ یا اس میں ایک معمولی شخص کی معمولی سی رانفل کی

معمولی سی گولی کا انشان بن گیا۔

1984ء میں اندر اگاندھی کی زندگی خطرات کا بیکار تھی، مختلف علمدگی پسند تنظیموں نے 24 خودکش سکواڑ بنا رکھے تھے، ان سکواڑز کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا، اندر اگاندھی کی موت، اندر اگاندھی نے اپنی

حفاظت کے نظام کو فول پر وف بنا دیا لیکن پھر کیا ہوا وہ اندر اگاندھی 31 اکتوبر 1984ء کو اپنے ہی وفادار گارڈ بے انت سُنگھ کی گولیوں کا نشانہ بن گئی۔ 1987ء میں جزل ضیاء الحق کو بری خبریں ملنے لگیں، بتانے والوں نے انہیں بتایا ان پر دو طریقے سے حملہ ہو سکتا ہے۔ یہ دونی طاقتیں انہیں براہ راست نشانہ بنا دیں یا پھر ان کے ساتھیوں میں سے کوئی ان پر حملہ کر دے گا۔ انہیں بتایا گیا اگست کا مہینہ ان پر بھاری ہے جزل ضیاء زیریک انسان تھے وہ بہاؤ پور روانہ ہوئے تو انہوں نے امریکی سفیر آرٹلڈ رائل اور پاکستان میں امریکی فوجی مشن کے سربراہ ہربرٹ داس کو بھی ساتھ لے لیا۔ تمام سینز فوجی افسروں کے ساتھ تھے لیکن یہ تمام بندوبست دھرا رہ گیا۔ 17 اگست 1987ء کو سہ پہر سی دن تھری بستی لال کمال میں گرا اور جزل ضیاء الحق ماضی کا قصہ بن گئے۔

یہ چند لوگ نہیں ہیں نسل انسانی کی تاریخ میں دنیا کا کوئی یہ کوئی ستم موت کا راستہ نہیں روک سکا۔ موت ایک دلچسپ حقیقت ہے جب وہ آنے پر آتی ہے تو وہ آسمان سے نازل ہو جاتی ہے۔ زمین سے بچوٹ پڑتی ہے دائیں ہائیں، اوپر نیچے، مشرق مغرب، شمال جنوب ہر طرف سے المآتی ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت، دنیا کا کوئی نظام، دنیا کا کوئی بندوبست اس کا راستہ نہیں روک سکتا۔ اگر فرعون نی اسرائیل کے تمام بچوں کے قتل کے بعد بھی موت سے نہیں بچ سکا تو پھر دنیا کا کوئی حکمران، دنیا کا کوئی صاحب اقتدار امرالہی سے فرار نہیں ہو سکتا۔ جب امریکہ کی ساری ایجنسیاں ایک گستاخ بیک کو بیش کے حلقوں میں پختے ہے باز نہیں رکھ سکیں تو پھر آپ اور میں کہاں کے رسم ہیں۔ فرمایا تھا حضرت علیؑ نے ”موت انسان کی سب سے بڑی محافظت ہے“ یہ حقیقت ہے جب تک وقت نہیں آتا دنیا کی کوئی طاقت انسان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی لیکن جب وقت آجائے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت، دنیا کا کوئی نظام انسان کو بچا نہیں سکتا۔ یقین فرمائیے اگر موت سے پچھنا ممکن ہوتا تو دنیا میں کسی بادشاہ کا مقبرہ نہ ہوتا اور اس وقت دنیا میں صرف بادشاہ اور شہزادے ہوتے۔ یہ حقیقت ہے روز سورج نکلنے اور شام کے سارے سچیلے جتنے بڑی حقیقت، ناجانے ہمارے حکمرانوں تک یہ حقیقت کیوں نہیں چلتی وہ خود کو فرعون سے زیادہ طاقتور اور چالاک کیوں سمجھتے ہیں۔ میں نے گزشتہ روز ایک معاصر میں پڑھا کیا میں ذو پہنچت اتحاری (سی ڈی اے) نے ایوان صدر کے لئے 62 ہزار 7 سو 20 ڈالر (37 لاکھ) کے بلٹ پروف شیشے درآمد کئے ہیں۔ یہ شیشے ہمارے قیمتی صدر جتاب پروین مشرف کی حفاظت کے لئے پریزیڈنٹ آفس میں لگائے جائیں گے۔ سی ڈی اے نے شیشوں کے لئے سی بی آر سے نیکس کی خصوصی چھوٹ لی۔ یہ خبر پڑھ کر میں بے اختیار نہیں پڑا کیونکہ یہ شیشے تو صرف ایوان صدر کی کھڑکیوں میں لگائے جائیں گے جبکہ صدر کینڈی کی نیکیوں تک بلٹ پروف تھیں لیکن جب موت آئی تو کینڈی کی غش سڑک پر پڑی تھی۔



وہ ملک بھی خوشحال نہیں ہوا کرتے

ڈاکٹر عبدالسلام ان دنوں اٹلی کے پرستگون قبیلے فریت میں رہتے تھے۔ انہیں نوبل پرائز ملے چند ہی سال ہوئے تھے۔ ایک روز جنوبی کوریا کا ایک وفد ان سے ملاقات کے لئے آیا۔ ملاقات کا مقصد بہت دلچسپ تھا۔ یہ وفد جاننا چاہتا تھا ”نوبل پرائز کیے حاصل کے جاتے ہیں۔“ ڈاکٹر صاحب نے اس جنوبی وجہ پوچھی تو وفد کے سربراہ نے جواب دیا ”ہم اپنے سائنس دانوں کو نوبل پرائز کے لئے تیار کرنا چاہتے ہیں۔“ ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر پوچھا ”کیا میرے بتائے طریقے سے آپ کے سائنسدانوں کو پرائز مل جائے گا؟“ سربراہ نے نظر میں سر ہلا کر کہا ”ضروری نہیں“ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا ”اگر آپ کو یقین نہیں تو پھر اتنی دور کیوں آئے ہیں؟“ سربراہ نے جواب دیا ”جاں بڑے پاٹیں سائنس دانوں کی حوصلہ افزائی ضرور ہوگی، انہیں یہ احساس ضرور ہوگا ان کا ملک، ان کی حکومت ان کے لئے بہت حساس، بہت تجیدہ ہے۔“ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا ”اس کا کیا فائدہ ہوگا۔“ سربراہ نے جواب دیا ”کوریا کے لوگوں میں سائنس پڑھنے کا ذوق پیدا ہوگا، ہم مزید سائنس دان پیدا کریں گے اور اس کے نتیجے میں ہمارا ملک ترقی کرے گا۔“ ڈاکٹر صاحب نے قبیلہ لگایا اور وفد سے آخری سوال پوچھا ”کیا قوموں کی ترقی سائنس کی مرہون مت ہوتی ہے؟“ سربراہ نے جواب دیا ”ممکن ہے ماضی میں اس کے بغیر ترقی کرتی ہوں لیکن مستقبل میں جس قوم کے پاس جتنے سائنس دان، جتنی لیبارٹریاں اور سائنس کی جتنی درس گا ہیں ہوں گی وہ قوم اتنی ہی ترقی یافت کہلاتے گی۔“ ڈاکٹر عبدالسلام نے یہ واقعہ مدتھوں بعد 15 جنوری 1986ء کو بھارت کی ایک تقریب میں سنایا اور ساتھ ہی پوشن گوئی کی ”کوریا دنیا کی بہت بڑی اقتصادی طاقت بنے گا۔“ ڈاکٹر صاحب کی بات حق ثابت ہوئی اس وقت کوریا کا شمار دنیا کے دس بڑے صنعتی اور کاروباری ممالک میں ہوتا ہے۔ یقیناً میجرزے کی اور بھی وجوہات ہوں گی لیکن ہم اس میجرزے سے کوریا کی سائنس پرستی کو خارج نہیں کر سکتے۔ کوریا کے لاگ جانتے تھے قوموں کے مستقبل میں سائنس دان کرنے اہم ہوتے ہیں لہذا انہوں نے اپنی درس گاہوں، اپنی یونیورسٹیوں اور اپنی لیبارٹریوں کو سائنس دانوں کی بخشیاں بنا دیا ہیں۔ آج آپ دیکھ لیجئے آپ کے گھر میں کوریا کی کتبی چیزیں ہیں۔ سائنس دانوں کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ 5 لاکھ بچوں میں سے صرف 20 ہزار سائنس میں

لپکی لیتے ہیں۔ ان میں سے صرف دو سو ایم ایس سی کی سطح تک پہنچتے ہیں۔ جبکہ ان میں سے صرف 5 پی ایچ ڈی کر پاتے ہیں اور 100 پی ایچ ڈی کرنے والے پروفیسروں میں سے ایک تین الاقوامی شہرت پاتا ہے، جبکہ تین الاقوامی شہرت پانے والے دو سو پروفیسروں میں سے کوئی ایک دنیا کوئی چیز یا انی ایجاد دے پاتا ہے، رہے آئین شائن جیسے لوگ تو ایسے لوگ صد یوں نہیں بلکہ ہزاروں سال بعد پیدا ہوتے ہیں۔ سائنس اور سائنس دان کتنے عظیم، کتنے تازگر ہوتے ہیں آپ اس کا اندازہ ”دنیا کے سو عظیم لوگ“ نامی کتاب سے لگا لیں۔ اس کتاب جس میں رسول اللہ ﷺ، حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ انبیاء میں شامل ہیں جس میں گوتم بدھ گنتیبوش، اشوگ، کارل ماس، سکندر اعظم، بونا پارٹ، ہتلر، چنگیز خان، افلاطون، شائن اور حضرت عمر جیسے عظیم رہنما موجود ہیں۔ اس کتاب میں سائنس دانوں کے 40 نام ہیں۔ ایسا کیوں ہے ایسا اس لئے ہے کہ دنیا میں، معاشرے میں، زندگی میں جتنا حسن، جتنی خوبصورتی اور جتنی سہولت لیڈروں نے پیدا کی اس زمین پر اس سے کمی گناہ زیادہ احسانات سائنس دانوں نے کئے۔ شاید اسی لئے کہا گیا تھا دنیا کو سو صدرروں، وزیر اعظموں اور لیڈروں کے انتقال سے اتنا نقصان پہنچتا جتنا صدمہ دنیا ایک سائنس دان کے مرنے سے اٹھاتی ہے۔ یہ ہے قوموں، معاشروں اور انسانوں کی زندگی میں سائنس اور سائنس دانوں کی حیثیت۔ لیکن آپ یہ بھی ملاحظہ کر جئے ہمارے ملک کا شمار دنیا کے ان بدقسمت ممالک میں ہوتا ہے جس سے سائنس دان نقل مکانی کر رہے ہیں۔ سازمان ایشیا اور جنوبی ایشیا کو اکٹھاف کیا 1997ء کے بعد 9 بڑے ایٹھیں سائنس دان پاکستان سے باہر منتقل ہو گئے جبکہ 250 سائنسدان اور انجینئرنگ مکانی کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ ملک چھوڑ کر جانے والے یہ سائنس دان چشمہ ایٹھی پادر پلانٹ میں کام کرتے تھے۔ ان میں سے ایک 1997ء، چھوٹ 2000ء اور دو سائنس دان 2002ء میں ملک سے باہر گئے۔ یہ سائنس دان کینیڈا، امریکہ اور آسٹریلیا میں آباد ہو گئے۔ ان سائنس دانوں نے یہ قدم کم معاوضے، طویل اوقات کار اور انتقامیہ کے ناروا سلوک کے باعث اٹھایا۔“

یہ ہے ہمارا سائنس اور سائنس دانوں کے بارے میں رویہ! ہم ان حقیقی انسانوں کو جو تمیں چالیں پچاس لاکھوں لوگوں کے بعد جنم لیتے ہیں اور قوم مل کر جن کی آبیاری کرتی ہے، ہم انہیں یوں ہرے میں سجا کر دوسرے ممالک کے حوالے کر رہے ہیں اور پھر پسمندگی، غربت اور جہالت کا شکوہ بھی کرتے ہیں۔ ہم کیا لوگ ہیں، ہم یہ بھی نہیں جانتے جو قومیں اپنا ٹیکنالوجی سنبھال سکتیں۔ اپنے دانشروں، اپنے سائنس دانوں اور اپنے پروفیسروں کی حفاظت نہیں کر سکتیں۔ اپنا ایاش اور اپنا دماغ نہیں بچا سکتیں ان قوموں کو قوم کہلانے کا کوئی حق نہیں ہوتا؟ پنجابی کی کہادت ہے جو لوگ اپنے بیٹے پال پوس کر لزکی والوں کے حوالے کر دیتے ہیں وہ بھی خوشحال نہیں ہوتے۔ جو قومیں ایسا کرتی ہیں۔ جو ملک اپنے بہترین دماغ دوسرے ملکوں کے حوالے کر دیتے ہیں وہ ملک بھی خوشحال نہیں ہوا کرتے، وہ ملک بھی ترقی اور عزت کا آہمان نہیں چھوڑ کرتے۔

حوالا کا پیغام

1991ء میں ابتداء ہوئی اور 1997ء میں کامیابی۔ سائنس دانوں نے تین بھیزیں لیں۔ ایک بھیز کے تحصیل سے خلیہ (سیل) حاصل کیا، دوسرا بھیز کے خلیے سے نیوکلیس نکالا اور اس کی جگہ پہلی بھیز کا نیوکلیس لگا دیا۔ سیل مکمل ہو گیا، اس سیل کو تمیری بھیز کے رحم میں رکھ دیا۔ سیل کی تموثروں ہو گئی یوں 24 فروری 1997ء کو پہلی کلومنڈ بھیز ڈالی پیدا ہوئی۔ ڈالی کی پیدائش نے سائنس کی دنیا میں تہذیکہ چاہ دیا، پہلی مرتبہ ثابت ہوا کسی جاندار کے ایک سیل سے اس جیسا دوسرا جاندار پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ڈالی نے بحث کے کئی دروازے کھول دیے۔ لوگوں نے کہا یہ نظام قدرت کے ساتھ مذاق ہے۔ دانشوروں نے کہا خدا کی قدرت کو چیخنے کیا گیا ہے، ادیب اور شاعر بولے جب انسان کی پیدائش کا ایک نظام موجود ہے تو پھر نئے سسٹم کی کیا ضرورت ہے۔ سائنس دانوں بولے یہ سائنس ہے، یہ دہلم ہے، وہ تحقیق اور وہ ایجاد ہے جس کا سلسلہ بھی رکا نہیں کرتا۔ اس بحث و مباحثے کے دورانِ ریلین موومنٹ (Raelian Movement) کے رہنماء ریل (Rael) نے فروری 1997ء میں کلومنڈ ٹی ایم کی بنیاد رکھ دی۔ اس کمپنی نے کلوونگ کے ذریعے انسان بنانے کا کام شروع کر دیا۔ 2001ء میں ریل نے یہ کمپنی ریل موومنٹ ہی کے ایک بچپ ڈاکٹر بریگٹھی بوئی سلیمانیز کے حوالے کر دی۔ ڈاکٹر بریگٹھی نے کمپنی کا نام اور جگہ بدی اور لیبارٹری میں انسان کی تخلیق شروع کر دی۔ یہ کوشش بار آور ثابت ہوئی اور 26 دسمبر 2002ء کو پہلی کلومنڈ بچی نے دنیا میں آنکھ کھولی۔ اس بچی کا نام ”حوالا“ تجویز کیا گیا۔

کلوونگ کیا ہے؟ یہ بڑا ولپپ م موضوع ہے۔ انسان کے جسم میں 14 کمرب خلیے ہیں۔ ہر خلیے میں زندگی کی تخلیق اور پیدائش کا پورا نظام موجود ہوتا ہے۔ سائنس دانوں نے سوچا، جب ایک خلیے میں پورا نظام موجود ہ تو پھر پیدائش کے فطری عمل کے بغیر انسان پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ انہوں نے ایک ہانجھہ عورت کے جسم سے تھورا سا گوشت کاٹا، اس سے خلیہ حاصل کیا۔ اس کے خاوند کے جسم سے بھی ایک سیل لیا۔ سیل سے نیوکلیس خارج کیا اور اس کی جگہ یہوی کے سیل کا نیوکلیس لگا دیا۔ کیمیائی عمل کا آغاز ہو گیا، سیل کی تقویم شروع ہو گئی۔ جب ایک سیل سے 16 نئے سیل بن گئے تو انہوں نے یہ خلیے ماں کے رحم میں منتقل کر

دیئے۔ یہ پنجی ڈالی بھیڑ کی طرح اپنی ماں کی کاربن کاپی ہو گی۔ اس کا پورا جسم سو فیصد ماں کی طرح ہو گا، اگر ماں کے عینچنے پر تسل ہو گا تو حوا کے عینچنے پر بھی تھیک اسی جگہ تسل کا نشان ہو گا۔ اگر ماں کے باہمیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں مسلسل سننا ہے تو ہوتی رہتی ہے تو حوا بھی پوری زندگی یہ سننا ہے محسوس کرتے رہے گی۔ حوا کے بال، ٹاک، کان، ہونٹ، آواز، قدم، وزن اور چال ڈھال سو فیصد ماں جیسی ہو گی۔ حد تو یہ ہے اس کی عمر بھی اپنی ماں جتنی ہو گی لیکن سوال یہ ہے کیا حوا بھی اپنی ماں جتنی ہی ذہین، حاضر جواب اور لائق ہو گی۔ سائنس دان سر دست اس سوال کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔

حوا کی پیدائش پر کلونیڈ کپنی نے دعوے کیے۔ اول اس "ایجاد" کے بعد ایڈز کے وہ تمام مریض جو مریض کی وجہ سے بچہ پیدا نہیں کر سکتے "ایڈز فری" بچے کے باپ بن سکتے گے۔ دوم یہ کپنی میں سال کے اندر لمبارڑی میں جوان انسان پیدا کرنے کی صلاحیت کر لے گی، یہ انسان پہلے دن ہی سے میں پچھس سال کا کڑیل جوان ہو گا پھر اس انسان میں یادداشت اور شخصیت منتقل کر دی جائے گی یوں وہ شخص جس کے سبیل سے یہ انسان بنایا جائے گا جب وہ فوت ہو گا تو ایک رات کی نیند کے بعد کلونیڈ شخص جاگ اٹھنے کا اور انہوں کر معمول کے کام شروع کر دے گا یوں "کلونیڈ" دنیا کو دامنی زندگی کا تحفہ دے گی، کپنی کا دعویٰ ہے اس عمل کے ذریعے ایک انسان ہزاروں سال تک زندہ رہ سکتا ہے۔ وہ اپنے سبیل سے اپنی کاپی بنائے، جب مرنے لگا تو اپنی یادداشت شخصیت، معاادات اور خصاکل اپنی کلونیڈ کاپی میں منتقل کروے، خود قبرستان پہنچا جائے اور دوسرے روز اس کی کاپی اس کے دفتر میں بیٹھ کر چیک سائن کرنا شروع کر دے، فائدوں پر اسی کی ہند رائٹنگ میں، اسی کے سماں میں ریمارکس لکھنے لگے۔ یوں دامنی زندگی کا انسانی خواب پورا ہو جائے گا۔ اس دامنی زندگی کا خواب جو دنیا بھر کے مذہب ہزاروں سال سے انسان کو دکھاتے چلے آ رہے ہیں۔

یہ ہے کلونیک اور اس کا ثارگٹ، اس نیکناں لوگی سے لائف شاک اور زراعت کی دنیا میں مجرزے برپا کئے ہو سکتے ہیں۔ آپ دنیا کی بہترین گندم کا صرف ایک سبیل لے کر چند ماہ میں لاکھوں ایکڑ گندم اگا سکتے ہیں۔ تمیں چالیس کلو روپہ دینی والی بھیس کو "کلون" کر کے ایسی ہزاروں بھیسیں بنائے ہیں۔ وہ چانور وہ پرندے اور وہ درخت جن کی سلیں ختم ہو رہی ہیں ان کو دوبارہ زندہ کر سکتے ہیں اور آپ دنیا سے دم توڑتی خوبصورتی اور کم ہوتی زندگی واپس لاسکتے ہیں۔ یہ سائنس کا کمال ہے، اس وقت پوری دنیا کلونیک کی اخلاقی، معاشرتی اور مذہبی حیثیت طے کرنے میں مصروف ہے۔ عالم اسلام بھی پوری طاقت سے کلونیک کو حرام، ناجائز اور غیر اخلاقی ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اس کوشش، اس مصروفیت کے باوجود دنیا کی پہلی کلونیک بھی "حوا" آنکھیں کھول چکی ہے، اس کے کان سن رہے ہیں اور زبان لائیں آوازوں کو لفظ بنا نے میں کوشش ہے۔ یہ پنجی ان تمام لوگوں کو پکار، پکار کر کہہ رہی ہے علم کسی کی میراث نہیں ہوتا۔ سائنس کسی کے گھر کی باندی اور تحقیق کسی کے حرم کی لوگوں کی نہیں ہوتی۔ یہ وہ لیلی ہے جو صرف مجتوں کا انتظار کرتی ہے اور اس کا مجتوں وہ

ہوتا ہے جو بڑھنے پا، خاک برسر، دریدہ دامن گلی گلی، قریہ قریہ سیلی، سیلی، سیلی پکارتا رہتا ہے۔ منحی حوا بُرگد تک لیئے خرگوش سے کہہ رہی ہے علم سونے والوں کو نصیب نہیں ہوا کرتا۔ یہ لیدبار نزی سے عالم اسلام کے لئے یہ پیغام لائی ہے جنہوں نے علم ترک کر دیا وہ آدم کے دور میں واپس چلے گئے اور جو علم کے ہو گئے انہیں قدرت نے انعام میں "حوا" دے دی۔



سورج نہیں ڈوباتے

کلون بھی "حوا" کی پیدائش سے فوری طور پر تین سوال سامنے آئے۔

چھ ارب لوگوں کی اس دنیا جس میں ایک ارب لوگ بے روزگار ہیں، 6 کروڑ لوگ ہاتھوں میں ڈگریاں لے کر توکریوں کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ 840 میں لوگ روزانہ بھوکے سوتے ہیں۔ ایک ارب 51 کروڑ لوگ خط غربت سے بچنے سک رہے ہیں۔ ایک ارب 30 کروڑ لوگ روزانہ ایک ڈالر کماتے ہیں۔ ایک ارب لوگوں کے سروں پر چمٹ نہیں، سولین لوگوں کا پورے گردہ ارض پر کوئی گھر نہیں، 2 کروڑ 179 لاکھ لوگ پناہ گزیں ہیں۔ ایک کروڑ 21 لاکھ زندہ انسان مہاجر ہیں اور 9 لاکھ لوگوں نے دوسرے ممالک میں سایی بناہ سے رکھی ہے۔ اس مصیبت، غربت، بے روزگاری اور بیماری کی ماری دنیا میں لیہاریوں میں انسان پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے، اس دنیا جس میں کم بچے خوشحال گھرانے کے نظرے لگ رہے ہیں، ملک کے ملک ہیں جن میں قانوناً دوسرا بچہ پیدا نہیں کیا جاسکتا، اس دنیا میں کلونگ کے ذریعے بچ پیدا کرنے کا تصور احتقار دکھائی نہیں دیتا؟ یہ سوال واقعی بہت دلچسپ ہے لیکن اس کا جواب اس سے کہیں کر زیادہ خوبصورت ہے۔ جدید اور سائنسی اتوام جاتی ہیں وہ کلونگ سے نسل انسانی کی کوئی خاص خدمت نہیں کر سکیں گی لیکن اس کے باوجود وہ کلونگ پر ریسرچ اور کامیابی کے ذریعے دنیا پر اپنی علم دوستی اور سائنس پرستی ثابت کرنا چاہتی ہیں۔ وہ جہالت کے گھنائوپ اندر ہیروں میں بھکنے والے ہم جیسے لوگوں کو یہ پیغام دینا چاہتی ہیں۔ "ہم لوگ جتنی توجہ دفاع اور صیانت پر دے رہے ہیں ہم علم اور سائنس سے بھی اتنی ہی محبت کرتے ہیں۔" اگر ہم کلونگ کو اس سوال کے ترازو میں تو لیں تو پھر ہمیں انسان کا چاند پر اترنا، مرخ پر زندگی کے آثار دریافت کرنا اور نئی نئی کہناؤں کی تلاش بھی فضول دکھائی دے گی کیونکہ ان دریافتوں سے بھی بتی نوع انسان کو کوئی فیض حاصل نہیں ہوا لیکن اگر ان تمام کوششوں کو ہم علم کی خورہ بین سے دیکھیں تو یہ ہمیں انسانی علم کی معراج دکھائی دیں گی۔ ہمیں انسان کی قدرت اور دستیں کا اندازہ ہو گا، اہل مغرب کلونگ کے ذریعے اپنا بھی عمل ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

دوسرा سوال بھی کم دلچسپ نہیں۔ سوال یہ ہے کہ فرض کرتے ہیں ہم آئین شائن کا ایک خلیہ کلون کر

کے نیا آئین شائن بنا لیتے ہیں، یہ آئین شائن دیکھنے، بولنے چالنے، اشخنے بیٹھنے اور کھانے پینے میں اصل آئین شائن کی کامپی ہو گا لیکن سوال یہ ہے یہ آئین شائن جتنا ہیں بھی ہو گا؟ شاید نہیں کیونکہ ذہانت شخصیت کا حصہ ہوتی ہے اور شخصیت حالات، واقعات، ماحول اور رفاقتوں سے جنم لیتی ہے۔ آپ آئین شائن کے طبیعے سے آئین شائن دکھائی دینے والا انسان تو بنا سکتے ہیں لیکن آئین شائن کا وہ سخت گیر باپ کہاں سے لا میں گے جس کے نقیاتی تشدد نے ایک کندہ ہن پچ کو اپنی ذات میں ڈوبنے اور ڈوب کر ابھرنے پر مجبور کر دیا تھا، آپ آئین شائن کی مہربان ماں کہاں سے لا میں گے، وہ سکول، وہ ہم جماعت، وہ استاد، وہ دوست، وہ کتابیں، وہ جذباتی حادثے اور محبت کرنے والی وہ یوں کہاں سے لا میں گے جس نے آئین شائن کو حقیقتاً آئین شائن بنایا، وہ ماحول، وہ وقت، وہ ایشور اور وہ مسائل کہاں سے لا میں گے جو قطرہ قطرہ آئین شائن کے ذہن پر پکتے رہے یہاں تک کہ انہوں نے ایک محبوب الحواس پروفسر کو دنیا کا نامور ساختہ دنیا دیا۔ سائنس دانوں اور سائنس کو آئین شائن بنانے سے پہلے وہ سارا ماحول، وہ جذباتی حادثے، وہ ماہنی اور وہ ایشور بھی "کلوں" کرنا پڑیں گے جنہوں نے آئین شائن کی ذات میں دائرے بنائے اور یہ دائرے پھیل پھیل کر آئین شائن کی محل اختیار کر گئے لہذا سر دست دنیا کو کلونیک سے کوئی خطرہ نہیں کیونکہ امریکہ اس کی مدد سے انسانوں کی فونو کا پیاس تو بنا لے گا لیکن ذہن لوگوں کی فونج تیار نہیں کر سکتے گا

اور میرا سوال ہے کلونیک کے سلسلے میں عالم اسلام کا ردیل کیا ہو گا؟ میرا خیال ہے اس ضمن میں ہمارا ری ایکشن وہی ہو گا جو چاند پر انسانی قدم بیٹھنے پر ہوا تھا۔ جو لوڈ پیکر، ریڈ یو، ٹیلی ویژن اور وہی سی آر کی ایجاد پر ظاہر ہوا تھا۔ ہم وہی لوگ ہیں جنہوں نے کبھی فٹ بال کا کھیل ناجائز قرار دے دیا تھا۔ جنہوں نے ریڈ یو کو شیطانی آ لے کا نام دیا تھا، جومیڈی یکل کی کتابوں تک میں چھپی تصاویر کو ناجائز کہتے تھے، جنہوں نے منی آرڈر کو جائز نہیں سمجھا تھا اور جنہوں نے لاوڈ پیکر کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن آج..... جی ہاں آج عالم اسلام ان "شیطانی" سہلوتوں کا سب سے بڑا خریدا ہے۔ ہم اپنی سابق روایات نجات ہوئے شروع شروع میں کلونیک جیسی اہم دریافت کو بھی تسلیم نہیں کریں گے لیکن جب یہ تکنیک گلی محلے تک پہنچ جائے گی اور عارف والا کی باخجہ عورتیں اور مرد اپنی کھوئیوں سے پچے "پیدا" کرنے لگیں گے تو پھر ہم لاوڈ پیکر، منی آرڈر اور فٹ بال کی طرح کلونیک کو بھی چپ چاپ مان لیں گے۔ ایک سوال یہ بھی ہے کہ ہم ایسے کیوں ہیں، یہ کلوں پچی "حوالہ" کا تیرا سوال ہے، وہ سوال جو عالم اسلام کے دربار میں شرف بازیابی کا منتظر ہے۔ جو "مل الہی" سے جیت جیت کر پوچھ رہا ہے "حضور آخر آپ لوگ چمگاؤروں کی طرح سورج کا کب تک انکار کرتے رہیں گے، کب تک پیاز کھانے کے لئے جو توں کے محتاج رہیں گے، علم مومن کی میراث ہوتا ہے۔ یہ تھیک ہے لیکن حضور اگر مومن علم کو دروازے ہی سے دھنکار دے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت علم کو "کافروں" کی دلیل سے دور نہیں رکھ سکتی۔ علم انہا بھکاری نہیں ہوتا کہ سوڈا کو پورا ہاتھی سمجھو بیٹھے، یہ روح اور جسم کی آنکھوں

سے نیکتا ہے اور روشنیوں میں پروان چڑھتا ہے۔ یہ لاپرواں سے روٹھ جاتا ہے اور طلب گاروں کے پیچے پھرتا ہے، یہ سوال جیخ جیخ کر پکار رہا ہے آنکھیں بند کرنے سے سورج نہیں ڈوباتے اور برساتیاں اورستے سے بارشیں نہیں تھام کرتیں، اگر تم دنیا کا مقابلہ کرنا چاہتے ہو تو پھر تمہیں اہل دنیا کی طرح سوچنا اور اہل دنیا کی طرح کرنا ہو گا۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا، اگر تم نے ایسا نہ سوچا تو پھر تم پیچے رہ جاؤ گے اور دنیا آگے نکل جائے گی کہ تانگے جہازوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔



سرزا

برہات پور کے مقام پر گوہر آراء بیگم نے جنم لیا۔ یہ متاز محل کی چودھویں اولاد تھی، مسلسل زچکیوں اور سفر کی صعوبتوں کے باعث ملکہ عالم علیل ہو گئیں۔ قائد رک گیا۔ شاہی طبیب حاضر ہوئے، جیتی سے قیمتی اور نایاب سے نایاب تر دو اخلاقی اُنیں ملکہ کی حالت بگزولی چلی گئی۔ یہاں تک کہ 7 جون 1631ء کو انہوں نے جان جان آفرین کے حوالے کر دی۔ شاہ جہان کی نظر میں یہ طوفان نوح کے بعد تاریخ کا سب سے بڑا سانحہ تھا۔ بادشاہ کی زندگی اندر ہیر ہو گئی۔ کثرت گریہ سے چشم شاہی کی روشنی مدھم پڑنے لگی۔ شدت فم سے غل بھانی کے تمام بال سفید ہو گئے۔ عورت ذات سے اس قدر نظرت ہوئی کہ زندگی کے باقی 35 سال مجرد گزار دیئے۔ غم کی انہیں لہروں میں بجٹے بجٹے ایک جن کے کنارے کے کنارے لکھ کر تویار آیا مکلاٹے شہنشاہ سے کوئی وحدہ بھی لیا تھا۔ اسی وقت تالی بجا کر مصاہبین جمع کئے اور دریا کے کنارے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "میں یہاں ایک ایسا مقبرہ بنانا چاہتا ہوں، دنیا میں جس کی کوئی نظر نہ ہو۔"

حکم شاہی تھا دنیا جہاں کے ماہر تعمیرات جمنا کے کنارے جمع ہوئے اور پھر دنیا کے اس عجوبے کی تعمیر شروع ہو گئی ہے وقت نے "تاج محل" کا نام دیا، تاج محل کی تعمیر میں کتنا وقت صرف ہوا، اس کے لئے پتھر کہاں سے آیا، پتھر کو کس کس نے کس کس طرح تراشنا، محل کی بنیادوں میں کتنے لوگوں کی ہڈیاں فن ہوئیں، اس کی کون کون سی دیوار، کتنی کتنی بار گرا کر بنائی گئی۔ یہ کہانی بذات خود ایک تاریخ ہے جو ظاہر ہے اس وقت ہمارا موضوع نہیں، ہمارا موضوع تو سویں کا حکمران تھا جب ہندوستان پر شاہ جہاں کا حکم اور حکومت چلتی تھی، تھیک اسی موسم میں اڈو لش بھی شاہی جرمی کی طرف لکھا جب شاہ جہاں نے نقارہ کوچ بجا یا، تھیک اسی میں کوئی اڈو لش نے بھی ایک بچی کو جنم دیا جب متاز محل کے ہلن سے گوہر آراء بیگم پیدا ہوئی۔ تھیک اسی میں کوئی اڈو لش بھی پیٹ میں پیپ پڑنے سے آنحضرتی ہو گئی جب متاز محل زچکی کی یوچیدگیوں سے انتقال کر گئی اور تھیک اسی لمحے اڈو لش بھی ہمت ہار گیا جب شاہ جہاں کے بال سفید ہو رہے تھے اور یہاںی موتی موتی بن کر بہرہ ہی تھی لیکن انہمارغم، جی ہاں غم کے انہمار کے لئے شاہ جہاں اور اڈو لش کے طریقے میں زمین آسمان کا فرق تھا، جب شاہ جہاں تاج محل کی تعمیر کے لئے تعمیرات کے ماہرین جمع کر رہا تھا تھیک اسی وقت اڈو لش

نے حکم دیا۔ ”شہروں کے ہر محلے، قصبوں کی ہر کمیونٹی اور دیہات کے ہر طبقے سے دو دو چست اور ڈین لڑکیاں لی جائیں، انہیں دارالحکومت لایا جائے اور انہیں دائیٰ کی فرینگ دی جائے، جب وہ خوب ماہر ہو جائیں تو انہیں واپس بھیج دیا جائے۔ یہ لڑکیاں مزید دو دو لڑکیوں کو فرینگ دیں اور پھر اس کے بعد اگر کسی گاؤں، کسی محلے، کسی شہر کے دس دس کوں میں کوئی عورت زچھی کے دوران مری تو دائیوں کی خبر ہے اور نہ لواحقین کی۔“

یہ فرق تھا ہم میں اور یورپ میں، جب ہمارے آباو اجداد محل تعمیر کر رہے تھے۔ یہ یوں کی قبروں پر آنسو بھار ہے تھے، ہاتھیوں کے منہ سے بکریوں کی آوازیں نکالنے کے حکم دے رہے تھے، راگ سے پانی میں آگ لگوار ہے تھے اور حکیموں کی فوجوں سے کشتہ ہوار ہے تھے تھیک اس وقت یورپ کے حکمران عوام کے لئے فلاج و بہبود کے منصوبے تیار کرا رہے تھے، نظام ترتیب دے رہے تھے۔ درس گاہیں تعمیر کر رہے تھے، کارخانے، فیکٹریاں، لیبارٹریاں اور لا بھریاں ہوار ہے تھے۔ یورپ کے حکمرانوں نے یہ سب کچھ ہم سے دیکھا، وہ جان گئے تھے قوموں کے عروج کی صرف چار وجہات ہوتی ہیں۔ انسانی فلاج پر مبنی سماجی نظام، بہترین نظام تعلیم، میکنا لوچی اور انصاف، وہ جان گئے تھے مسلمانوں کے پاس بہترین سماجی نظام ہے۔ وہاں گوراء، کالا اور عربی بھی برادر ہے، وہاں حکومت بوڑھے بچے، معذور، یوہ، یتیم اور مسافر کی کفیل ہے۔ وہاں خلیفہ اور خادم پاری باری اونٹ پر سوار ہوتے اہم نگیل کچھ تھے ہیں، وہ جان گئے تھے علم، اسلام کی بنیاد ہے، مسلمانوں کے پاس رصدہ ہیں ہیں۔ درس گاہیں اور لا بھریاں ہیں۔ ان کے پاس عام اور سائنس دان ہیں، وہ جان گئے تھے مسلمان میکنا لوچی میں بہت آگے ہیں۔ یہ فوارے لگاتے ہیں، یہ ریگستانوں میں اپنے گھر بھندے رکھتے ہیں، یہ آگ جلائے بغیر خیسے گرم کرتے ہیں، ان کے پاس تیرچیختے، قلعے توڑنے اور میلوں دور آگ لگانے کی میکنا لوچی ہے، یہ نقشے ہنا لیتے ہیں۔ دور بینوں سے دور تک دیکھ لیتے ہیں۔ یہ رنجوں کی بجائے گھوڑوں پر سفر کرتے ہیں اور ان کی تکواروں کو زنگ نہیں لگتا، وہ یہ جان گئے تھے انصاف ان کی سلطنت کا مرکزی ستون ہے، کوئی بھی شخص، کسی بھی وقت عدالت کا دروازہ کھلا سکتا ہے اور ظالم خلیفہ وقت ہو یا گنگو تسلی قاضی بغیر دیکھے، بغیر سوچے ظالم کے خلاف فیصلہ دے دیتا ہے لہذا اہل یورپ نے سوچا اگر ہم نے ان لوگوں کا مقابلہ کرنا ہے تو پھر ہمارے پاس ان سے بہتر سماجی نظام، ان سے بہتر علم، ان سے بہتر میکنا لوچی اور ان سے بہتر انصاف ہونا چاہیے۔ چنانچہ یورپ کے حکمرانوں نے ادارے بنانا شروع کر دیئے جبکہ ان کے مقابلے میں ہمارے حکمران انصاف میکنا لوچی، علم اور فلاج سے دور ہوتے چلے گئے، وہ حکم کو حکومت سمجھنے لگے، وہ خود کو زمین پر خدا کا سایہ کھلانے اور دین الہی ایجاد کرنے لگے جس کا یہ نتیجہ تکا عروج زوال ہو گیا اور زوال عروج پر جا پہنچا۔

کاش شاہ جہاں نے ہاج محل کی جگہ آکسخورڈ بنائی ہوتی تو آج یوروی لبو یوں تو رابورا کی چنانوں میں ضائع نہیں ہو رہا ہوتا۔ آج امریکی فوجی مسلمانوں کی نفعوں کو بغیر غسل، بغیر جنائز سے اور بغیر کفن اجتنابی

قبروں میں دفن نہ کر رہے ہوتے اور آج اسلام اور اسلام کے نام لیوا بیویوں منہ چھپا کرنہ پھر رہے ہوتے۔ یہ سمجھے ہے بزرگوں کی بولی فصلیں بچوں کو کاشنا پڑتی ہیں اور بچوں کی غلطیاں ان کے سچے بھکتتے ہیں، تو رابورا تاج محل کی فصل تھی اور ہماری غفلت ہماری ستی کے توارے بورے ہمارے بچے کا نہیں گے، رہا خدا تو خدا ڈھنپی کے مندرے میں بینخا ہو یا سیست پیش کی قربان گاہ پر، اس کا نام الیشور ہو، بیزمان، اہرمون، گاذیا اللہ وہ صرف اور صرف جانے والوں کا خدا ہوتا ہے، وہ سوچنے، سمجھنے اور عمل کرنے والوں کا نگہبان ہوتا ہے اور رہے مجھے تو وہ خوابوں میں جنم نہیں لیا کرتے، وہ حقیقتوں کی چنانوں میں ابھو کے تیشے اور پیشے کی کھاد سے کاشت ہوتے ہیں۔ ذرا سوچئے وہ خدا جس نے احمد کے نافرمانوں سے رعایت نہیں بر تی تھی وہ خدا ہمارے سرہانے کا میاں اور فتح کے تحال کیسے رکھدے گا!



Kashif Azad @ OneUrdu.com

نشیب

میں ایف ایس سی میں فل ہو گیا لیکن سعید نے پہلی پوزیشن حاصل کی۔ میں ادا تھا، سعید خوش۔ سعید کو خوش ہونا بھی چاہیے تھا، وہ بچپن سے ڈاکٹر بننا چاہتا تھا، والخلے کھلے تو پنجاب کے سب سے بڑے مینڈیکل کالج میں اس کا داخلہ ہو گا، میری لائنس تبدیل ہو گئی، میں سائنس سے آرٹس کی طرف آگیا، سعید سے رابطہ کم ہو گیا تاہم یہ خبریں ملیں ڈاکٹر بننا ہو گئی وہ محنت کر رہا ہے۔ اس کی پوزیشن اچھی ہے، وہ مینڈیکل میں بھی پہلی پوزیشن حاصل کرے گا وغیرہ وغیرہ۔ میں نے بی اے کیا، پھر ایم اے کر لیا، سعید بھی مینڈیکل کالج سے فارغ ہو گیا۔ لوگوں کا اس کے بارے میں اندازہ ٹھیک لکھا اس نے ایم بی بی ایس میں اور آل ٹاپ کیا تھا۔ اس نے ہاؤس چاپ شروع کر دی، میں صحافت کی جماعتی پر آگرا، ایک روز وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا "تمہارے پاس جملزم کی کتابیں ہیں۔" میں نے جیران ہو کر جواب دیا "یہ لیکن تم نے کیا کرنی ہے۔" ذرا سے دکھی لبھے میں بولا "میں سی ایس ایس کی تیاری کر رہا ہوں اس کے لئے چاہیے۔" میں پریشان ہو گیا، میں سعید کو اس وقت سے جانتا تھا جب وہ نیکر پہنچتا تھا، کتنے سے ڈرتا تھا اور برف کے گولے چوتھتا تھا۔ مجھے معلوم تھا جب بچے گلی ڈنڈا کھلتے تھے سعید اس وقت بھی ڈاکٹر بننا چاہتا تھا، اس کا اس فیلڈ میں بہت انٹرست تھا، ہم لوگ جب میڑک میں تھے تو اسے بازار میں دستیاب زیادہ تر دوائیوں کے سیکیل نام اور خواص از بر تھے۔ وہ انسانی اناٹومنی اور فزیوالوچی سے ٹھیک خاک واقف تھا۔ پھر یوں ڈاکٹر بن کر اچاک ایک سوائی کے زاویے پر مڑ جانا میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ میں نے اس تبدیلی کی وجہ جانتا چاہی تو وہ مزید ادا ہو کر بولا "دو مینے پہلے ہمارے محلے میں چوری ہوئی، پولیس شک میں میرے چھوٹے بھائی کو پکڑ کر لے گئی، میں اسے چھڑانے تھا نے گیا، مجھے دیکھ کر ایس ایچ اونے سامنے والی کرسی پر پاؤں رکھے، میں کھڑا رہا، وہ آم چوستا رہا، جب فارغ ہوا تو میں نے عرض کیا، میرا بھائی بے گناہ ہے اس پر حرم کریں، وہ بڑے تکبر سے بولا چور پکڑا جائے گا تو ہم اسے چھوڑ دیں گے۔" ڈاکٹر صاحب آپ گھر جا کر نیند کی گولی لیں اور آرام سے سو جائیں، میں گھر واپس آگیا۔ دو تین دن بعد میرا بھائی بھی آگیا لیکن میں سوچتا رہا اس ملک میں تو میرے پروفیشن، میری کوئی نیکیش کی کوئی عزت نہیں۔ یہاں کے تو معیار ہی دوسرے ہیں۔"

سعید کتابیں لے کر چلا گیا، اس نے سی ایس ایس کا امتحان دیا، کامیاب ہو گیا، اس نے پولیس سروس جوان کر لی۔ اب وہ ایک نہایت محنتی، دیانتدار اور فرض شناس افسر ہے۔ اس کی پوسٹنگ جہاں بھی ہوتی خلقت خدا نے جسمی پھیلا کر اس کو دعا میں دیں لیکن اس کے باوجود میں جانتا ہوں وہ اپنے کام سے پوری طرح مطمئن نہیں۔ وہ ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ "بائی تھجڑ" وہ ڈاکٹر ہے۔ قدرت نے اسے شفا بانٹنے کے لئے بھیجا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے بہترین سال اپنے اسی شوق، اپنے اسی پروفیشن میں کھو دیئے تھے۔ لہذا اگر وہ ایس پی کی بجائے فریشن یا سرجن ہوتا تو وہ انسانیت کی کہیں زیادہ خدمت کر سکتا تھا لیکن افسوس معاشرے کا عدم تحفظ، ظلم، زیادتی اور اپنے آپ کو محفوظ کرنے کی حرکت ایک ایسے انسان کو پولیس جیسے سنگاٹ شعبے میں لے گئی جو جلی ہوئی پیشانیوں پر ہاتھ رکھ کر سیاحائی کی تاثیر بانٹ سکتا تھا۔ سعید اس ملک کا واحد نوجوان نہیں ہر سال سی ایس ایس کے نتائج کا اعلان ہوتا ہے تو اس میں سانچھستر فیصلہ نوجوان ایسے ہوتے ہیں جنہوں نے میڈیکل، انجینئریگ، زراعت اور کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کی لیکن بعد ازاں وہ استنشت کشٹر اور اسے ایس پی بھرتی ہو گئے یا پھر کشم، اکم نیکس اور فارن سروس جوان کر لی۔ یہ سیدھا سادا ظلم ہے ان نوجوانوں کے ساتھ بھی، ان کے سابق شعبوں کے ساتھ بھی اور ان کی موجودہ توکریوں کے ساتھ بھی۔ خود سوچنے کیا ہم نے ایک ڈاکٹر کو طب کے پیٹے سے بٹا کر طب کے ساتھ ظلم نہیں کیا۔ ہم نے اس نوجوان کے ساتھ زیادتی نہیں کی جو خود کو پیدا کی طور پر ڈاکٹر سمجھتا تھا اور آخر میں کیا ہم نے پولیس کے ہاتھ کے ساتھ نا انصافی نہیں کی جسے ہم نے پولیس افسر کی بگد ایک سرجن، ایک فریشن دے دیا۔

چند روز پہلے میں نے خبر پڑی سفرل بورڈ آف ریونو نے فیصلہ کیا ہے آئندہ وہ سی ایس ایس میں کامیابی حاصل کرنے والے کسی ڈاکٹر، کسی انجینئر کو کشم، سلیز نیکس اور اکم نیکس گروپ میں تعینات نہیں کرے گا۔ ان مکملوں میں صرف ان نوجوانوں کو نوکری دی جائے گی جنہوں نے متعلقہ علوم میں ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ یہ ایک خوش آئندہ فیصلہ ہے۔ اگر اس فیصلے پر حقیقتاً عملدرآمد ہو گیا تو یہ اس ملک پر بہت بڑا حسن ہو گا۔ ریونو بورڈ اس فیصلے کے ذریعے میڈیکل اور انجینئریگ کے شعبوں کو بھی بے موت مرنے سے بچا لے گا اور خود بھی اس طویل اور تحکما دینے والی مشقت سے بچ لے گا جو اسے چھ سات سال تک باسیا لو جی، فریا لو جی، اتنا لو جی اور باسیو یک شری پڑھ کر آنے والوں کو جمع تغیریں سکھانے میں لگتی ہے، ہمارے جیسا غریب ملک ایک ڈاکٹر، ایک انجینئر کی تعلیم پر سانچھستر لاکھ روپے خرچ کرتا ہے لیکن جب وہ ملک اور عوام کی خدمت کے قابل ہو جاتا ہے تو اس کے شعبے سے بٹا کر تاکوں اور ڈاکوں پر لگا دیا جاتا ہے۔ یہ فلسفہ ہر ذی شعور کی عقل اور فہم سے بالاتر ہے لیکن بات پھر وہیں پر آرکتی ہے۔ ایک ڈاکٹر، ایک انجینئر، ایک پیچھارا پانچ پیشہ چھوڑ کر اکم نیکس، کشم اور پولیس جیسے بدنام اور مشکل شعبوں میں کیوں آتا ہے؟ وہ کون سی مجبوریاں ہیں جن سے مجبور ہو گر ایک شخص گرید سترہ کی نوکری چھوڑ کر محنت کرتا ہے، امتحان دیتا ہے اور پھر گرید سترہ ہی میں دوبارہ بھرتی ہو

جاتا ہے! بات سیدھی اور واضح ہے ہمارا معاشرہ اس حد تک گل سڑپکا ہے کہ ہم صرف اس کی عزت کرتے ہیں جو ہمیں نقصان پہنچانے کی زیادہ امیت رکھتا ہے، یہاں صرف صاحبان اقتدار، قوت اور طاقت کے مرکز کی عزت اور تو قیر ہوتی ہے لہذا تمام شعبوں کا بہترین ٹینکنٹ اس ایک نشیب، اس ایک جو ہر میں گرد رہا ہے جسے ہم یور و کریسی کہتے ہیں۔

اگر ہم اس ملک کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم اسے چلانا چاہتے ہیں تو ہمیں ایک اور فیصلہ بھی کرنا ہو گا۔ ہمیں تمام شعبوں، تمام اداروں کی عزت بحال کرنا ہو گی۔ انہیں ان کی تو قیر لوٹانا ہو گی۔ ہمیں ڈاکٹر کو اے ایس پی سے زیادہ عزت، زیادہ تو قیر دینا ہو گی، انجینئر کو کشمکش اور پکھرا کو اسنٹ کشنٹ سے زیادہ پروگر کوں زیادہ عزت دینا ہو گی درست ڈاکٹر سعید جیسے لوگ اسی طرح نشیب کی طرف بیٹھے رہیں گے۔ اس طرح گلے سڑے جو ہر دن کا حصہ بننے رہیں گے۔



میراث

میں 1972ء میں چار سال کا تھا جب والدین نے مجھے سکول داخل کر دیا۔ یہ میری اور میرے خاندان کی تاریخ کا حیران کرنے والا تھا۔ ہمارے خاندان میں اڑائی بھڑائی کی عمر تک پہنچنے سے پہلے بچے ڈھور ڈنگر سنبھالتے اور مرغیاں چوری کرتے تھے۔ میں اس جہالت میں تبدیلی کا پہلا شرارہ ثابت ہوا۔ ہم لوگ گاؤں سے شہر آگئے، میرے بعد ایک ایک کر کے خاندان کے تمام بچے سکول جانے لگے۔ 80ء کی دہائی تک پہنچ کر پورے خاندان کا کلچر بدلتا گیا۔ زندگی اور معاشرے کی وہ ساری نعمتیں ہماری دسترس میں آگئیں جن کا ہم ستر کی دہائی میں تصور نہیں کر سکتے تھے۔ میرے والد آج اسلام آباد میں بینہ کر ماضی کے بارے میں سوچتے ہیں تو وہ بے اختیار کہہ اسختے ہیں علم کی طرف اٹھے ایک قدم نے ہماری زندگیاں بدلتے ہیں۔ شروع شروع میں مجھے ان سے اختلاف تھا۔ میرا خیال تھا ہمارے خاندان کی ترقی میں ہم تو جوانوں کی تعلیم سے زیادہ ہمارے بزرگوں کی محنت اور کوششوں کا علم دخل ہے۔ وہ محنت نہ کرتے، دن رات کام نہ کرتے تو ہم آج گاؤں میں بھی نہیں نہلا رہے ہوتے یا پھر رسگیری کے جرم میں کسی جمل میں پڑے ہوتے لیکن جب مجھے دوسرے خاندانوں کے مطالعے کا موقع ملا تو میں اپنے والد کی فراست کا قائل ہو گیا۔ مجھے یقین آگیا جس خاندان نے علم کی دلیل پر قدم رکھ دیا، اس کی نسلیں بدلتیں گے۔

یہ بات، یہ تجزیہ صرف خاندانوں اور کنبوں تک محدود نہیں۔ نسل انسانی کی تاریخ میں جس قوم نے علم کو اپنی میراث بنایا اس نے دوسری اقوام پر غلبہ پالیا۔ جاپان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ دوسری جگہ عظیم کے بعد جاپانیوں نے سوچا، ہمارے پاس اتنی بھم ہو جاتا تو ہم یوں بتاہت ہوتے۔ انہوں نے فیصلہ کیا ہمیں اتنی بن بناتا چاہیے؟ لیکن پھر سوچا یہ بھم تو اب ساری دنیا بنا سکتی ہے لہذا انہوں نے ایک ایسا بھم بنانے کا فیصلہ کیا جو کوئی دوسرا ملک، کوئی دوسری قوم نہیں بن سکتی تھی۔ انہوں نے پوری قوم کو سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں وکھلیل دیا۔ یہ نوجوان تعلیمی اداروں سے نکلتا تو جاپان ایک ایسا معاشری یہم بن چکا تھا جو پھر تو دنیا کی تمام بڑی مارکیٹیں جاہ ہو گئیں۔ چین نے بھی جاپانی ماذل پر عمل کیا، مجھے جتاب فخر امام نے ایک بار بتایا تھا یہ بگ یونیورسٹی میں 11 ہزار طالب علم ہیں جبکہ انہیں پڑھانے کے لئے تین ہزار پروفیسر ہیں۔ ملائیشیا علم کے مخفرے کی تازہ ترین مثال ہے۔ مہاتیر نے ہزاروں نوجوان امریکی یونیورسٹیوں میں داخل کرائے پھر انہیں ملائیشیا پا

کراemer کی شینڈر رز کے مطابق تنخوا ہیں دس اور پھر ان نوجوانوں نے فاقہ زدہ بکری کو ایشیان نا سیگر ہنا دیا۔ رہا یورپ! یہ تو پیدا ہی درس گا ہوں کے لئے سے ہوا تھا لہذا فرد ہوں، خاندان یا قومیں جس نے سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں، لائبریریوں اور لیہاریزوں کو نصب اٹھنے ہنا لیا عزت، عروج اور اختیار تثیب میں بنتے پانی کی طرح اس کے قدموں میں آپڑا۔

پاکستان کا بھی یہی الیہ، یہی مسئلہ ہے۔ ہم ابھی تک غاروں، نعروں اور تکواروں کے دور میں زندہ ہیں۔ ہم جھوٹی پھیلاؤ کر مجرموں کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اللہ علم کی شکل میں اپنا سب سے بڑا مجرم دنیا میں اتار چکا ہے جس نے اپنے صحن میں اس مجرمے کی پیغامی لگائی اسے پھل بھی ملا، سایہ بھی اور اللہ کی رحمت بھی اور جو اس مجرمے کی افادیت سے بے بہرہ رہا وہ اللہ تعالیٰ کی محبوب قوم ہونے کے باوجود بھی چین میں مارا گیا، بھی دہلی میں اور بھی فلسطین، بغداد اور تورابورا میں۔ ہمارے پاس ایمان ہے، جذبہ ہے، جان قربان کر دینے کی تڑپ ہے۔ اگر نہیں ہے تو تعلیم نہیں ہے جیکنالو جی نہیں ہے لہذا ہم دنیا میں مغلوب ہو کر رہ گئے ہیں۔ میں تاریخ سے مسلمانوں کے عروج کی وجہ پوچھا کرتا تھا مجھے پلو ٹارک سے فردوسی تک یہی بتایا کرتے تھے جب تک مدرسے سائنسدان، طبیب اور فلسفی پیدا کرتے رہے، ہم غالب رہے۔ میں پھر پوچھتا تھا، عالم اسلام اب پستی اور کمزوری کا کیوں شکار ہے؟ "جواب آتا تھا، مدرسوں نے انجینئر، طبیب اور سماں دان پیدا کرنے بندر کر دیئے" میں سوچا کرتا تھا جس دن ہمارے مدرسوں نے مولوی کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر عبدالقدیر پیدا کرنے شروع کر دیئے، ہم دوبارہ غالب آ جائیں گے، میں پھر اپنے آپ سے پوچھا کرتا تھا "کیا یہ مجرمہ میری زندگی میں ظہور پذیر ہو گا؟" مجھے اس تفتیش، اس "کیا" کا کوئی جواب نہیں ملتا تھا لیکن پچھلے بفتح مجھے "کیا" کا جواب مل گیا۔

پچھلے بفتح مجھے اوپر تک تین بڑے تعلیمی اداروں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ادارہ علوم اسلامی اسلام آباد، جامعہ العلوم الاسلامیہ الفریدیہ اسلام آباد اور صفحہ سیویز سکول کراچی۔ میں یہ ادارے دیکھ کر حیران رہ گیا، یہ تینوں ادارے علماء کرام چلا رہے ہیں اور ان میں دین کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے جدید ترین علوم بھی پڑھاتے جاتے ہیں۔ ادارہ علوم اسلامی میں ہزار کے قریب طالب علم حفظ کے بعد جدید تعلیم پا رہے ہیں اور پچھلے تین چار برسوں سے اس کے طالب علم پنڈی بورڈ میں پوزیشنیں لے رہے ہیں۔ جامعہ العلوم الاسلامیہ میں دو ہزار ایک سو طالب علم پڑھ رہے ہیں۔ مجھے ان طالب علموں کی انگریزی اور سائنس کی استطاعت نے مہبوبت کر دیا اور صفحہ سیویز سکول نے تو کمال ہی کر دیا۔ ان لوگوں نے اے اور اویوں کا اسلامی سسیس تیار کیا ہے۔ آپ یقین کیجئے اتنی شاندار عمارت، اتنا صاف ستھرا ماحول اور اتنا جدید سکول میں نے زندگی میں نہیں دیکھا۔ یہ تینوں ادارے عمومی تعاون سے چل رہے ہیں اور انہیں علماء کرام چلا رہے ہیں۔ ان اداروں کے مشاہدے کے بعد میں نے سوچا کہ تمام مدرسے جابر بن حیان، بوعلی سینا اور ابن رشد کی اساس کی طرف پلٹ

جا سکیں تو کمال ہو جائے۔ اس وقت صرف پنجاب کے آٹھ بڑے شہروں لاہور، گوجرانوالہ، راولپنڈی، فیصل آباد، سرگودھا، ملتان، ڈیگی خان اور بھاولپور میں 2 ہزار 5 سو 95 بڑے مدرسے ہیں جن میں 2 لاکھ 52 ہزار ایک سو 25 طالب علم پڑھ رہے ہیں۔ ذرا تصور کیجئے اگر یہ 2 ہزار 5 سو 95 مدرسے جدید علوم کے سکول، کالج اور یونیورسٹیاں بن جائیں اور ان سے ایک ایسی نسل نکل کر معاشرے میں آنے لگے جس کے ہونتوں پر قرآن اور پاتحہ میں کمیونٹر ہو۔ جو لا بصریوں اور لیبارٹریوں کی پروردہ ہو اور جس کی زندگی کا ایک ای مقصد ہو، ہم نے علم، سائنس اور معاشرے کو ایک ایک نئی ایجاد دینی ہے تو سوچنے ہماری کیا پوزیشن ہوگی۔ آنے والے وقت میں ہم کتنی بڑی طاقت، کتنی بڑی قوت ہوں گے۔

یقین کیجئے بخدا ہو، طرابلس ہو یا رملہ، تو را بورا ہو، قلعہ جنگی یا پھر شہر غان ان سب کا ایک اسی پیغام ہے جذب، ایمان اور سچائی بڑی قوت ہوتی ہے لیکن اگر اس قوت کو سائنس اور نیکنا لو جی کا سہارا نہ ملے تو یہ قوموں کو اجتماعی قبریں تو دے سکتی ہے مگر عروج اور غلبہ نہیں، علم موہن کی کھوکھی ہوئی میراث ہے ہم جب تک یہ میراث واپس نہیں لیتے یقین کیجئے ہم کفن بنتے اور قبریں کھودتے رہیں گے ہم یونہی مجنزوں اور کرشموں کا انتظار کرتے رہیں گے۔

کوئی مشکل نہیں

کوئی امریکی جنت میں پھر رہا تھا، اہل فردوں کو شدید غصہ آیا، انہوں نے امریکی کو روک کر پوچھا "تم بے دین، خدا کے احکامات کے منکر، تمہارا بیہاں کیا کام۔" امریکی نے کہا ہے اپنے کائے، چشم درست کیا اور مسکرا کر بولا "ہوں میں دوزخی لیکن جنت کا کمپیوٹر تھیک کرنے آیا ہوں۔" ہو سکتا ہے آپ میں سے زیادہ تر خواتین و حضرات اس واقعے کو جوک سمجھ کر بہت پڑیں، کچھ زندہ دل حضرات قہقہہ بھی داغ دیں لیکن اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو میں اسے ایک جیج، ایک آہ اور ایک نوحہ قرار دوں گا۔ یہ نوحہ یہ آہ اور یہ جیج اس وقت پورے عالم اسلام کے حق سے ابل رہی ہے، ہمای تعلیم، ہمای سائنس اور ہماری علمی جدوجہد کا یہ عالم ہے کہ آج کافروں کے بناۓ ساؤنڈ سسٹم کے بغیر اہل ایمان اذان تک نہیں دے سکتے۔ کافروں کی بنای گھروں کے بغیر نماز کے وقت کا تعین نہیں کر سکتے کافروں کی بنای مورشوں اور پیشوں کے بغیر وصولیں کر سکتے اور کافروں کے بنای میشیوں اور ان میشیوں کے کاتے ہوئے کپڑے کے بغیر ستر نہیں ڈھانپ سکتے گویا تمام مسلم ہمالک کے تمام مسلمان شہریوں کی زندگی اس ان کی صحبتیں، ان کی شامیں، ان کی نشست، ان کی برخاست، ان کا قیام اور ان کا طعام سب کا سب بے دین اور احکامات خداوندی کے منکر کافروں کا مرہون منت ہے۔ وہ لوگ جو نو تھے پیش نہیں بنا سکتے، جو داڑھی کا حساب اور دانتوں کا خالال تک یورپ، امریکی اور جاپانی کپنیوں کا خریدتے ہیں اور جو قربانی کے جانور تک کافر قوموں کی بنای چھربیوں سے ذبح کرتے ہیں۔ ان کی جنت میں اگر امریکی پھر رہا ہو تو اچنہبے کی کیا بات ہے۔ یہ زوال، اسے کہتے ہیں پستی۔

یہ پستی، یہ زوال پوری مسلم امد نے خرید کر پالا پوسا اور جوان کیا، عالم یہ ہے 156 اسلامی ہمالک میں نوکل 380 یو نیورسٹیاں ہیں جن میں سے ایک بھی ایسی نہیں ہے جسے ہم ہائیل برگ، آکسفورڈ، بیکرج یا برلن کے سامنے کھڑا کر سکیں، جسے ہم تعلیمی ادارہ کہہ سکیں جبکہ اس کے برعکس صرف جاپان میں ایک ہزار یو نیورسٹیاں ہیں، پاکستان ہے اسلامی دنیا کا سپہ سالار ہونے کا اعزاز ہے اس میں اب (سرکاری اور پرائیوریٹ ملک) 57 یو نیورسٹیاں ہیں۔ اس کے مقابلے میں صرف ٹوکیو شہر میں اعلیٰ تعلیم کے ایک سو تیرہ ادارے ہیں، ان 57 یو نیورسٹیوں کا بھی معیار یہ ہے کہ ان کے استاد اعلیٰ تعلیم کے لئے اپالائی کرتے ہیں تو

انٹری شٹ میں فیل ہو جاتے ہیں۔ پاکستان کے سب سے بڑے اور پرانے ادارے پنجاب یونیورسٹی کی مثال ہیں۔ 1998ء میں ایشیاء کی اعلیٰ یونیورسٹیوں میں اس کی 34 ویں پوزیشن تھی ایک سال بعد یہ مزید 22 درجے گزر کر 61 ویں پوزیشن پر آگئی۔ پوری مسلم دنیا کا یہ عالم ہے 56 ممالک سائنس اور تکنیکا لوگوں پر سال میں جتنے پہنچ رکھتے ہیں اس سے بارہ گنا زیادہ مواد صرف ہوئن شہر میں چھپتا ہے۔ لہذا پھر اس کا یہی نتیجہ لکھنا تھا کہ آج مسلم ممالک تک نکلنے کے لئے غیر ملکی کمپنیوں کے محتاج ہیں، انہیں اپنی اونٹیوں کو خارش سے بچانے کے لئے آسٹریلیا، ماہرین کی مدد لیتا پڑتی ہے انہیں کبھی صاف کرنے اور آب زم زم کی مقدار بڑھانے کے لئے کافروں کی خدمات حاصل کرتا پڑتی ہیں۔

یورپ، امریکہ اور مشرق بعید کے ممالک نے یہ کمال، یہ درجہ کیسے حاصل کیا؟ ظاہر ہے تعلیم اور تعلیمی انقلاب سے، بھارت ہم سے کیوں آگے ہے؟ ظاہر ہے تعلیم اور تعلیمی انقلاب سے اور جاپان اور چین پچاس برس میں یورپ اور امریکہ کے سامنے پورے قد سے کیسے کفرزا ہو گیا؟ ظاہر ہے یہ مجرہ بھی تعلیم اور تعلیمی انقلاب ہی سے ظہور پذیر ہوا اور اب اگر مسلم دنیا بھی اس درجے پر فائز ہونا چاہتی ہے تو وہ کیا کرے؟ ظاہر ہے یہ کرشمہ بھی تعلیم اور تعلیمی انقلاب کے ذریعے ہی ممکن ہو گا اور اگر پاکستان بھی دم توڑتی معيشت، آخری پچھلی لینتی صنعت اور سائنس گنتی رکھا رکھتی رکھتی زندگی دینا چاہتا ہے تو وہ کیسے دے گا؟ بھراں کے گرداب سے نکل کر ترقی، خود اعتمادی اور خودداری کے جزویں پر کیسے پہنچو؟ ظاہر ہے ان کا بھی ایک اسی ذریعہ، ایک ہی وسیلا ہے تعلیم اور تعلیمی انقلاب اور ہمارے پاس اس وسیلے اور اس ذریعے کے لئے وقت ہے اور وہ ہی پیسہ، یہ ہماری ترجیحات، ہمارے ایجادے کا حصہ ہی نہیں، اس سال کے بجٹ میں بھی تعلیم کے لئے جو رقم مختص کی گئی وہ ایک آبدوز کی قیمت کے برابر ہے ذرا سوچنے کیا اس رقم سے پوری قوم کا مقدر بدلا جا سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں اس مجرمے اس کرٹے کے لئے تو ہمیں سری لنکا کی طرح سوچنا پڑے گایا پھر مصری انقلابیوں کی طرح۔ سری لنکا کی حکومت نے دہائیوں قبل تعلیم کو پہلی ترجیح بنا لیا لہذا آج سری لنکا میں یہ صورت حال ہے بھائی ریاض بتاتے ہیں وہاں کے بھکاری تک فٹ پاتھ پر لیٹ کر اخبار پڑھ رہے ہوتے ہیں اور رہا صرتو جب 1952ء میں انور سادات، عبد الناصر اور عبد الحکیم نے عامر شاہ کا تحکم ادا کر دیا اور وہ حکمران بننے تو انہوں نے ملک میں تعلیمی انقلاب کا اعلان کر دیا، ان لوگوں نے شاہ کی پر اپرٹی اور اپاٹی پیچ کر ستر میلیں پاؤ نہ جمع کئے، ملک سے جا گیرداری نظام ختم کر کے سرمایہ اکٹھا کیا اور پھر یہ سارا پیسہ تعلیم پر لگا دیا، اس دور میں مصر کے اندر دو، دو دن میں تمیں نئے سکول کھولے گئے مورخ کہتے ہیں مصر میں ایک سال کے اندر جتنے سکول کھلے اتنے پچھلے 70 برسوں میں قائم نہیں ہوئے تھے۔ گویہ انقلاب اس تعلیمی نظام کو یورپ اور امریکہ کے برابر تونہ لا سکا لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے آج مسلم دنیا کو جتنے اچھے دماغ اور پڑھنے لکھنے لوگ دے رہی ہے اس میں مصر کا حصہ سے زیادہ ہے۔

اب سوال یہ ہے جب سری لٹکا جیسے ملک کے لئے یہ سب کچھ ممکن ہے تو پاکستان یہ کیوں نہیں کر سکتا۔ جب مصر کے انقلابی، وہاں کے آمر، وہاں کے فوجی حکمران ایک تباہ حال اور اخلاقی گراڈ کے شکار معاشرے میں قعیمی انقلاب لا سکتے ہیں تو ہمارے حکمران، ہمارے انقلابی کیوں نہیں لا سکتے؟ لا سکتے ہیں، یہ بھی کر سکتے ہیں، پورے ملک میں ہزاروں لاکھوں سکول، کالج اور یونیورسٹیاں ہنا سکتے ہیں ان یونیورسٹیوں، کالجوں اور سکولوں میں دنیا کے بہترین ٹیکنالوجی آپیاری کر سکتے ہیں لیکن اس کے لئے ایک ”ولی“ ایک قوت ارادی چاہیے، اخلاص اور قوم کو قوم بنانے، ملک کو ملک بنانے کا جذبہ چاہیے جو ظاہر ہے ہمارے آج کے حکمرانوں میں ہے اور نہ ہی کل کے حکمرانوں میں تھا۔ اگر آج بھی حکومت تہبیہ کر لے تو وسائل کی کوئی کمی نہیں، حکومت صرف احتساب یہ یورپ کی ریکورڈوں کا پیسہ تعلیم پر لگادے تو قوم جہالت کے اندر ہیرے سے نکل کر علم کی روشنی میں آ سکتی ہے لیکن یہ کون کرے گا، وہ لوگ کریں گے جو اس ملک کا بجٹ تک اردو میں نہیں ہنا سکتے۔



وہ خاک ہو کر بکھر گئے

مورخین اب عراق کی تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کریں گے، قدیم عراق جو صدیوں تک، نسلوں تک ذہن انسانی پر نقش رہا اور جس کی بنیادوں سے علوم و فنون کے مینار اٹھے اور جدید عراق جوش کے ہاتھوں تاریخ ہوا اور جس کی راکھ دنیا کے چہرے پر عبرت کی طرح مل دی گئی۔ قدیم عراق سائنس و میانالوجی، علم و فن اور فکر و فلسفہ کی کوکھ تھا۔ یہی وہ خط تھا جس پر انسان نے پہلا پہرہ بنایا، یہ پہیہ لکڑی کے بڑے بڑے تختوں کے نیچے جوڑا گیا اور پھر ان تختوں کے آگے نیل بامدھ دیئے گئے اور یہ دنیا کی پہلی گاڑی تھی، انسان نے آنے والے وقت میں اسی گاڑی کو دنیا کی پہلی بکتر بند، پہلے ٹینک اور پہلی توپ کی شل دی اور بیش کی طرح فاتح عالم کہلایا، دنیا کے پہلے "بیش" کا تعلق بھی عراق سے تھا۔ دنیا کا پہلا مل بھی عراق ہی کی سر زمین پر بنا۔ تصویری رسم الخطا تحریری قوانین اور حکومتی نظام نے بھی اسی سر زمین پر جنم لیا، ریاضتی کی بیانات بھی اسی ملک میں رکھی گئی، علم بحوم بھی عراقوں ہی کی مہربانی تھا، دنیا کی پہلی یونیورسٹی بھی عراق ہی میں قائم ہوئی۔ یہی وہ سر زمین تھی جس پر چھماق سے آگ جلانی گئی، تابے کا پہلا برتن بھی اسی ملک میں بنایا گیا۔ انجینئرنگ کا پہلا ڈھانچہ، پہلا ڈیزائن بھی یہیں ترتیب دیا گیا۔ دنیا کی پہلی زرعی جنتی بھی اسی زمین پر بنائی گئی، تحریر یعنی لکھائی کی بنیاد بھی یہیں رکھی گئی، زراعت کا علم بھی اسی زمین کی مہربانی ہے۔ دنیا کا پہلا کل بھی یہیں ہنا، دنیا کی پہلی تہذیب کا اعزاز بھی عراق ہی کو حاصل ہے، اس تہذیب کو سر کہا جاتا تھا۔ دنیا کا پہلا قید خانہ، پہلا تحاشہ اور پہلی عدالت بھی اسی سر زمین پر بنائی گئی۔ دنیا کی پہلی فوج، پہلا شکر بھی عراق ہی میں ترتیب پایا، دنیا کی پہلی قابض حکومت، پہلا مارشل لا بھی عراق ہی میں لگا، ڈاک کا نظام بھی عراقوں ہی کی دین ہے، فن معماری اور آب پاشی کا نظام بھی انہیں لوگوں نے جنم دیا۔ دنیا کا پہلا دارالترجمہ بھی عراق ہی میں قائم ہوا۔ دنیا کے پہلے بیت الحکمت کی بنیاد بھی خلیفہ مامون الرشید نے اسی سر زمین پر رکھی۔ دنیا کا پہلا ہسپتال بھی اسی ملک میں بنایا گیا۔ پانی کو نشیب سے بلندی تک پہنچانے کا پہلا نظام بھی عراقوں ہی نے وضع کیا۔ وائرس پانی سٹم بھی انہی لوگوں کی دین تھا اور دنیا کی پہلی لا بھریری بھی اہل عراق ہی نے قائم کی۔

یہ قدیم عراق تھا، اُسل انسانی کے عروج کی تاریخ، علوم و فنون کی بنیاد کا تذکرہ اور انسانی فکر اور بشری تدبیر کا شاہکار عراق۔ یہ عراق تاریخ کی گرد میں گم ہو گیا۔ وقت کی دھول میں کھو گیا اور اب ایک عراق ہمارے

سامنے پڑا ہے۔ زخمی، سوتہ اور مزدہ عراق، وہ عراق جو بیش اور نوئی بلیز کی بربریت کا نوجہ بن کر نسل انسانی کے ذہنوں پر دستک دے رہا ہے۔ جس کی لفظ آج ہر زندہ شخص کی چونکھ پر دھری ہے۔ جو ہر جاگے ذہن کی سوچوں کا دامن پکڑے کھڑا ہے۔ یہ آج کا عراق ہے، کل کے عراق اور آج کے عراق میں کیا فرق ہے؟ یہ وہ سوال ہے جو آنے والے ذہنوں کو پریشان کرے گا! اس فرق کا نام علم ہے۔ اسے سائنس کہتے ہیں، اسے بینالوجی پکارا جاتا ہے، کبھی وہ وقت تھا علم دنیا بھر کے انسانوں کو سرزیں عراق کی طرف یوں کھینچتا تھا جیسے مقناطیس اوابے کو، مخاس مکھی کو اور جیسے کنوں پیاسے کو، اس دور میں عرق دنیا کے لئے باور دھا۔ کبیر، آکسفورد اور ہائیڈل برگ تھا، دنیا کے بہترین تیر، انہائی چکدار تکواریں اور دور تک پھینکے جانے والے بھائے یہاں بنتے تھے۔ عراقی زرہ بکتر، عراقی خود اور عراق کے جگلی گھوڑے پوری دنیا میں مشہور تھے۔ فرائیں مصراپنے لئے بیگمات شام اور بیانی عراق سے منتخب کرتے تھے۔ دنیا نے لشکر سازی کافن عراقیوں سے سیکھا، عراقی سپاہیوں نے تین برابع ٹھوٹوں کو ملٹری اکیڈمیاں دیں، یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے بتایا برلن بنانے والا لوہا اسلحہ سازی میں استعمال نہیں ہو سکتا ہے۔ یہی وہ بیدار مغزاں انسان تھے جنہوں نے تاریخ میں پہلی بار تکوار پر زبر لگایا۔ جنہوں نے زہر میں بچھے تیر بنائے اور جنہوں نے آگ کو بطور اسلحہ استعمال کیا لیکن پھر علم عراق سے لندن منتقل ہو گیا۔ وہ بغداد سے واشنگٹن اور موسول سے نیوارک چال گیا۔ مومن ہے اس کی بیانات چھین گئی الہذا عراق آگ، دھوئیں اور نعشوں کا جنگل بن گیا۔ میں نے کل ٹیلی ویژن پر صدام حسین کا مجسم گرتا دیکھا۔ یہ مجسم صدام حسین نہیں تھا۔ یہ علم، دانش، فن اور بینالوجی تھی جسے اہل عراق نے درس گاہوں سے نکالا، اس کا مجسمہ بنایا، اسے شہر کے وسط میں نصب کیا اور فراموش کر دیا۔ ہم 20 دن عراق پر آگ برستے دیکھتے رہے لیکن ہم نے ایک لمحے کے لئے نہ سوچا، یہ وہی آگ ہے جو عراق کے باشندے نے چھماق سے جلائی، جس کے موجود عراقی تھے اور جسے پہلے بار عراقیوں ہی نے بطور اسلحہ استعمال کیا تھا، پھر وہ تھبیر گئے، وہ جود کا تکار ہو گئے لیکن بیش اور بلیز نے اس بینالوجی، اس تکنیک کو صنعت کا درجہ دے دیا۔ انہوں نے اسے سائنس، اسے بینالوجی بنا کر اسی انسان کے سر پر لا پھینکا جو چھماق کو دنیا کا سب سے بڑا کمال سمجھ رہا تھا۔

عراق کا دھواں آج پوری دنیا کے غافل انسانوں کو جیخ جیخ کرتا رہا ہے جس نے علم کو ترک کر دیا وہ بغداد بن کر رہ گیا، وہ لمحہ کر لیا گیا۔ بغداد کے ملبے میں دبی لفٹیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں، اگر عراق میں صدام حسین کے 13 محلات کی جگہ 13 یونیورسٹیاں ہوتیں، 13 بڑی تجربے گا ہیں اور بینالوجی کے 13 بڑے ادارے ہوتے تو آج بغداد سے جنہوں کی آوازیں نہ آتیں، آج دنیا کے ایک ارب 45 کروڑ مسلمانوں کے سر اپنے سینوں پر نہ جھکے ہوتے، آج کا بغداد کہہ رہا ہے جو لوگ اپنی آگ خود نہیں جلا سکتے وہ دھواں بن کر اڑ گئے، وہ خاک ہو کر بکھر گئے۔

فصل

انقلاب روس تک اویپوں کا زمانہ تھا۔ اس دور میں پٹنکن، گوگول، لمنوف، ترکنیف دوستوفسکی، ٹالشائی، چیخوف اور گور کی کا طوطی بولتا تھا یہ لوگ پورے روس کے لئے روپ ماذل تھے۔ ہر روپی نوجوان عنوون اشباب میں داخل ہوتے تھیں بڑھاتا، قبوے کی پیالے چڑھاتا، پاپ میں گھٹایا بد بودار تباہ کو بھرتا اور گور کی اور ٹالشائی کے لبجے میں انسانی لش کی باریکیوں پر گفتگو شروع کر دیتا۔ جب شالن نے سوویت یونین کی بنیاد رکھی تو اسے محسوس ہوا روس میں ادیب اور شاعر تو کروزوں ہیں لیکن سائنس دان کوئی نہیں۔ چنانچہ اس نے فوری طور پر سائنس کے طالب علموں، پروفیسروں اور سائنس دانوں کے لئے مراعات کا علان کر دیا۔ انہیں معاشرے میں بعض ایسی رعایتیں دیں جو روپی میں کسی دوسرے شعبے کی روپے عہدیدار کو حاصل نہیں تھیں، مثلاً آپ معاوضے ہی کو لجھے۔ شالن نے سائنس دانوں اور سائنس پڑھانے والے اساتذہ کی تحریکوں میں سات گناہ اضافہ کر دیا۔ اس کا یہ نتیجہ تکلا وہ نوجوان جو کبھی ادیب بننے کے لئے ملک کے کونے کونے سے ماں کو کے قہوہ کانوں میں آتے تھے وہ اب کا جلوں، یونیورسٹیوں اور لیہاریوں کا رخ کرنے لگے۔ لہذا پھر وقت نے تابت کیا وہ روپی جو جوتوں پر موی کاغذ چڑھا کر گھروں سے نکلتے تھے چند ہی سالوں میں دنیا کی جدید ترین سائنسی قوم بن گئے۔

شالن کا یہ ماذل روس سے یورپ کے دوسرے ممالک اور وہاں سے امریکہ گیا اور انہوں نے بھی اپنے ممالک میں سائنس کے طالب علموں کو خصوصی مراعات دیتی شروع کر دیں۔ وہ لوگ بھی اسی نتیجے پر پہنچ گئے جب تک معاشرے کا بہترین ٹیکنیک دوسرا مدرس کے شعبے میں نہیں آتا، استاد بننا لوگوں کی پہلی ترجیح نہیں بنتی اس وقت تک ملک میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آ سکتی، قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ یورپ کے متعدد ممالک نے اپنے اساتذہ بالخصوص اسٹنٹ پروفیسروں، ایسوی ایٹ پروفیسروں اور فلپروفیسروں کو وہ عزت اور وہ تو قیردی جو اس معاشرے کے کسی دوسرے شخص، عہدیدار یا پیشے کو حاصل نہیں تھی لہذا آج بھی یورپ کے کئی ایسے ممالک ہیں جن کی عدالتوں میں اگر کسی پروفیسر کو پیش ہوتا پڑے تو اسے کفر عدالت میں کری پیش کی جاتی ہے، اگر کوئی پروفیسر ریکٹ کے اصولوں کی خلاف ورزی کر بیٹھے تو وہ معاشرہ جس میں باوشا ہوں،

مکاؤں، شہزادیوں، صدرروں اور وزیر اعظموں کے چالان ہوتے ہیں وہاں صرف اتنا کہنے پر "میں پروفیسر ہوں" سارچست سلیوٹ کر کے واپس چلا جاتا ہے۔ امریکہ میں آج بھی کوئی پروفیسر صدر سے ملاقات کی درخواست کرے تو صدر اولین فرصت میں اسے وقت دیتا ہے۔ رہا معاوضہ تو ابھی تھوڑی بدلت پہلے ہی جنین نے اپنے سائنس والنوں اور سائنس کے پروفیسروں کی تنخواہوں میں چودہ گنا اضافہ کیا، یوں وہ پروفیسر یا پی ایچ ڈی ڈاکٹر جو پہلے دس ہزار ڈالر لیتا تھا وہ اب ایک لاکھ چالیس ہزار ڈالر لے رہا ہے۔ جتنی میں پروفیسروں کے پاس باقاعدہ فنڈز ہوتے ہیں، ان کی اپنی لیہاریاں، سیکلریٹ اور لاہبریاں ہوتی ہیں۔ پورے یورپ، امریکہ اور مشرق بعید میں پروفیسر ریناڑیں ہوتے، اگر انہیں اپنا انتظامی عہدہ چھوڑنا پڑے تو بھی ان کا دفتر، عملہ اور انتظامی اخراجات کا ایک مناسب حصہ برقرار رہتا ہے۔ انہیں یہ سہوتیں موت تک ملتی رہتی ہیں۔

ہم بھی پاکستان میں سائنسی انتخابی لانا چاہتے ہیں، ہمارے دوست ڈاکٹر عطا الرحمن دن رات اس کام میں جتے ہوئے ہیں۔ ہم نے سائنس کے لئے فنڈز بھی پیدا کر لئے ہیں۔ ہم نے دنیا کی جدید ترین سائنس "بائیو میکنالوجی" کا الگ شعبہ بنایا، ڈاکٹر انور نیم کو اس کا سربراہ بھی بنادیا لیکن اصل مسئلے کی طرف ہم نے ابھی تک توجہ نہیں دی۔ وہ مسئلہ ہے اساتذہ جب یونیورسٹیوں میں سائنس کے اچھے پیچھے نیچے نہیں ہوں گے تو اچھے سائنس وال ان کہاں سے آئیں گے، جب سائنس والنوں کو اچھے معاوضے اور معاشرے میں عزت نہیں ملے گی تو باصلاحیت نوجوان اس شعبے میں کیوں آئیں گے۔ ذرا غور کیجئے جس معاشرے میں پروفیسروں کی یہ عزت ہو کہ لوگ ہر محلہ کو پروفیسر کہتے ہوں جس معاشرے میں ہر اس شخص کو جو شہنشاہ کرے، بغیر استری کے کپڑے پہنے، دانت صاف نہ کرے، طویل اور فضول گفتگو کا ماہر ہو اور عینک لگا کر عینک تلاش کرتا رہتا ہو لوگ اسے پروفیسر کہتے ہیں۔ جس معاشرے میں طوطا فال، عامل، جعلی پامٹ، ان پڑھنجومی، سستی اور کمزوری کی دو ایسیں بنائے، محبوب آپ کے قدموں میں جیسے تعویز لکھتے اور نوٹ دو گئے کرنے والے جادوگر پروفیسر کہلاتے ہیں اس معاشرے میں سمجھدار اور باصلاحیت لوگ سائنس زان کیوں نہیں گے؟ شاید یہی بے تو قیری، یہی معاشرتی رویہ ہے جس کے باعث ہمارا بہترین یونیورسٹی سائنس اور سائنس کی تدریس کا رخ نہیں کرتا، ہمارے ذہین طالب علم ایف ایس سی کے بعد میڈیکل اور انجینئرنگ کی طرف چلے جاتے ہیں۔ ان سے کم ذہین بیلی ایس سی اور ایم ایس سی کر کے نوکری کر لیتے ہیں، باقی رہ جانے والے پڑھانا شروع کر دیتے ہیں۔ سکارش پر پی ایچ ڈی کرتے ہیں اور باقی زندگی اونچ کر گزار دیتے ہیں۔

انسان دنیا میں دو وجہات کے لئے کام کرتا ہے عزت کے لئے اور معاوضے کے لئے اور ہم دنیا کے اہم ترین اور حساس ترین شعبوں کو معاوضہ دے رہے ہیں اور نہ ہی عزت لیکن ساتھ ہی ہم چاہتے ہیں ہمارا شمار دنیا کی جدید اقوام میں ہونے لگے یہ کیسے ممکن ہے؟ ہمارے دوست ڈاکٹر عطا الرحمن کو اس پر بھی

توجہ دینا پڑے گی۔ حکومت آج تمام سائنس دانوں اور پروفیسروں کو دلائکھ روپے مامانہ تجوہ دینے کا اعلان کرے، ایسے قوانین بنائے جن کے تحت معاشرے میں پروفیسروں اور سائنس دانوں کی توقیر میں اضافہ ہو تو کل ہی دیکھ لجھنے نوجوان فوج اور پولیس میں جانے کی بجائے سائنس دان بن رہے ہوں گے، کالجوں میں پڑھار ہے ہوں، آپ آج اعلان کر دیں آئندہ کسی پروفیسر اور پی ایچ ڈی ڈاکٹر کو پولیس نہیں پکڑے گی، پروفیسر کی بے عزتی کرنے والا سات سال کے لئے اندر ہو جائے گا، پروفیسروں کو ٹکس کی چھوٹ ہے اور پی ایچ ڈی ڈاکٹروں کو ہر چیز آدمی قیمت پر ملے گی تو کل ہی دیکھ لجھنے لاکھوں لوگ پی ایچ ڈی کر رہے ہوں گے اسیں ایسیں جیسے امتحان دے کر کالجوں میں پڑھانے کے لئے آرہے ہوں گے۔

ہمارے علاقوں میں لوگ کہتے ہیں بھینسوں کا دودھ لینے کے لئے کٹوں (بھینس کے صاحزادے) کو خوش رکھنا ضروری ہوتا ہے اور زمین کے نازخے اٹھانے والے ہی اچھی فصل لیا کرتے ہیں۔



غمڈے، لشیرے، ڈاکو

اسلام آباد میں میرے ایک استاد ہیں، آپ انہی ڈاکٹر دانش کہہ لیں۔ ڈاکٹر صاحب کی عمر ستر برس سے زائد ہے ان ستر برسوں میں انہوں نے 50 برس تعلیم و تالیف میں گزارے۔ ان کے شاگردوں کا دارہ پوری دنیا پر محیط ہے۔ مورث ہیں، ماہر آثار قدیمہ ہیں، دانشور ہیں، مفکر ہیں اور سب سے بڑھ کر ایک ایسے روشن انسان ہیں جو اب صرف کتابوں اور تذکروں میں ملتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا زیادہ وقت تحقیق اور تالیف میں گزرتا ہے۔ وہ اپنے کام میں اس قدر منہمک رجتے ہیں کہ ان کے پاس میل ملاپ اور گفت و شنید کے لئے بھی وقت نہیں ہوتا۔ میں بھی انہیں زیادہ تک شکر نہیں کرتا لیکن ان کی مجبوی سمجھنے کے باوجود بھی کبحار ان سے ملنے کے لئے بے تاب ہو جاتا ہے، ڈاکٹر صاحب میری مقیدت سے واقف ہیں لہذا انہوں نے میرے ساتھ ایک سمجھوتہ کر رکھا ہے وہ جب بھی صر سے باہر جانا چاہتے ہیں تو انہیں کمر سے لے جائے اور واپس لانے کی سعادت مجھے حاصل ہوتی ہے۔ اس آمد و رفت کے دوران میں ان کی صحبت سے خوب روشنی حاصل کرتا ہوں۔

دو تین ماہ پہلے کی بات ہے کنوش سنٹر میں ایک کافرنس تھی، ڈاکٹر صاحب نے اس میں پہنچ پڑھنا تھا۔ میں نے معمول کے مطابق انہیں گھر سے لیا اور کنوش سنٹر آگیا، ڈاکٹر صاحب عمر رسیدہ ہونے کے باعث زیادہ نہیں چل سکتے۔ اس دن ان کی طبیعت بھی کچھ خراب تھی لہذا میں نے سوچا اگر میں انہیں کنوش سنٹر کے گیٹ پر اتار کر گاڑی پارک کرنے گیا اور وہاں سے دس منت چل کر ان کے پاس آیا تو وہ اتنی دریگری میں کھڑے رہیں گے چنانچہ میں گاڑی گیٹ کے بالکل سامنے وی آئی پی پارکنگ میں لے گیا۔ بھی میں ڈاکٹر صاحب کے لئے دروازہ کھول ہی رہا تھا کہ ایک کاشیبل دوڑتا ہوا آیا اور اپنی بار عرب آواز میں بولا "سریہ وی آئی پی پارکنگ ہے آپ یہاں گاڑی کھڑی نہیں کر سکتے۔" میں نے اسے بتایا یہ پروفیسر ہیں، بوڑھے ہیں، زیادہ دریکھزے رہ سکتے ہیں اور نہ چل سکتے ہیں۔ آڈنری پارکنگ بہت دور ہے لہذا آپ مہربانی فرمائ کر جیسے گاڑی کھڑی کرنے کی اجازت دے دیں، ویسے بھی پارکنگ خالی ہے لیکن کاشیبل نے ہر ہی رعنوت نے جواب دیا "صاحب تمیں اجازت نہیں، آپ کو گاڑی یہاں سے بہٹانا ہوگی۔" اس کے یہ الفاظ سن کر میرا غصہ فطری تھا لیکن میرے جواب دینے سے بیشتر ڈاکٹر صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے خاموش رہنے کی ہدایت کی

اور خود کا نشیل سے مغدرت کرتے ہوئے بولے "بینا آپ تھیک کہہ رہے ہیں، ہم ابھی گاڑی ہٹان لیتے ہیں۔" ڈاکٹر صاحب کا کہنا میرے لئے حکم کا درجہ رکھنا تھا جتنا پیسے نے گاڑی ٹکالی۔ انہیں گیٹ پر اتار اور اپنی گاڑی آڈنری پارکنگ میں کھڑی کے کے بھاگتا ہوا ان کے پاس آیا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اندر ہال میں لے گیا۔ ہم اس ہال میں دو گھنٹے رہے، میں ان دو گھنٹوں کے دوران اس وی آئی پی ٹکر کے بارے میں سوچتا رہا جو پروفیسر صاحب جیسے عظیم انسان کو اشرافیہ کی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کرنے نہیں دیتا لیکن بالآخر، جاہل اور گرپت ارکان اسکلی کے استقبال کے لئے گھنٹوں دروازے پر کھڑا رہتا ہے، شاید دوسرے لائعداد اعزازات کے ساتھ ساتھ یہ اعزاز بھی ہمارے ہی سے آیا ہے۔

میں گزشتہ کئی برسوں سے یورپ، امریکہ، کینیڈا اور مشرق بعید کے ترقی یافتہ ممالک کی ترقی کی وجہات ملاش کر رہا ہوں، مجھے اب تک ایک بھی ایسا ملک نہیں ملا جو اپنے اہل علم کی توقیر کے بغیر معاشری، سماجی اور اخلاقی عروج پر پہنچا ہو۔ امریکہ کی مثال یہ، امریکہ میں صرف تمدن قسم کے لوگوں کو وی آئی پی شیش دیا جاتا ہے۔ پہلے نمبر پر مغدور آتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی گاڑیاں سرکاری عمارت کے پورچھ میں کھڑی کر سکتے ہیں۔ انہیں سڑک پر بھی بعض مراعات حاصل ہیں۔ ان کے بعد سائنس دان ہیں اور پھر استاد۔ ان کا استقبال سرکاری اور بھی اداروں کے سربراہان گیٹ پر کرتے ہیں، انہیں خصوصی نشستیں دی جاتی ہیں۔ آخر میں رہے ارکان پائیٹ اور وزراء تو انہیں ایسی کوتا ہیوں پر بھی مددات طلب کر لیا جاتا ہے جن پر عام شہریوں کو قیمتوار انکار دے کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یورپ میں بھی کچھ ایسی ہی صورت حال ہے، مجھے انکل شیم انور بیگ بتا رہے تھے فرانسیسی عدالتون میں یمنز یونیورسٹی پر محض (ڈاکٹر پروفیسر) اور میڈیا یکل کالج میں پڑھانے والے کارز کے سوا کسی کو کسی پیش نہیں کیا جاتی، برطانیہ میں اگر ملکہ کے سامنے مذاقایوں کی فہرست رکھی جائے اور وزیر اعظم اور یونیورسٹی پروفیسر میں سے کسی ایک کا تعین کرنا پڑے تو وہ فوراً پروفیسر سے ملنا پسند کرے گی، سو یہاں میں ریل اور بس کے سفر کے دوران کسی کے لئے نہ شست خالی کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے لیکن اگر کسی استاد کو جگہ دی جائے تو اس حرکت کو انتہائی بد اخلاقی قرار دیا جاتا ہے۔ جاپان میں پولیس کو کسی استاد کی گرفتاری سے پہلے حکومت سے خصوصی اجازت لینا پڑتی ہے جبکہ کوریا میں کوئی بھی استاد اپنا رکارڈ روکھا کر ان تمام سہولتوں سے لطف انداز ہو سکتا ہے جن سے ہمارے ملک میں صرف وزراء، ایم این اے، سینیٹر اور ایم پی اے حضرات بہرہ مند ہوتے ہیں۔

آج کی صورت حال چھوڑیں، آپ پاکستان کے وی آئی پی ٹکر کی 52 سالہ تاریخ اٹھا کر دیکھیں۔ آپ کو اس میں انگوٹھا چھاپ ارکان پاریٹ، اربوں روپے کے ناوہندگان، کھربوں روپے ہڑپ کرنے والے حکمران اور انغواد، قتل، ڈکیتوں اور آبرور ہیوں جیسے اخلاقی جرائم میں ملوث سیاستدان تو ملیں گے لیکن آپ کو اس میں پٹرس بخاری، ان۔ م۔ راشد، صوفی تبسم، صادقین، ایم ڈی تاشیر، ڈاکٹر سید عبداللہ، سیم الزمان صدیقی اور پروفیسر دانی جیسی نابغہ روزگاری خانہ نظر نہیں آئیں گی۔ آپ انہیں ہمیشہ سینکڑ کا اس کے مسافر خانوں اور آڈنری

وینگ رومز میں پائیں گے یا پھر انہیں عام شہروں کی پارکنگ سے کافرنس روم کی طرف آتے جاتے دیکھیں گے اور اگر کبھی غلطی سے ان میں سے کوئی وہی آئی پی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر دے تو اس سے وہی سلوک ہو گا جو ہندو برہمن غریب مسلمانوں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔

یہ کیسے وہی آئی پی ہیں اور یہ کیا کچھ ہے جس میں ڈاکٹر دانش جیسے لوگوں کی تو ٹنچائش نہیں لیکن معاشی، آئینی اور اخلاقی مجموعوں کے لئے کریاں بھی ہیں، الگ لاونچ بھی اور پارکنگ بھی۔

میرا خیال ہے، ہمارے انحطاط کی بڑی وجہ اہل علم و دانش کی بے توقیری بھی ہے کیونکہ جن معاشروں میں عالم کی عزت اور ستاد کی حرمت پامال ہو جاتی ہے ان میں صرف غنڈے، لیبرے اور ڈاکو ہی پیدا ہوتے ہیں، معاشی جس اور سماجی گھنٹن ہی اس کا انشا ہوتی ہے۔



جس آج کا کل نہیں ہوتا

وہ بروکلین میں کپاس کے کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ وہ کون تھے، وہ کہاں سے آئے تھے اور ان کا مستقبل کیا تھا، وہ نہیں جانتے تھے۔ وہ جانتے تھے تو بس اتنا کہ وہ کالے ہیں۔ نسلوں پہلے افریقہ کے کسی ملک میں رہتے تھے، غلاموں کے کسی تاجر کے بھنے چڑھے، ان کے بزرگوں کو باندھا گیا، بھری جہاز میں پھینکا گیا اور یہاں لا کر اٹار دیا گیا۔ کپاس کے کھیتوں میں کام کرے کرتے ان کی سات سلیں مرکب گئیں۔ مزید کتنی نسلوں نے کھینا تھا، وہ نہیں جانتے تھے۔ ایک روز کپاس چنتے چنتے ایک مریلی عورت نے سرخا کراپنے خاوند سے کہا ”ہم اپنے چھوٹے بچے کو سکول نہ داخل کر دیں۔“ فاقوں کا مارا مزدور خاموش رہا، بچے کو سکول داخل کر دیا گیا، سکول جانے والا یہ بچہ ایلیکس ہیلے کا والد تھا۔ اس ایلیکس ہیلے کا والد جس کے ناول ”روں“ نے پوری دنیا میں جھیلک دیا۔ کاؤں کی زندگی پر جی اس ناول واقعیتی اور حقیقتی ادب کی تاریخ میں سب سے زیادہ بکنے والی کتاب کا درج حاصل ہے۔ ایلیکس ہیلے کا والد چند جماعتیں پڑھ سکا لیکن اس نے اپنی ماں کا مشن جاری رکھا۔ اس نے ایلیکس کو کالج تک تعلیم دلائی جب ”روں“ محبوبیت کی انتہا تک پہنچا تو کسی نے ایلیکس ہیلے سے پوچھا ”تمہاری زندگی کا حریت انگیز واقعہ کیا ہے؟“ اس نے پس کر جواب دیا ”سکول! اگر ہماری بستی میں سکول نہ کھلتا، سکول میں تعلیم مت نہ ہوتی، میری دادی مجھ کام پر جاتے ہوئے سکول کے سامنے سے نہ گزرتی، میرا والد بھرا تے شرماتے ہوئے سکول میں قدم نہ رکھتا تو میں بھی آج کسی کھیت میں کپاس چن رہا ہوتا۔“

ایلیکس ہیلے ہی نہیں دنیا کے بے شمار نامور لوگ ایسے ہی اتفاقات کے ذریعے سکول پہنچے اور پھر انہوں نے دنیا بدل دی۔ نیلسن منڈیا بھی اسی ہی مثال ہیں۔ وہ ساؤ تھے افریقہ کے پیمانہ ترین گاؤں ”تونو“ میں گدھے چڑا تھا۔ اس کے خاندانی دوست جارخ نے اس کی والدہ کو بتایا ”تمہارا بچہ ذیں ہے، اسے سکول داخل کر دو“ نیلسن منڈیا سکول جانے کے لئے نکلا تو اس کے پاس پتوں نہیں تھی، اس کے والد نے اپنی پتوں کھننوں تک کاٹ کر اسے پہنا دی۔ وہ نو سال کی عمر میں بیتیم ہو گیا۔ تھے کیز ویٹی کے منصب دار جانگن تابانے اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ نیلسن منڈیا منصب دار کے بچوں کے ساتھ سکول جانے لگ۔ یہ وہ

اتفاق تھا جس نے آگے چل کر ساؤ تھا افریقہ کو آزادی دلائی۔ اگر تو نہ میں سکول نہ ہوتا۔ سکول میں تعلیم مفت نہ ہوتی تو شاید ساؤ تھا افریقہ ابھی تک غلام ہوتا۔ خود ہمارے قائد اعظم بھی اسکی ہی مثال ہیں، وہ تجارت کے لئے لندن گئے، کار و بار نہ چل سکا، لیکن ان میں داخلے لیا، بار ایٹ لا کیا۔ کار و بار کی وہ ناکامی پاکستان کے قیام کی بنیاد بن گئی، یقین سمجھنے دنیا کے ہر انقلاب، ہر ایجاد، ہر تہذیب اور ہر تغیر کے پیچھے کوئی نہ کوئی سکول، کوئی نہ کوئی کالج اور کوئی نہ کوئی یونیورسٹی ہے۔ آپ تاریخ پاکستان سے علی گڑھ کو خارج کر دیں۔ سندھ مدرسہ الاسلام اور اسلامیہ کالج نکال دیں تو تاریخ پیچتی ہے اور نہ علی تحریک۔ یورپ، امریکہ اور مشرق بعید تو ہیں ہی سکولوں اور کالجوں کے زندہ محبزے، میں نے برطانیہ کے کسی ماہر تعلیم کا مضمون پڑھا تھا۔ اس نے لکھا تھا ٹیلنٹ ہمیشہ ہڑے شہروں سے دور پیدا ہوتا ہے لہذا صرف وہ ملک ترقی کرتے ہیں جن کے دور دراز علاقوں، دیہات اور پسمندہ آبادیوں میں اپنے سکول اور کالج ہوتے ہیں۔ آپ یورپ جائیں امریکہ چلے جائیں، آپ جوں جوں ہڑے شہروں سے باہر نکلیں گے آپ کو اچھی سے اچھی یونیورسٹیاں، کالج اور سکول دکھانی دیں گے۔ کسی سکول میں چلے جائیں آپ کو وزیر اعظم اور عام نیکی ڈرائیور کا بچا ایک ہی شینڈر کی تعلیم پاتا ملے گا اور تعلیم بھی مفت۔ میں ناروے گیا تو معلوم ہوا پورے ملک کے سکولوں، کالجوں میں نہ صرف مفت تعلیم دی جاتی ہے بلکہ بچوں کو دو دھن، بچل اور رائج بھی کرایا جاتا ہے۔ میں ایک گاؤں میں آگئیں میں نے ہاں جو سکول دیکھا وہ اوسلو شہر کے سکولوں سے اچھا تھا۔ ڈن مارک کے ایک گاؤں میں بھی کوپن یکن شہر کے بچے ملے۔ میں نے وجد پوچھی تو معلوم ہوا، بعض ڈینش والدین بہتر تربیت اور رسمیاری تعلیم کے لئے اپنے بچوں کو دیہاتی سکول میں بھجوادیتے ہیں۔ اس کے بعد آپ پاکستان کا جائزہ لیں۔ دیہات تو بڑی دور کی بات ہیں آپ کو شہروں میں بھی اچھے سکول نہیں ملیں گے۔

ایک وقت تھا اچھی اور درمیانی تعلیم میں صرف انگریزی کا فرق تھا، سرکاری سکول اردو میڈیم شہری پیدا کرتے تھے اور پرائیوریٹ سکول انگلش میڈیم، سرکاری سکولوں کے طالب علم کالجوں اور یونیورسٹیوں میں رو دھوکر یہ فرق مٹا دیتے تھے لیکن اب انگریزی کے ساتھ انفارمیشن نیکنا اور جی بھی شامل ہو چکی ہے۔ ایک غریب دیہاتی بچہ کسی نہ کسی طرح انگریزی کی خانی پر تو قابو پالیتا ہے لیکن وہ کپیوٹر اور کپیوٹر کی تعلیم کے لئے پیسے کہاں سے لائے۔ یہ بچے، یہ نوجوان ابھی کپیوٹر کو غم اور غصے وے دیکھ رہے تھے کہ حکومت نے ان کے سروں پر ڈی نیشنائزیشن کا بم بھی چلا دیا۔ ذرا سوچنے جو تعلیم شہر کے مدل کلاس طالب علم کی دسترس سے باہر ہے اس تک ایک دیہاتی بچہ کیسے پہنچ سکتا ہے۔ وہ پینڈو بچہ جو ذہانت میں کسی طرح آئیں شائیں، برٹر ہنڈرسل، برناڑشا، ایلکس ہیلے اور نیلس منڈیل سے کم نہیں، جو برطانوی ماہر تعلیم کے مطابق "ٹیلنٹ کے ہب" میں رہتا ہے۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھئے آپ کے اس ملک کے وہ ستر فیصد دیہاتی بچے اپنے بنیادی حق سے محروم نہیں ہو جائیں گے؟

ہو سکتا ہے حکومت معاشری کمزوری کا رو تاروئے لیکن یہاں ہم اس کی توجہ ان سات ارب ڈالروں کی جانب مبذول کرتے ہیں جن کا ڈھنڈو راشوکت عزیز پیٹ رہے ہیں۔ اگر ہم ان مالیاتی ذخائر میں سے ایک آدھ بیٹھن ڈال رہی تعلیم پر لگاؤں تو ہم اس ملک کے دیہات میں فنا ہوتا ٹیکنٹ چاکتے ہیں۔ اگر یہ ممکن نہیں تو ہم مصر کی روایت پر عمل کر سکتے ہیں۔ 1952ء میں جب مصری انقلاب آیا تو سادات اور جمال عبدالناصر نے شاہ فاروق کی ساری جائیداد بیچ کر رقم تعلیم پر لگا دی تھی، احتساب کے ذریعے بھی جو سرمایہ حاصل ہوا اس سے سکول قائم کئے گئے، ہم یہ نہیں کر سکتے تو کم از کم یہ قانون ہی بنا دیں کہ آج کے بعد قومی احتساب یوردو کی تمام وصولیاں تعلیم پر خرچ کی جائیں گی، اس رقم سے پاکستان کے دور دراز علاقوں، دیہاتوں اور گاؤں میں جدید ترین تعلیمی ادارے بنائے جائیں گے، ننگے پاؤں پھر تے آئیں ستائنوں اور گدھے اور نیل چرات نیشن مینڈیلوں کو ترقی کے دھارے میں شامل کیا جائے گا۔ آخر یہ بچے ہمارا کل ہیں اور یہ حقیقت ہے جس آج کا کل نہیں ہوتا وہ آج شام کے اندر ہیروں میں ڈوب کر فنا ہو جاتا ہے۔



ڈرامہ 2001ء

گاڑی اشارے پر رُک گئی، دور دور تک برف پڑی تھی، یہ اسلام آباد کی تاریخی ٹالہ باری تھی۔ مردکیں، فت پاتھو، دکانیں، گھروں کی دلیزوں اور مکانوں کی چیزوں سفید ہو گئی تھیں۔ شاید چارائی برف تھی یا پھر پائی چجائی۔ ہم ٹالہ باری کے دوران رکے رہے، پلازے کے برآمدے میں کھڑے ہو کر ہم نے آسان سے برسی برف کا نظارہ کیا، طوفان تھا تو گھر واپس چل پڑے۔ میں نے پہلے اپنے دوست کو گھر چھوڑتا تھا اور اس کے بعد خود واپس جانا تھا۔ شاہراہ فیصل برف میں دفن ہو چکی تھی، ڈرائیور میں احتیاط اور چستی درکار تھی۔ باہر شدید سردی تھی ”درجہ حراث منی ہو چکا ہے“ میرے دوست نے ہاتھ بغلوں میں دبا کر انکشاف فرمایا، میں نے ہتھ تیز کر دیا۔ شرور، شرور کی آواز سے گرم ہوا تھا رے قدموں میں گرنے لگی۔ میں بلسو ایڑلے کی بڑی سڑک پر ہو گیا۔ سامنے پارلیٹ ہاؤس تک برف ہی برف تھی۔ گاڑیاں چیزوں کی طرح ریکٹ رہی تھیں، آگے اشارہ بند تھا، ہم سیونٹھ ایونٹس کے اشارے پر رُک گئے۔ میں سامنے دیکھ رہا تھا لیکن میرا دوست کھڑکی کے شیشے پر انگلی پھیسر کر پھول ہنا رہا تھا اور پھر ان پھولوں میں سے باہر جھانکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اچانک گاڑیوں کے ہجوم میں سے ایک سایہ لکلا، برف پر چلتا ہوا ہماری گاڑی کے قریب پہنچا اور اپنی شہادت کی انگلی سے شیشے پر دستک دینے لگا۔ میرے دوست کے منہ سے بچ لکل گئی لیکن میں بنس پڑا۔

یہ ایک بھکاری تھا۔ میں اسے پچھلے دو سال سے اسی چوک پر دیکھ رہا تھا۔ یہ بڑی استاد قسم کی چیز تھی۔ گرمیوں میں جب اسلام آباد کی ہر چیز دھواں دینے لگتی ہے، مردکوں کی تارکوں تک بننے لگتی ہے تو میں نے اسے کھوٹی دوپھروں میں اس اشارے پر نگلے پاؤں بھیک مانگتے دیکھا۔ سردیوں کی بخ راتوں میں جب سانس تک مخدود ہو جاتی ہے، میں نے اسے اکثر پہنچی قیص، کاشن کی شلوار اور سلپروں میں اسی اشارے پر گاڑیوں کے شیشے بجاتے دیکھا۔ میں اسے ”ڈرامہ 2001ء“ کہتا تھا۔ سننے والے مجھے ڈائٹ تو میں ان سے کہتا ”ہر اور ان اسلام، یہ صبح سے رات تک نوٹ سینٹا رہتا ہے۔ اگر یہ اپنی کمائی کا صرف ایک فی صد اپنے اوپر خرچ کر دے تو ہر سے آرام سے جوتے اور کپڑے خرید سکتا ہے، اس دور میں جس میں آپ دس روپے میں لندے سے کمبل جیسا سویٹر خرید سکتے ہیں اس دور میں مرد راتیں چوک میں کپکپا کر گزار دینا جذباتی بلیک مینگ نہیں تو کیا ہے؟“ میں نے خود اپنی آنکھوں سے لوگوں کو اسے جوتے، سویٹر اور شالیں دیتے دیکھا لیکن

دوسری رات وہ پھر اسی طرح پچھی قص میں کھڑا کا نپ رہا ہوتا ہے۔ میں اسے جب بھی دیکھتا، دل ہی دل میں ڈرامہ 2001ء کہتا، مسکراتا اور دوسری طرف دیکھتے لگتا لیکن وہ یوں برف میں اپنا کھیل دو ہرا سکتا تھا۔ مجھے اس کی ہرگز موقع تھیں تھی۔ میرا دوست جذباتی ہو گیا، اس نے اپنا مارک اینڈ پنسر کا ٹیکنی سویٹر اتارا، امپورٹڈ ایالین جوتے اتارے اور شیشے کھسکا کر اسے پکڑا دیئے۔ میں اسے روکتا رہ گیا لیکن وہ پوری طرح جذباتی ہو چکا تھا، اس کی آنکھیں سک رہی تھیں اور ہونتوں پر چھپیں پھل رہی تھیں۔ اشارہ کھل گیا، میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

مجھے اس کی جذباتی حرکت پر انسوں ہو رہا تھا، میں نے اسے سمجھایا" بے وقوف ضرورت مندوں کی خدمت کرنی چاہیے، صدقہ اور خیرات مسلمان پر واجب ہے لیکن صرف حق دار آپ کے مال کا حق دار ہے، غربت، بے بھی اور بے کسی کی اداکاری کرنے والے لوگ اصل حق داروں کی حق تلفی کرتے ہیں۔ یہ لوگ بندیادی طور پر ڈاکو ہوتے ہیں، چور ہوتے ہیں۔ یہ حق داروں کا حق چوری کرتے ہیں۔ حق داروں کے حق پر ڈاک کر مارتے ہیں۔ آپ کا صدقہ، آپ کی خیرات آپ کے پاس اصل حقداروں کی امانت ہوتی ہے۔ آپ کے یہ آنسو، یہ سکیاں اور یہ چھپیں بھی امانت ہیں۔ یہ جذبات جو کسی بے کس، بے بس اور مجبور شخص کو دیکھ کر پھل جاتے ہیں، آپ کے لگے میں کچھ پھنس جاتا ہے اور آپ کا پورا بدن رفتے لگتا ہے، بعدن کا یہ رونا، یہ چھانس اور یہ جذبات بھی سب امانت ہیں۔ آپ لوگ جذباتی بلیک میلوں، اداکاروں اور فراؤ یوں پر جذبات ضائع کر کے اس مقدس امانت میں خیانت کرتے ہیں۔ آپ لوگ ڈاکوؤں کے ساتھی ہیں" میں بولتا رہا اور میرا دوست سنتا رہا، میں خاموش ہوا تو اس نے نشو سے آنکھیں پوچھیں اور بخ سرد لبجے میں بولا "جاوید چودھری، میں نجی خوبیں ہوں، مجھے اللہ تعالیٰ نے زمین پر حق داروں کے حق، بے بسوں کی بے بھی، بے کسوں کی بے کسی اور ضرورت مندوں کی ضرورت جانچنے کے لئے نہیں بھیجا، مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا میں یہ تعین کروں یہ شخص کتنا ضرورت مند ہے، یہ کتنا بے بس اور کتنا بے کس ہے۔ اس کی جیب میں اس کی ضرورت کے مطابق پیسے ہیں یا نہیں۔ میں بس اتنا جانتا ہوں، اس شخص نے اللہ کا نام لے کر میرے سامنے ہاتھ پھیلایا تھا۔ وہ شخص میرے سامنے اللہ کا سفیر بن گر آیا تھا۔ اس اللہ کا سفیر جس کے سامنے میں جب بھی ہاتھ پھیلایا ہوں، وہ مجھے میری ضرورت، میری حاجت اور میرے حق سے زیادہ دیتا ہے، اس نے مجھ سے بھی نہیں پوچھا۔ تم کتنے حق دار ہو، تم کتنے فیصد حاجت مند ہو، تم کتنے اشاریہ کتنے فیصد ضرورت مند ہو پھر میں اس کے سفیر کی ضرورت، حاجت اور حق کا تعین کرنے والا کون ہوتا ہوں۔" میں نے بریک لگائی اور سر سیٹر گنگ پر رکھ دیا۔ مجھے محبوس ہوا وہ بھکاری نہیں ڈرامہ 2001ء میں تھا۔ میں دو سال تک اس بھکاری کو دیکھتا رہا اور مجھے یہ عام سانکت سمجھنے آیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اپنے دوست کا ہاتھ چوم لیا۔



چار روٹیاں

جہاز نے غوطہ لگایا اور ساتھ ہی فضائی میزبان کی مترنم آواز گونج آئی۔ خواتین و حضرات! ہم کچھ ہی دیر میں نیو جرسی کے ایئر پورٹ پر اترنے والے ہیں، آپ سے گزارش ہے، آپ خاطری بند باندھ لیں، کرسی کی پشت سیدھی کر لیں اور کھانے کی میز بند کر دیں، اس وقت زمین پر درجہ حرارت۔۔۔ جہاز نے ایک اور غوطہ لگایا اور مسافر زمین کے انتہائی قریب آگئے۔ پروں کے نیچے گزوڑ گزوڑ کی آواز آئی اور جہاز کے پیسے کھل گئے، ابھی یہ پیسے پوری طرح سیدھے نہیں ہوئے تھے کہ جہاز کے پیندے سے ایک گھڑی سی نکلی، فضا میں لہرائی اور ایئر پورٹ سے ذرا دور سڑک پر آگئی۔ ایئر پورٹ کے سیکورٹی سٹم نے سائز بجا دیئے، سیکورٹی الکار گھڑی کی طرف بھاگ کھلے۔ اس تک والا بھومیت ہو چکا تھا۔ سیکورٹی فورس کے افسر بھومیت چر کر گھڑی تک پہنچ تو جران رہ گئے۔ اس کے سامنے ایک لغش تھی۔ تازہ لغش، جس کی نوٹی ہوتی کھوپڑی، جزوں اور ناک سے خون رس رہا تھا، تھوڑی دیر بعد یہ لغش وہاں سے اختمائی گئی۔ خون صاف کر دیا گیا، تریکھ کھول دی گئی یوں ایک گھنٹے بعد لوگ خون، لغش، گھڑی اور جہاز کا سارا قصہ بھول چکے تھے۔

یہ کم سنگ منگ تھا شامی کوریا کا ایک نوجوان ہے بھوک، غربت اور بے روزگاری نے مذہاب کر دیا تو اس نے خود کشی سے پہلے آخری کوشش کا تھیہ کیا۔ وہ جنگلوں، ولدوں، پہاڑوں اور صحراءوں سے ہوتا ہوا یہ پورٹ پہنچا اور رن دے پر کھڑے امریکی جہاز کے پہیوں میں چھپ گیا۔ جہاز اڑا تو وہ بھی ساتھ ہی اڑ گیا لیکن بد قسمتی سے جب یہ جہاز امریکہ پہنچا، پیسے کھلتے تو کم سنگ منگ سڑک پر گر کر بلاک ہو گیا۔ یہ واقعہ اس سال اگست میں پیش آیا لیکن اپنی تمام تر تسلیمنی کے باوجود میدیا میں زیادہ کورنیج نہ پاسکا کیونکہ یہ اس نوعیت کا واحد واقعہ تھا۔ امریکہ میں اس قسم کے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ دنیا بھر سے جنوبی نوجوان جہاز کے پہیوں میں چھپ کر امریکہ آنے کی کوشش کرتے ہیں، ان میں سے کچھ تو پہیوں کے آہنی راڑوں میں پھنس کر مرجاتے ہیں، کچھ دس میں ہزارفت کی بلندی پر سر دی سے مر جاتے ہیں اور باقی نجی جانے والے لینڈنگ کے دوران رن دے یا پھر شہر میں گر کر بلاک ہو جاتے ہیں۔ یوں اس طریقے سے آج تک کوئی نوجوان زندہ حالت میں امریکہ نہیں پہنچ سکا لیکن اس کے باوجود نوجوان جان پر کھیل رہے ہیں، رسک لے

ہے ہیں۔

اب سوال یہ ہے ایسا کیوں ہوتا ہے، کیوں یہ نوجوان اپنی جان پر کھلتے ہیں۔ لوگ کیوں گھر بار بیچ کر امریکہ جانے کی کوشش کرتے ہیں، لاکھوں روپے خرچ کر کے معمولی کشتوں میں بچھرے سندوں کا سفر کرتے ہیں اور جان سے جاتے ہیں۔ کنٹیزوں میں چھپ کر سرحد پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نیشیں بن کر واپس آتے ہیں۔ ان سوالوں کے جواب بہت ہی سادہ اور عام فہم ہیں۔ امریکہ شہر ہے اور باقی ساری دنیا پہماندہ گاؤں جس طرح پہماندہ گاؤں کے لوگ غربت، مہنگائی اور بے روزگاری سے مجبو ہو کر شہروں کا رخ کرتے ہیں اسی طرح یہ لوگ امریکہ آتے ہیں اور تاریک راہوں میں مارے جاتے ہیں لیکن اب سوال یہ ہے اس میں قصور کس کا ہے؟ پہلوں کے راؤں میں کچلے جانے والے لوگوں کا یا پھر زندگی کی چک دک سے محروم امریکی معاشرے، امریکی حکومت اور امریکی نظام کا، یہ وہ سوال ہے جس پر امریکہ کہتے ہیں اپنا کر کہتا ہے ”آئی ڈونٹ تو۔“

بہر حال امریکہ مانے یا نہ مانے اس ساری صورت حال کے ڈافنڈے امریکہ ہی سے ملتے ہیں۔ امریکی حکومتوں نے یورپ سے مل کر باقی دنیا کی رگوں سے دولت نپوڑلی جس کے نتیجے میں دنیادو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ میں فیصد امریکہ اور یورپ اور 80 فیصد باقی دنیا۔ ان میں فیصد لوگوں کے پاس کیا ہے؟ یہ 20 فیصد لوگ دنیا کی 86 فیصد آسانی سے استعمال کر رہے ہیں۔ یہ لوگ 11 گنا زیادہ کھاتے ہیں۔ 17 گنا زیادہ تو ناٹی استعمال کرتے ہیں ان کے پاس دنیا کی 49 فیصد ٹیلی فون لاکنس ہیں۔ ان 13 ممالک کے اقلیٰ 48 ممالک کے مجموعی انتباٹوں کے برابر ہیں۔ ان ممالک میں 1225 ایسے لوگ ہیں دنیا کی 47 فیصد دولت جن کے ہاتھ میں ہے۔ ان 225 لوگوں میں سے 167 صرف امریکہ میں ہیں ان لوگوں کا طرز معاشرت بھی ملاحظہ کیجئے۔ امریکہ اور یورپ میں ہر سال پالتو جانوروں کو 17 ارب ڈالر کی خوراک کھلائی جاتی ہے۔ یورپ ہر سال 11 ارب ڈالر کی آس کریم کھاتا ہے۔ 10 ارب ڈالر کے پہلوں ایک دوسرے کو پیش کئے جاتے ہیں۔ میلینیم کی تقریبات پر 174 ارب ڈالر خرچ ہوئے تھے۔ یورپ میں 12 ارب ڈالر کے پر فیوم بنائے اور یونیک جاتے ہیں۔ 97-98ء میں جاپان اور امریکہ کی بڑی فرموں نے 35 ارب ڈالر پارٹیوں اور کاروباری تقریبات پر خرچ کئے۔ یورپ اور امریکہ میں شراب کا سالانہ بل ڈیزی ہو سوارب ڈالر سے اپر چلا جاتا ہے جبکہ دوسری طرف دنیا کی 80 فیصد آبادی انتہائی افسوسناک زندگی گزار رہی ہے۔ ان اسی فیصد لوگوں کی تعداد ساڑھے چار ارب ہے۔ ان میں سے ایک تباہی کے پاس پینے کے لئے پانی، ایک چوتھائی کے پاس رہائش اور ایک ارب لوگوں کے پاس ضروریات زندگی کے لئے وسائل نہیں۔ ایک ارب لوگ ڈاکٹر اور دوائی کے بغیر ہیں، اس دنیا جس میں 17 ارب ڈالر کی خوراک کتوں کو کھلاوی جاتی ہے اس میں پہلوں کی بنیادی تعلیم پر صرف 5 ارب ڈالر خرچ ہوتے ہیں۔ اس دنیا میں 840 میلین لوگ خوراک کی کمی کا شکار

ہیں۔

خود سوچئے عدم توازن پر قائم اس معاشی صورت حال میں یہ سائز ہے چار ارب لوگ کیا کریں گے۔ کیا یہ لوگ جہاز کے پہیوں کے ساتھ لٹک کر اس دنیا میں پہنچنے کی کوشش نہیں کریں گے جس میں روشنی، خوراک اور آسائش ہے جس میں آئس کریم، پرنوم اور بست کہا یہ ہو رہا ہے لوگ کشیوں، کنٹیزوں اور پہیوں میں چھپ کر امریکہ اور یورپ پہنچ رہے جو پہنچ گئے وہ خوش ہو گئے، جو نہیں پہنچ پائے وہ امریکہ اور یورپ سے نفرت کرنے لگے، مردہ باد کے نعرے لگانے لگے، اور امریکہ اور یورپ جہاز کے پہیوں، کشیوں اور کنٹیزوں کی نقل و حرکت پر بختی کرتا ہے تو 80 فیصد لوگوں کی نفرت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ زیادہ شدت کے ساتھ 20 فیصد مراعات یا فتنہ طبیق کو بر اجلا کہنے لگتے ہیں۔ لہذا آج صورت حال یہ ہے لا طینی امریکہ سے محروم گوپی تک دنیا کے سائز ہے چار ارب لوگ امریکہ اور یورپ سے انتہائی نفرت کرے ہیں۔ یہ نفرت کسی بھی خوفناک جنگ کی شکل اختیار کر سکتی ہے جس کے آخر میں دنیا میں صرف ایک ہی طبقہ رہ جائے گا۔ درختوں کے پتے چبانے، گھاس کھانے اور کپا گوشت "نوش جان" فرمائے والا طبقہ!

معاشی دانشوں کا کہنا ہے اگر آپ کے پاس چار روپیاں ہیں تو آپ ایک روپی چپ چاپ سامنے بیٹھے جو کے کو دے دیں کیونکہ اگر آپ نے ایمانہ کیا تو آپ رہیں گے اور نہ ہی چار روپیاں۔
 (نوت: یہ کالم صدر بخش کے اس بیان سے متاثر ہو کر لکھا گیا جس میں انہوں نے کہا تھا "پڑھیں دنیا امریکہ سے کیوں نفرت کرتی ہے۔")



ستون انج

آئیے چند لمحے کے لئے افغانستان کو بھول جاتے ہیں۔ قندھار پر اسے ہی 130 طیاروں کی چلی پروازوں، جنگ زدہ جلے سڑے مئے منائے شہر پر اڑھائی سو جملوں، ہرات، جلال آباد، مزار شریف اور کابل شہر سے اشتعے دھوئیں اور لپکتے شعلوں کو بھلا دیتے ہیں۔ ہم رہت بی بی کے زخمیوں کو فراموش کر دیتے ہیں۔ ہم فاطر کے آخری سانس لیتے بینے اور باطن شاہ کے صحن میں پڑی دس نشیں بھی بھلا دیتے ہیں۔ آئیے ہم چند لمحوں کے لئے تحالیم کر لیتے ہیں طالبان پھر اور غار کے دور کے انسان ہیں تبدیل، شائستگی، اخلاق، مردم اور رحم دلی ان کے قریب سے نہیں گزری، وہ دہشت گرد ہیں، قاتل ہیں، جاہل ہیں۔ انہوں نے حقیقتاً وقت کا دھارہ الٹ دیا۔ زمانے کا پیریں الٹا گھما دیا اور وہ واقعی اضطراب کے انسان کو چھتایا، پکے گوشت اور کیلے کے لباس میں واپس لانا چاہتے ہیں۔ آئیے ہم ساری حقیقتوں کو فراموش کر کے آج کا دن سلمیم احمد بحث کے نام وقف کر دیتے ہیں۔ ملکوال کے سلمیم احمد بحث کے نام جو 14 اکتوبر کو اپنی بیوی، اپنی بیٹی اور اپنے بیٹے کے ساتھ راولپنڈی آیا اور پھر اس کا بیٹا، اس کی بیوی اور اس کی بیوی نعش بن گئی اور خود وہ آخری سانسیں گئے۔ آئیے آج کا یہ دن سلمیم احمد بحث کے نام کر دیتے ہیں۔

سلمیم احمد بحث ملکوال شیشن پر چائے کا کھوکھا چلاتا تھا، غربت کسپرسی اور مبنگائی نے اس کے اعصاب توڑ دیئے، تو اس نے اپنی بیوی بشری، آٹھو سالہ بیٹی رضوانہ اور پانچ سالہ بیٹے خالد کو ساتھ لیا اور راولپنڈی آگیا۔ وہ راجہ بازار کے ایک ہوٹل میں بھرپور گئے۔ سلمیم احمد بحث نے اتوار کا سارا دن اپنے خاندان کو سیر کرائی، وہ بھری امام بھی گئے۔ شام کو واپس کرے میں آئے تو بچوں کے ہاتھ میں شانگ بیگ تھے جن میں ان کے چھوٹے چھوٹے کھلو نے تھے، رات کو یہ خاندان سو گیا، سچ دروازہ نہ کھلا تو پیرے نے اندر جھاک کر دیکھا۔ اندر ایک ہوناک منظر اس کا منتظر تھا۔ بشری بیگم، رضوانہ اور خالد کے گلے کئے ہوئے تھے جبکہ سلمیم احمد بحث اپنی شرگ پر ہاتھ رکھ کر آخری سانسیں لے رہا تھا۔ پولیس آئی، نعشیں اٹھائیں، سلمیم احمد بحث کو ہسپتال پہنچایا گیا جہاں تادم تحریر اس کی حالت تشویشاً کیا جاتی ہے ابتدائی تفتیش سے معلوم ہوا سلمیم احمد بحث نے غربت سے بچک آ کر اپنے خاندان کو پہلے نہ آور گولیاں کھلائیں پھر ان کے گلے کائے اور آخر میں اسی

چھرے سے اپنی شرگ کاٹ لی۔ پولیس کو اس کی جیب سے بیس روپے اور امداد کے لئے لا تعداد درخواستیں ملیں۔ ان درخواستوں میں سے چند سرکاری افسروں کے نام تھیں، چند سیاسی رہنماؤں اور چند مائنٹرنس ٹائم کے نام۔ ان درخواستوں کا ہر لفظ ایک ہی التجا کر رہا تھا۔ ”ماں باپ میں بہت غریب ہوں، قرض داروں کا ستایا ہوں ہوں، میری مدد کریں۔ مجھے اور میرے خاندان کو بچائیں“، لیکن ان درخواستوں کا بھی وہی انجام ہوا جو اس ملک کے لاکھوں، کروڑوں ٹائم احمدوں کی درخواستوں کا ہوتا ہے۔ ”ہمارے پاس فذ زندگیں ہیں“، لہذا ٹائم احمد بحثہ اور اس کا خاندان بھی اسی اختتام، اسی انجام کو پہنچ گیا جس کا اس سے پہلے یہ ملکردوں ہزاروں ٹائم احمد اور ٹائم احمد بھئے شکار ہو چکے ہیں۔

یہ ہے ایک تہذیب یافتہ، شاستہ، با اخلاق، ہامروت پڑی لکھی اور جدید سوسائٹی کی اصل تصویر، ایک ایسی پڑھی لکھی، جدید، ہامروت، با اخلاق، شاستہ اور تہذیب یافتہ سوسائٹی کی تصویر جسے ہمارے حکمرانوں نے حال ہی میں امریکہ کے سامنے مرسلیم ختم فرمائے ”مئون اینج“ سے بچایا تھا۔ بہر حال یہ دنیا کی واحد تہذیب یافتہ، شاستہ، با اخلاق، ہامروت پڑھی لکھی اور جدید سوسائٹی نہیں۔ دنیا میں اس سے کہیں مہذب اور شاستہ سوسائٹیاں موجود ہیں جن کے ٹائم احمد بھئے بھی اسی قسم کے حالات اور اسی قسم کے مسائل کا شکار ہیں، میں جوں جو لائی میں امریکے میں تھا تو واشنگٹن میں ایک امریکی خاتون اپنے پانچ بچوں کے ساتھ دریائے پاناماک میں کوڈ گئی یہ خاتون ٹائم احمد بحثہ کا زنا نہ ایڈ بیٹھنے تھی۔ اس کے سانان سے بھی امداد کے لئے درجنوں درخواستیں نکلی تھیں۔ ٹائم احمد بحثہ اور اس خاتون کی درخواستوں میں بس اتنا فرق تھا وہ انگریزی میں تھیں اور وہ ملکوں میں شیشنا کی بجائے واشنگٹن میں لکھی گئی تھی۔ یقین سمجھے واشنگٹن سے لے کر نوکیو اور ماسکو سے لے کر جپان تک ساری جدید دنیا میں ایسے ہزاروں لاکھوں، کروڑوں ٹائم احمد بھئے، التجا میں اور درخواستیں بکھری پڑی ہیں۔ لوگ غربت سے مجبور ہو کر اپنے بچے بھون کر کھا گئے۔ لوگوں نے اپنے گردے اور آنکھیں بیچ دیں۔ لوگوں نے اپنی آنکھ آنکھ سال کی بچیاں دلالوں کے حوالے کر دیں، لوگ اپنے پورے خاندان کے ساتھ آگ میں کوڈ گئے۔ دریاؤں سمندروں میں چھلانگ لگا گئے۔ فریں کے آگے لیٹ گئے، پیباڑوں سے گر گئے اور پنکھوں سے لٹک گئے لیکن اس کے باوجود وہ معاشرے، وہ سوسائٹیاں مہذب کھلا میں، شاستہ، با اخلاق، ہامروت، پڑھی لکھی اور جدید ثابت ہو گیں، واہ بھی واہ۔

اور اب واپس آتے ہیں قندھار کے جلے سڑے، منے منائے شہر میں واپس آتے ہیں جس پر ایک بختی میں اڑھائی سو فضائی حملے ہوئے۔ ہم مزار شریف، ہرات، جلال آباد اور کابل میں واپس آتے ہیں جن سے شعلے اٹھ رہے ہیں، جن میں زمین سے آسمان تک دھوکیں اور غبار کے سوا کچھ نہیں۔ ہم پتھر اور غار کے دور کے انسانوں میں آتے ہیں اور ان شہروں، ان سڑکوں اور ان چوکوں میں کھڑے ہو کر ہاں ان چوکوں، ان سڑکوں اور ان شہروں میں جن میں اب ایک بھی ایسی ثمارت نہیں جس کی مالیت سوڑا لر سے زیادہ ہو، ہم وہاں کھڑے ہو کر

پوری دنیا کو چیلنج کرتے ہیں کہ طالبان کے پچھلے چھ سال دور میں طور خم سے دریائے آموگ پورے انغاشتان سے ایک بھی سلیم احمد بحث نکال کر دکھاویں جس نے غربت، مہنگائی اور ظلم سے مجبور ہو کر اپنے بچوں کے لئے کافی دینے ہوں، جس نے خود کشی کر لی ہو۔ تی ہاں پوری دنیا کو چیلنج ہے ایک ایسا معاشرہ جس میں لوگ پتے کھا کر زندہ تھے جس میں لوگوں کے پاس پہنچنے کے لئے کپڑے نہیں تھے جو برسوں سے تاریخ کے بدترین قحط اور انتہائی ہولناک خشک سالی کا شکار ہے۔ اس سوسائٹی میں چھ سال کے دوران خود کشی کا ایک بھی واقعہ پیش نہیں آیا۔ ایک بھی سلیم احمد بحث سامنے نہیں آیا۔ مرنے کے بعد جس کی جیب سے درخواستیں اور سامان سے اتنا جائیں نکلی ہوں لیکن اس کے باوجود وہ تم ان لوگوں کو عہد قدمیم کے جاہل اور گنوار لوگ کہتے ہیں اور ان کے معاشرے کو ”سُنونِ اتنے“ یاد رکھئے لوگوں کو اگر انصاف مل رہا ہو تو وہ ”سُنونِ اتنے“ میں پتے کھا کر بھی زندہ رہ لیتے ہیں لیکن اگر وہ ظلم کا شکار ہوں تو انہیں راولپنڈی کے جدید شہر میں سلیم احمد بحث بنخے دیر نہیں لگتی، وہ دریائے پاناماک میں بچوں کے ساتھ کو دتے دیر نہیں لگاتے۔



چھ سو پچاس روپے

میرے ایک عزیز کمر درد کا شکار تھے، ایک دن میں ان کے پاس بیٹھا تھا، وہ کسی کا ٹیلی فون نمبر لکھ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ سے قلم گر گیا، میرا خیال تھا وہ انسانی فطرت کے مطابق فوراً جھک کر قلم اٹھائیں گے لیکن وہ بڑے مزے سے گفتگو کرتے رہے۔ مجھے بہت بے چینی ہو رہی تھی، میں بار بار ان کے پیروں میں پڑے قلم کی طرف دیکھتا اور بے چین ہو کر پہلو بدلتا، وہ میری ٹینش بھانپ گئے۔ انہوں نے قبیلہ لگایا اور فرش پر پڑے قلم کی طرف دیکھ کر بولے ”میں کسی دوسرا چیز کے گرنے کا انتظار کر رہا ہوں۔“ مجھے فوری طور پر ان کی بات سمجھنے آئی لیکن جب ان کی بیماری کے بارے میں سوچا تو مجھے معلوم ہوا، کمر درد کے شکار لوگوں کے لئے جھکنا مشکل ہوتا ہے لہذا ان کی کوشش ہوتی ہے وہ ایک بار ”ذالی“ لکھ لیں تو کم از کم وہ چیزیں ضرور اٹھائیں۔ میرے عزیز بھی اسی فلنسے پر کاربند تھے وہ بھی اس وقت تک نہیں جھکتے تھے جب تک وہ چیزیں نہ گر جائیں۔ اس اکشاف کے بعد میں نے عام زندگی کا مشاہدہ کیا تو محسوس ہوا صرف میرے یہ عزیز ہی نہیں ہر انسان کسی حد تک اسی عادت کا شکار ہے مثلاً میرے ایک دوست کے ماموں انتقال کر گئے۔ ماموں ملتان رہتے تھے اور میرا یہ دوست اسلام آباد، میں نے دوست سے پوچھا ”تم تعزیت کے لئے نہیں گئے۔“ شرمندہ سا ہو کر بولا ”در حمل خالو جان کی طبیعت بھی نہیں نہیں، میں چاہتا ہوں، وہ بھی قرب الہی پائیں تو ایک ہی پھیرے میں دونوں کو بھلتا آؤں۔“ اب بظاہر میرا یہ دوست انجامی لختیا، مطلبی اور خود غرض محسوس ہوتا ہے لیکن ہم اس کی مجبوری دیکھیں تو وہ ہمیں ایک معصوم سادا اور مجبور شخص دکھاتی دے گا۔ خود سوچنے آج کی مہنگائی میں کون ہو گا جو تعزیتوں کے لئے اسلام آباد سے ملتان کے دوسرے گا۔ ہر سمجھدار شخص اپنا پھیرا بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ میرے ایک ساتھی نے نئی بات بتائی، اس کا کہنا تھا اس کے محلے میں مرگ ہو گئی۔ لواحقین نے مہمانوں کے لئے کھانا بنایا، مہمانوں کو کھلانے سے پہلے صاحب خانہ نے مناسب مقدار میں کھانا الگ کر کے ڈیپ فریز میں رکھوا دیا۔ میرے ساتھی نے وہ پوچھی تو اس کے پڑوی نے رازدارانہ لبھے میں بتایا ”میرے چھوٹے بیٹے نے اگلے بیٹتے کا اس فیلوز کے ساتھ تفریح کے لئے شہر سے باہر جاتا ہے، میں یہ کھانا اگر کر کے اس کے ساتھ بھجوادوں گا۔“ میں ایک صاحب کو جانتا ہوں، وہ اے سی چلانے سے پہلے اپنے بچوں کو

چالیس بچاں کلو میٹر دور کھیل کے میدان سے پکڑ کر لاتے ہیں، مگن کا کہنا ہے اے سی چلنا ہے تو سارے خاندان کو فائدہ ہونا چاہیے۔

یہ سارے مشاہدات جیسیں ہیں، میں خود بھی اسی کشمکش کا شکار ہوں، میں کوئی چیز خریدنے جاتا ہوں تو کاغذ پر باقاعدہ روٹ بنا کر لکھتا ہوں، میری کوشش ہوتی ہے اس "ڈرائیور" میں زیادہ کام بھجتا ہوں مثلاً میں ایک بار بچے کے جو تے خریدنے لگا، تمیں گھنے بعد واپس آیا تو میں مزید دس کام کر چکا تھا، میں نے بینک میں بچوں کی فیس جمع کرائی، درزی سے کپڑے لئے، جامت کرائی، ایک دوست سے تعزیت کی، ایک دوست کو شادی کی مبارکبادی، گاڑی کی لائیٹ نیک کرائی، بینک کے شئے بدواۓ گوشت خریدا، بک شاپ پر کھڑے ہو کر نئے میگزین کی ورق گردانی کی اور ایک دوست کے ملازم کو "انہیں ہتادینا میں آیا تھا" کا جھانس دیا۔ میں نے ایک بار سوچا، میں ایسا کیوں کرتا ہوں، میرے پاس اس فعل کے دو جواز تھے، اول میں وقت بچانا چاہتا ہوں، دوم میں یہ سب کچھ پڑوں بچانے کے لئے کرتا ہوں۔ میرا خیال تھا میرا مسئلہ وقت ہے لیکن آپ سے کیا پرده میں یہ سب کچھ پڑوں بچانے کے لئے کرتا ہوں۔ میں بھی کر درد کے شکار عزیز کی طرح انتظار کرتا رہتا ہوں کب دوسری چیز گرے گی اور میں جھک کر اس کے ساتھ ساتھ وہ چیز بھی اٹھا لوں گا جو میرے لئے زیادہ ضروری ہے۔

ہو سکتا ہے آپ بھی اسی عادت کو شکار ہوں، ہر چال، اوڑھاں اور لوز کاں پاکستانی اسی مسئلے کا شکار ہے۔ جس شخص نے بھی مخصوص بجٹ میں گزارہ کرنا ہے۔ ناگوں سے چادر کھیچ کر اپنا گنج چھپانا ہے یا سر زنگا کر کے پاؤں ڈھانپنے ہیں وہ دن رات پھرے بچانے کے چکر میں مصروف رہے گا۔ یہ سب غربت کا کمال ہے، ہم سب ایک غریب ملک کے غریب ترین شہری ہیں لہذا ہم لوگ اے سی چلا میں تو اپنی بکری بھی کرے میں کھینچ لاتے ہیں۔ تربوز بھی سخندا ہونے کے لئے وہیں رکھ دیتے ہیں، میں اپنے اس رویے، اپنی اس عادت کی ہنا پر خود کو تھیک خاک غریب سمجھتا ہوں لیکن ورلڈ بینک اور ہماری حکومت کا بھلا ہو جس نے پاکستان میں غربت مانپنے کا یرو میٹر طے کر دیا۔ دونوں نے معاهدہ کیا پاکستان کا جو شہری چھ سو بچاں روپے کماتا ہے وہ اسی سے جبکہ اس رقم سے کم کمانے والا شخص غریب تصور ہو گا۔ اس یرو میٹر کا اکشاف عالمی بینک کے ایک آفسر ایجاز نبی نے 19 جولائی کو لاہور کے ایوان صنعت و تجارت میں کیا۔ میں نے یہ خبر پڑھی تو مجھے محسوس ہوا۔ اس لحاظ سے میرا شمارت پاکستان کے انتہائی رئیس، متول اور جا گیر دار شہر یوں میں ہوتا ہے لہذا مجھے اب اپنے نام کے داؤ، آدم، جی، میکن، سینھ، نواب یا جتوئی وغیرہ کا اضافہ فرمایا چاہیے لیکن جب میں نے چھ سو بچاں روپوں کی حقیقت پر غور کیا تو معلوم ہوا، میری یہ جا گیر داری، میرا یہ تمول اور میری یہ امارت ایک ہرگز سوپ کے ایک بیالے اور فروٹ کی ایک چھوٹی باسکٹ کی مار ہے۔ ورلڈ بینک اور حکومت پاکستان جس شخص کو "amarat" کا تمغہ دے رہی ہے وہ شخص تو اپنی ساری امارت کے بدے سلپروں کا ایک جوڑ انہیں خرید سکا، مجھے

محسوس ہوا میں تو امیر ہو کر بھی غریب ہی رہوں گا۔

معلوم نہیں، ہم کس کو بے قواف بنا رہے ہیں، کے ہو کہ دے رہیں، دنیا میں ابھی ایسی کوئی ملنکی
ایجاد نہیں ہوئی جو پیاس سے کو یقین دلا سکے وہ پیاس نہیں، جو بھوکے کو سیر شکم ثابت کر سکے، جو بیمار کو سخت مند اور
زخمی گوندرست ہونے کا یقین دلا سکے۔ پیاس اس وقت تک پیاسا رہے گا جب تک اسے پانی نہیں ملتا، بھوکا
روٹی ملنے تک بھوکا، بیمار علاج ہونے تک بیمار اور زخمی مرہم لگنے تک زخمی ہی رہے گا۔ رہا غریب تو آپ غربت
کا معیار پچاس روپے رکھیں، چھ سو پچاس یا چھ ہزار پانچ سو جب تک لوگوں کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں،
غریب غریب ہی رہے گا۔ لفکوں، تبغوں اور ایوارڈوں سے نکل نہیں ڈھانپا جا سکتا، غربت شتم نہیں کیا جا سکتی،
اگر ہو سکتی تو گنگو تیلی کو قارون کا نام دے کر اسے امیر بنایا جا سکتا۔ چڑائی دین کا نام اللہ دین رکھ کر اس کا مقدار
بدلا جا سکتا لیکن شاید ہمای حکومت بھی سمجھتی ہے اس کا خیال ہے وہ کسی کو جتوئی کہہ دے گی تو وہ جا گیردار
ہو جائے گا، کسی کو سینجھ صاحب کا نام بدل دے دے گی تو وہ رئیس ہو جائے گا۔ چلنے یہ بھی کر کے دیکھ لیں، چھ سو
پچاس روپے کو معیار بنا کر ہی اس ملک کو غربت سے دور کر دیں۔ آپ کچھ تو کریں۔

بس بھلی کے ایک بل کے عوض

"میرا نامِ سلطنتی ہے، شوہر دکاندار تھا۔ ایک ایکسٹریٹ میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ پولیس کا سامنا ہوا تو معلوم ہوا پولیس کیا ہوتی ہے۔ انصاف کیا ہوتا ہے اور عدل کے کہتے ہیں۔ نہیں میں مت ایک امیرزادے نے میرے خاوند کو کچل دیا، میں مظلوم تھی اور وہ ظالم، میں فریادی تھی اور وہ میرا ملزم یعنی پولیس تھا میں اسے کری بھی دیتی تھی اور چائے بھی جبکہ مجھے صرف گندی گالیاں اور ہوس سے لبریز نظر سے ملتی تھیں۔ میں اپنا فیصلہ اللہ پر چھوڑ کر گھر بیٹھ گئی، مجھے نہیں معلوم میرے کیس کا کیا ہنا۔ میری فائل اللہ تعالیٰ تک پہنچی بھی یا پھر اسی تھا کے کسی گھر، کسی اے ایس آئی یا کسی سب اسکے کی جیب میں دفن ہو گئی۔

خط مجھے پہچلنے میغتے موصول ہوا۔ خط کی تحریر اس قدر جان دار، بیان اس قدر روایاں اور حقائق اس قدر تکمیل ہے کہ میں اپنا بینادی اصول توڑا کر یہ خط آپ کی عدالت میں پیش کر رہا ہوں۔ میں نے کالم نویسی کے ابتدائی دنوں میں فیصلہ کیا تھا، میں اپنے کالم میں خط شائع نہیں کروں گا۔ میں نے کسی نہ کسی حد تک اس فیصلے کا پاس بھی کیا یعنی جہاں تک سلطنتی (یقیناً یہ فرضی نام ہو گا) کا تعلق ہے۔ میرا خیال ہے یہ خط میرے اصول، میرے فیصلے سے کئی ہزار گناہ قائم ہے کیونکہ میں اسے آپ کے حضور پیش نہ کروں تو میں باقی زندگی خود کو سلطنتی اور آپ دونوں کا گنہگار سمجھتا رہوں گا۔ آئیے شدت احساس میں ڈوبی یہ تحریر پڑھیں اور اسے ریفرنڈم کے پیٹھ پیچر میں لپیٹ کر کسی پونچ نہیں کے کسی بیٹک بکس میں ڈال دیں اور پھر خود سے سوال کریں، سلطنتی کا اصل ملزم کون ہے۔

"میرا خاوند ایک بیٹا نہیں میں چھوڑ گیا تھا۔ میں اسے پانے کے لئے گھر کی چیزیں پیچتی رہتی، ایک ایک کر کے سب کچھ بک گیا تو میں نے سوچا، زندگی کی گاڑی کو دھکا دینے کے لئے ملازمت کر لوں۔ ایک بہت بڑے افسر کے گھر کی صفائی اور برتن مانجھنے کی نوکری مل گئی۔ افسر کی تھوڑا تو محض اٹھا رہا نہیں ہزار تھی یعنی وہ رہتا کرداں کے گھر میں تھا۔ گھر میں چار پانچ گاڑیاں تھیں۔ روز کا خرچ تین چار ہزار روپے تھا۔ ایک روز افسر کے بیوی بچے شادی میں شرکت کے لئے لندن چلے گئے، گھر اکیلا ہو گیا۔ میں نے کام پر جاتا چھوڑ دیا۔ ایک مہینے بعد بھل کا بل آگیا، بل بہت زیادہ تھا۔ میرے پاس بل ادا کرنے کے لئے پہنچنے

زیر و پاکت ۲

تھے۔ میں کام والے گھر گئی تو پہ چلا بیگم صاحب گرمیوں کی چھپیاں گزار کر واپس آئیں گی۔ میں نے آگے بیچھے نوکری کی کوشش کی، نہ ملی۔ میں تھیر حضرات کے پاس گئی، زکوٰۃ کمیٹیوں کے چیئرمینوں کے دروازے کھنکھائے لیکن کسی نے میری مدد نہ کی۔ میرے گھر کا میٹر کٹ گیا۔ گرمی بہت تھی، میرا بیٹا اگر میں میں چھپتا تھا۔ میں پریشان ہو کر اسی افسر کے گھر چل گئی۔ اس نے میری عرض سن کر کہا۔ اب تم آگئی ہو تو میرا کمرہ صاف کرتی جاؤ، پیسے بھی لے جانا۔ میں اسکے کمرے میں چل گئی، جہاں اس افسر نے میرے ساتھ وہی سلوک کیا جو اس ملک کے اکثر حرام خور بے بس کمزور اور مجبور لازمیوں سے کرتے ہیں۔ میں چھپنی بھی، چلانی بھی لیکن میری آواز ساونڈ پروف کرے سے باہر نہ گئی، اس شام میں گھر لوٹی تو میری مٹھی میں بل کے پیسے تھے۔ میں نے سوچا، میں تھانے چاکرا پہنچنے اور گزرنے والی قیامت کی شکایت کروں لیکن پھر سوچا جو پولیس میرے خاوند کے قاتل کو سزا نہیں دے سکی وہ میری عزت کا کیا بدلتے گی۔ میں گھر میں پڑی رہی اور سوچتی رہی میں نے بھل کا بل عزت لانا کرہی دیتا ہے تو پھر باقی ضروریات زندگی کیوں چیچپے رہیں۔ میں نے اگلے روز بل جمع کر دیا۔ بھل بحال ہو گئی اور پھر اس کے بعد میں افسروں، کارخانے داروں، سرمایہ داروں اور سیاستدانوں کی جا گیر جن گئی۔ میں اس راستے پر چل پڑی جس پر شرافت پاؤں دھڑنا پسند نہیں کرتی۔ مجھے اس راستے پر بے شمار سلسی ملیں۔ میں نے ہر ایک کی کہانی سنی۔ پہنچ چاکوئی ماں باپ کی دوا لینے نکلی واپسی پر دوا تو مل گئی لیکن خود کیست کی دکان پر رہ گئی۔ کوئی نیچہ کا فیکر نہ تھا کہ میرے کھلکھل کر اپنی بھائیوں کی خود خاتمی ہو گئی۔ کوئی انہوں نہیں اور کوئی کانج آتے جاتے راستے میں کہیں سے کہیں جا پہنچی۔

”میں آپ کا کالم پڑھتی ہوں، آپ نے پچھلے دنوں ایک ڈاکٹر کے ایسی پی بننے کا قصہ لکھا تھا، پلیز ایک کالم واپس اور سوئی گیس والوں کے نام بھی لکھ دیں، ان سے کہیں اتنی جلدی جلدی بل نہ بڑھایا کریں، اتنی جلدی میٹر بھی نہ کاتا کریں کہ اس ملک میں سلسی جیسی ہورتیں بھی رہتی ہیں جنہیں بعد ازاں یہ بل اپنی عزت، اپنی حرمت گروئی رکھ کر ادا کرنا پڑتے ہیں۔ اس پولیس کے لئے بھی لکھیں جن کے پاس نا انصافی کے سوا کچھ نہیں۔ ان تھیر حضرات، زکوٰۃ کمیٹیوں کے چیئرمینوں کے نام لکھیں، عزت کے ان لیبروں کے نام بھی لکھیں، ان بیٹیوں والوں کے نام بھی لکھیں جو ہر ظلم چپ چاپ سہ جاتے ہیں، ان سب کے نام لکھیں، انہیں بتائیں یہ بل کسی روز ان کے شملے کی تہیں بھی کھول دیں گے۔“

”جاوید صاحب، میں اب اتنے پیسے کم ایتھی ہوں کہ اب دن رات ساری بقیاں جلا کر رکھتی ہوں، سارے ٹکھے، سارے اسے چلا دیتی ہوں اور پھر قتفیہ لگاتی ہوں، میں اپنے بیٹے کو کہتی ہوں، یہاں اب اس گھر کی کوئی بھتی نہ بھجنے دینا، بھل جلاو، جتنی جلا سکتے ہو، جلاو، بل کی پرواہ کرو۔ میں نے اپنے بیٹے کو وصیت بھی کر دی ہے۔ میں نے اپنے بیٹے کو کہا ہے، یہاں جب میں مروں تو اپنے باپ کی ایف آئی آر، میرے اس پسلے باس کی یہ تصویر اور بھل کا یہ بل میرے ساتھ دفن کر دینا۔ میں چاہتی ہوں، میں اپنے قتل کے تمام ثبوت لے کر خدا

کے دربار میں پیش ہوں۔ میں یہ سارا سامان گواہی بنا کر اللہ کے حضور پیش کروں اور پھر اس سے کہوں، اے میرے پروردگار، میں بے گناہ ہوں۔ میں مخصوص ہوں، بس تیری دنیا اور تیری دنیا کے با اختیار لوگ ہی ایسے تھے۔ بس تیرے بندوں نے ہی مجھے مخصوص نہیں رہنے دیا۔ مجھے گنہگار کر دیا۔ اے میرے پروردگار میں جو کوک کاٹ سکتی تھی۔ میں یہوگی بھی گزار لیتی لیکن میں واپس اکا مقابلہ نہ کر سکی میں بلوں سے نہ لازکی۔“



روم

15 اپریل کو ایک آباد میں ریفرندم کا جلسہ تھا۔ صدر پروین مشرف عوام سے طاقت اور اختیار حاصل کرنے ایک آباد پہنچے۔ پنڈال میں صدر کے استقبال کے لئے "کروڑوں" لوگ موجود تھے۔ ان "کروڑوں" لوگوں میں درمیانی عمر کی ایک خاتون بھی شامل تھی، یہ خاتون جان بوجھ کر ایسی جگہ کھڑی تھی جہاں سے صدر مملکت نے پنڈال میں داخل ہونا تھا، جب صدر مملکت کی سواری وہاں پہنچی، صدر سواری سے باہر لٹک اور نعروں کی گونج میں پنڈال میں داخل ہونے لگے تو وہ خاتون تیر کی طرح ہجوم سے نکلی اور صدر مملکت کی طرف دوڑ پڑی، پولیس نے دیکھا تو وہ شکروں کی طرح خاتون پر بچھت پڑی، خاتون نے پولیس کو جل دینے کی کوشش لیکن پولیس کے پاسی افاقت بھی تھی اور اختیار ایسی الہذا خاتون وزناہ پولیس نے پیڑلیا اور اسے گھیٹ کر صدر سے دور لے جانے لگی، شور سن کر وہاں موجود میدیا اس کی طرف متوجہ ہو گیا، فوٹو گرافر نے "ہڑا وہڑا تصویری" ہٹائیں، یہ تصویریں سیلیافت کے ذریعے ملک سے باہر گئیں اور 16 اپریل کو دنیا کے تمام بڑے اخباروں میں شائع ہو گئیں، یہ تصویر اس وقت میرے سامنے پڑی ہے۔ تصویر میں ایک زنانہ کا شیبل خاتون کو کندھے سے پکڑ کر کھینچ رہی ہے۔ خاتون اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کر رہی ہے جبکہ صدر حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہے ہیں!

یہ خاتون کون تھی، اس کا کیا نام تھا، یہ کہاں کی رہنے والی تھی اور اس کا کیا مسئلہ تھا جس سے مجبور ہو کر اس نے زندگی اور موت کا رسک لیا۔ حال کا مورخ اس سلسلے میں بالکل خاموش ہے تاہم یہ ملے شدہ ہے وہ خاتون انتہائی مجبور تھی، کوئی ایسی مجبوری، کوئی ایسا مسئلہ ضرور تھا جسے وہ اپنے صدر تک پہنچانا چاہتی تھی، اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی ایسی بے انصافی ضرور ہوئی تھی جس کا ازالہ پاکستان کی کسی اتحاری، کسی ادارے اور کسی دفتر سے نہیں ہوا۔ لہذا اس کے پاس ایک ہی آپشن، ایک ہی ذریعہ باقی بچا کر وہ تمام دیواریں پھلانگ کر ملک کے سب سے بڑے ادارے، سب سے بڑی اتحاری کے پاس پہنچ جائے۔ اس شخص کے حضور حاضر ہو جائے جو پاکستان کا مضبوط ترین صدر بھی ہے، مضبوط ترین چیف ایگزیکٹو بھی اور مضبوط ترین آرمی چیف بھی لیکن نتیجہ کیا لکھا؟ جہاں تیر بھی جاگ رہا تھا اور زنجیر عدل بھی لٹک رہی تھی مگر پہرے داروں کو حکم تھا کوئی فریادی زنجیر

تک نہ پہنچ پائے کہ مہادا شہنشاہ کو علم نہ ہو جائے کہ عدل، انصاف اور خوشحالی کے سارے خواہ جھوٹے اور اُن وامان اور فراوانی کے تمام دعوے باطل ہیں۔

ہو سکتا ہے یہ خاتون اس ملک کے ان غریبوں میں سے ایک ہو جن کا ذکر جناب صدر نے اپنے 15 اپریل کے قومی خطاب میں کیا تھا، میں نے یہ خطاب بغور ساتھا، اگلے روز میں نے یہ خطاب اخبارات میں لفظ بے لفظ پڑھا بھی تھا۔ اس خطاب کا نصف ”پاورٹی ایلی ویشن“ یا غربت مکاؤ پر مشتمل تھا۔ اس خطاب کے دوران چناب صدر نے غریبوں کا 39 مرتبہ ذکر کیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے صدر نے فرمایا تھا ”میرا بس چلے تو میں اٹھ کر پیدل جاؤں، ایک ایک غریب کے گھر اور اس رفتہ گا کہ اس کی پریتیاں دو رکروں۔“ مجھے یہ بھی یاد ہے صدر مملکت نے ایک جگہ جذباتی ہو کر فرمایا تھا ”میرا بی جا ہتا ہے میرے پاس پہنچے ہوں اور میں غریبوں کے گھر گھر جا کر ان کی ہتھیلی پر رکھ دوں۔“ صدر مملکت نے ایک جگہ تاسف کا اظہار کر کے کہا تھا ”میرے پاس وسائل نہیں ہیں۔ لیکن میں غربت کے مسئلے کو مضبوط بنیادوں پر حل کرنا چاہتا ہوں۔“ وغیرہ وغیرہ۔ صدر صاحب کے خیالات اور جذبات دونوں بہت ثابت ہیں۔ بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے وہ جو کچھ کہتے ہیں دل سے کہتے ہیں لیکن دوسری طرف معاملہ یہ ہے اس غریب جس کے لئے ان کا دل جلتا ہے، جس کے حالات پر وہ کڑھے رہتے ہیں اور جس کے حالات بدلتے کے لئے وہ مزید پانچ سال صدر رہنا چاہتے ہیں۔ اس غریب اور ان کے درمیان بے شمار رکاوٹیں ہیں۔ ان کے درمیان سکورٹی اور حدادب کی اتنی بڑی بڑی، اتنی اوپنجی اور پچی دیواریں کھڑی ہیں کہ غریبوں کی سکیاں تو رہیں دوران کی جنینیں تک صدر مملکت تک نہیں پہنچ سکتیں۔ اگر کسی شہری موقع کا فائدہ اٹھا کر کوئی غریب ان تک پہنچ بھی جائے تو سکورٹی والے اسے اس طرح پہنچ کر دور لے جاتے ہیں جس طرح میونسلی کے خاکر کو مردہ جانوروں کو گھیت کر شہر سے باہر لا پہنچیں گے۔ یہ غریب کے ساتھ مزید ظلم ہے۔

غربت اس ملک کا داعی مسئلہ ہے۔ یہ ایک ایسا نا سور ہے جس کے ”رتی“ میں ہر روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے پانی کی لہر کی طرح اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو رہا ہے، یقیناً اس لہر کو معلوم ہونے اور ناسوکو جس سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے جگلی بنیادوں پر کوشش کی ضرورت ہے اور جگ بھی وہ جو چھوٹی مولی جھڑپ دھو عالمی جگ کی طرح طویل اور کل وقت ہو، اب ظاہر ہے حکومت کے پاس غربت مکاؤ سے کہیں بڑے ٹاسک موجود ہیں۔ ابھی اس نے ریفرنڈم کا میاب کر رہا ہے، ایکشن کا بندوبست کرنا ہے، جلوں میں حاضرین کی صحیح تعداد کا تعین بھی کرنا ہے۔ لہذا ظاہر ہے غریب اور غربت کی باری تو بہت بعد، بہت دیر سے آئے گی چنانچہ میری حکومت سے درخواست ہے اگر وہ غربت دونہیں کر سکتی تو کم از کم غریب کی بات تو سن لے، ہو سکتا ہے صرف سن لینے سے ہی اس کا مسئلہ حل ہو جائے کیونکہ مسئلہ غربت نہیں ہوتی غربت کے ساتھ وابستہ ہے بھی اور بے چارگی ہوتی ہے۔ اس بے چارگی، اس بے بھی کو ایک گندھا چاہیے ہوتا ہے۔ ایک ایسا گندھا جس پر سر

کھکر غریب اپنے دل کا بوجھ ملا کر سکے، آپ جلوں میں جاتے ہیں، چار چار پانچ پانچ گھنٹے تقریباً کرتے ہیں۔ اگر آپ ان چار پانچ گھنٹوں میں سے آدھ گھنٹہ ان لوگوں کو بھی دے دیں جو ہاتھ میں درخواستیں لے کر اس دن سے آپ کی نظر التفات کے منتظر ہوتے ہیں جس سے آپ نے ان کے شہر آنے کا اعلان کیا تھا، آپ چوبیس گھنٹوں میں سے ایک گھنٹہ اس ملک کے غریب اور بے بس عوام کو بھی دے دیا کریں۔ اگر آپ روزانہ ٹیلی فون کی سانحہ کا میں سن لیں یا سانحہ لوگوں کے آنسو پوچھ ڈالیں گے تو اس ملک کی فضائیمیک ہو سکتی ہے۔ آخر یہ ملک ہے، آخر اس ملک کے لوگ ہیں تو اقتدار کی یہ ساری چکا چوند ہے اگر یہ لوگ ہی نہ رہے تو پھر کہاں کا ملک اور کہاں کا اقتدار!

یہ الیہ نہیں ہم دل میں غریب کیتے ہمدردی تو رکھتے ہیں لیکن ہم اسے آنسو پوچھنے کے لئے رومال دینے کے لئے تیار نہیں۔



پچاس فٹ اونچی چٹان

خبراءہ ارکی لڑائیں تو جنگلوں میں بھی ہوتی ہیں۔ اسی قسم کی ایک لڑائی میں شیر ہار گیا اور ہاتھی جیت گیا یوں ہاتھی جنگل کا بادشاہ بن گیا اور شیر نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ چند روز بعد نکست خورده شیر چٹان پر بیٹھ کر بال سکھا رہا تھا اور سے ہاتھی کا گزر ہوا، شیر نے نظروں ہی نظروں میں چٹان کی اوپرچاری مالی جب اسے یقین ہو گیا ہاتھی کسی بھی طرح اس تک نہیں پہنچ سکتا تو وہ کھڑا ہوا، پورا منہ کھول کر غرایا اور پھر ہاتھی کو لکار کر کہا "اوے مو نے جاؤ میں تمہیں بادشاہ نہیں مانتا" ہاتھی شیر کی لکار سن کر رکا، اور پردیکھا، چٹان کی اوپرچاری کا جائزہ لیا اور پھر سکرا کر بولا "برخوردار یہ تم نہیں، یہ پچاس فٹ اونچی چٹان بول رہی ہے۔"

جنگل کو لہذا ہور کی **Kashif Azad @ OneUrdu.com** نہیں کیا تھا اسی میں تصویریوں کی تماشی تھی، ہمارے گورنر صاحب جزل صدر نے تماش کا افتتاح کیا۔ تقریب کے بعد حسب روایت انہیں صحافیوں نے گھیر لیا، گورنر صاحب صحافیوں میں "گھل مل" گئے۔ سوالات شروع ہوئے تو جزل صاحب جواب دیتے چلے گئے، اسی سوال و جواب کے دوران گورنر صاحب نے فرمادیا "حکومت نے مہنگائی کا جن بوقت میں بند کر دیا ہے" صحافیوں نے اس دعویٰ کا ثبوت مانگا تو جزل صاحب نے فرمایا "صوبہ پنجاب میں روٹی اور تان دورو پے میں فروخت ہو رہا ہے، ہمیں بعض جگہوں سے شکایت ملی لیکن جب ہم نے پرستال کی تو روٹی اور تان کی قیمت اور وزن تھیک نکلا۔" گورنر صاحب کیونکہ بادشاہ آدمی ہیں لہذا بادشاہوں جیسی ہی گفتگو فرماتے ہیں ورنہ دنیا کا کوئی شخص ہے جو یہ نہیں جانتا روٹی ہی سب کچھ نہیں ہوتی، انسانی زندگی میں کچھ چیزیں اور بھی ہیں جن کے بغیر زندہ رہنا مشکل ہوتا ہے، مثلاً یہار کو دوا چاہیے، رُغم کی مرہم پی نہ ہو تو وہ زیادہ دری تک زندہ نہیں رہ سکتا، جنگلوں کے لئے کپڑا اتنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ صرف نگہ جانتے ہیں، بلب جلتا ہے تو بل بھی آتا ہے، روٹی پکتی ہے تو لکڑی، تیل اور گیس جلتی ہے اور ہر میٹنے کا معافہ ادا کرتا پڑتا ہے، نیلی قون بھی بہت ضروری ہے اور جب کوئی عام شخص یہ ضرورت پوری کرتا ہے تو وہ بلبا اختتا ہے۔ انسان کو علم چاہیے اور اب علم بھی تاپ کر، تول کر ملتا ہے۔ لوگ دن میں سیلوں سفر کرتے ہیں اور ابھی تک پانی اور ہوا سے چلنے والی گاڑیاں ایجاد نہیں ہو سکیں۔ لہذا جتاب عالیٰ ان تمام "غیر ضروری" ضروریات کے لئے روپے چاہیے وہ روپے جن کے دیوبندت ہوئی ہونے بن چکے ہیں،

جن کے جن بوتل کے پینے میں ایزیاں رکھ رہے ہیں۔

ٹھیک ہے پنجاب میں روٹی اور تان دور و پے میں ملتے ہیں لیکن جناب عالی اس روٹی کے ساتھ سالن بھی چاہیے، وہ سالن کہاں سے آئے گا اور دوسرا حضور آپ روٹی کو صرف کھا سکتے ہیں آپ اسے پہنچن نہیں سکتے، آپ اسے چھپت کی طرح تان نہیں سکتے، آپ اس کی گولی اور کپسول نہیں ہنا سکتے، آپ اس کی کاپی، کتاب اور سلیٹ نہیں ہنا سکتے، آپ اسے جلا کر گھر میں روشنی نہیں کر سکتے، آپ اس کے ذریعے چکوال بات نہیں کر سکتے، آپ اس پر تازہ خبریں دیکھو، ان اور پڑھنیں سکتے، آپ اسے گاڑی کے نینک میں نہیں بھر سکتے اور آپ جی ہاں آپ اس کے ذریعے سفر بھی نہیں کر سکتے، آپ اسے صرف کھا سکتے ہیں اور وہ بھی سالن، پانی یا بیاز کے ساتھ اور رہی بات مہنگائی کی تو جناب عالی پڑوں کی قیمتوں میں ایک سال میں پچاس فیصد اضافہ ہوا، دواؤں کے زخ میں تیس فیصد، گندم میں چالیس فیصد، کرایوں میں تیس بائیس فیصد اور چیزیں، گھی اور دالوں کے درجت میں سانچھ فیصد بھر حضور اگر سانچھ، تمیں اور پچاس فیصد اضافے کے بعد اگر مہنگائی کا جن بوتل کے اندر ہے تو پھر اس قوم کو اجتماعی طور پر اس جن کا شکر گزار ہوتا چاہے اور اس شخصیت کو نوبل پرائز دینا چاہیے جس نے بوتل کامنچتی سے بند کر رکھا ہے!

تاریخ حکمران بھی مجتبی لوگ ہیں انہیں ملک میں ایک کروڑ 35 لاکھ ہے روزگاروں، چوبیس گھنٹوں میں 36 خودکشیوں، دو ہزار روپے فی کس ماہانہ آمدی، ایک سال میں تین لاکھ ٹکس دہنڈگان کی اور روزانہ دو سو ہزار مددوں اور سرمایہ داروں کی نقل مکانی کے بعد بھی حالات ٹھیک دکھائی دیتے ہیں، انہیں سارے جن بوتوں میں اور سارے مسائل گرد کی طرح پانی میں حل ہوتے نظر آتے ہیں، ان کے اعتقاد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، معلوم نہیں کیا بنے گا اس ملک کا اور اس ملک کے چودہ کروڑ گونگے بھرے لوگوں کا! لیکن خیر اس میں ہمے سیدھے سادے گورنر صاحب کا بھی کوئی قصور نہیں خود سوچے جس شخص نے زندگی کے چالیس سال سرکاری گاڑیوں میں سفر کیا ہو، بجلی، ٹیلیفون اور گیس کا مل نہ دیا ہو، جس نے بازار سے ڈپرین تک نہ خریدی ہو اور جسے کرایہ نہ دینے کی پاداش میں مالک مکان نے گھر سے نہ نکالا ہوا اس کے سارے جن بوتل میں نہیں ہوں گے! تو کہاں ہوں گے؟

یہ گورنر صاحب نہیں بول رہے، یہ گورنر پاؤس کی پچاس فٹ اونچی چنان بول رہی ہے اور جب تک یہ چنان بولتی رہے گی، جن بوتل ہی میں رہے گا اور بوتل کامن بھی ختنی سے بند رہے گا لیکن جس دن جی ہاں خدا نخواست جس دن گورنر صاحب کو ایک رٹائرڈ آفیسر کی تیش میں بجٹ بناتا پڑ گیا، انہیں اس دن معلوم ہو گا زندگی کیا چیز ہے، اس کے کتنے قضاۓ ہیں اور ان تقاضوں کے سامنے کتنے بڑے بڑے جن کھڑے ہیں۔



آئیے دعا کریں

16/ جون کی دوپہر ایک گزور لاغر خاتون اپنے دو بچوں کے ساتھ اسلام آباد کی میلودی مارکیٹ آئی۔ اس کے چہرے پر غربت، یہاں اور بے چارگی لکھی تھی۔ اس نے سائے میں پہنچ کر اپنے سر سے چادر اتاری، فٹ پاتھو پر بچانی، اپنے کندھے سے لگی چھ سات ماہ کی بچی اتاری اور اسے چادر پر لانا کرتی تھیں تھیں۔ بچی نے کسما کر کروٹ بدی، منکھوں کر جانی لی اور دوبارہ گہری نیند میں اتر گئی۔ خاتون نے مطمین ہو کر اپنے تین ساڑھے تین سال کے بیٹے کو اخایا، گود میں بھایا اور اس کے میل سے اُنہوں نے گال چومنے لگی۔ اس کی اس حرکت میں اس قدر وارثی تھی کہ مارکیٹ میں موجود لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے لیکن اسے بھکارن سمجھ کر کوئی شخص اس کے نزد پیکٹ نہ کیا۔ خاتون نے آنکھوں سے بچے کے سر میں لکھی کی۔ اسے بھنچ کر گلے سے لگایا۔ اس کے کان میں کچھ کہا۔ اسے گود سے اٹھا کر فٹ پاتھو پر بھایا، دواوں کا لفاذ اس کے قریب رکھا اور پلکوں پر لرزتے آنسو سنjalatی ہوئی مارکیٹ سے چلی گئی۔ بچہ تھوڑی دیر تک گم سام بیشارہ۔ جب آدھہ گھنٹہ گز نے کے بعد بھی ماں واپس نہ آئی تو اس نے بلند آواز میں روتا شروع کر دیا۔ اس کی چینوں میں اتنا کرب تھا کہ قریبی دکاندار پریشان ہو کر باہر آگئے۔ خریداروں نے مجع لگتے دیکھا تو وہ بھی جمع ہو گئے۔ یوں تھوڑی ہی دیر میں بچوں کے گرد جھوم اکھنا ہو گیا۔ بچے لوگوں کو دیکھ کر مزید خوفزدہ ہو گیا۔ اس کی چینوں میں کرب کے ساتھ خوف بھی شامل ہو گیا۔ جھوم کے باعث ہوارکی تو چھوٹی بچی بھی کروٹ لے کر اٹھ چکی، چند لمحوں تک حیرت اور پریشانی سے جھوم کو دیکھتی رہی۔ جب اپنے گرد کھڑے لوگوں اور ان کے منہ سے نکلنے "بچی" کی وجہ نہ جان سکی تو اس کے منہ سے بھی چینیں ابل پڑیں۔ بچے نے بہن کو روٹے دیکھا تو وہ کھک کر اس کے قریب آگیا۔ اسے سینے سے لگا کر دلاس دینے لگا۔ بچی اس کے ساتھ چھٹ گئی۔ یہ منظر دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں بر نے لگیں۔ سب اپنی اپنی جیبوں سے رومال ٹوٹنے لگے۔ دو ایک حضرات دو قدم آگے بڑھ کر بچوں کے پاس بیٹھ گئے جبکہ باقی لوگ ان کی ماں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے یہ سلسلہ ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ جب بچوں کی آنکھوں سے آنسو ختم ہو گئے اور ان کی سکیاں غوطہ بن گئیں تو ایک سفید پوش شخص آگے بڑھا، اس نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا، رومال سے ان کے آنسو خٹک کئے۔ دکانداروں کو اپنا پتہ لکھوایا اور

بچوں کو اپنے گھر لے گیا۔

اس رات جی ہاں سولہ اور سترہ جون کی درمیانی رات بہت بعد ان بچوں کو زم بستر، گرم گھانا اور عکھے کی سختی ہوا ملی ہوگی۔ انہیں صاف سحرے کپڑے، نئے جوتے، کھلونے اور منھائی بھی ملی ہوگی۔ اس خدا تر سفید پوش شخص نے انہیں پچل بھی کھلانے ہوں گے۔ اس کی بیوی نے انہیں خوب مل کر نہلا یا بھی ہو گا۔ ان کے پہنچنے پر خوبصوردار پاؤڈر بھی چھڑکا ہو گا، انہیں نئے استری شدہ صاف سحرے کپڑے بھی پہنانے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے یہ آسانیش، زندگی کی یہ سہوتیں پا کر ان بچوں کی پلکیں بوجھل ہو گئی ہوں۔ نیند کا بلکا بلکا خبار، ان کے ذہن پر چھا گیا ہو، ان کے جسم نے انہیں لیٹ جانے، سب کچھ بھول جانے، فراموش کر دینے پر اکسایا ہو۔ انہوں نے خود کو نیند کی پریوں کے حوالے کر دیا ہو۔ وہ تسلیوں، رنگوں اور خوبصوروں کے دلیں میں اتر گئے ہوں لیکن ذرا سوچنے رات کو جب اس بچے کو بیاس لگی ہو گی وہ ہڑبرا کر اٹھ بیٹھا ہو گا، اس نے ٹھم تاریکی میں "ای پانی" کا نعرہ لگایا ہو گا اور اس کی سوئی ہوئی شکست آواز عکھے کی کھوں کھوں میں الجھ کر رہ گئی ہو گی تو اس وقت اس نے آنکھیں ملتے ملتے کیا سوچا ہو گا۔ اس کی نسوں کے خون کو آنسو بننے کتنی دیر لگی ہو گی۔ اس نے ماں کی تلاش میں کس بے چینی سے بستر نٹوں ہو گا۔ بینکے، پائے اور چادر کو کتنی ٹھوکریں ماری ہوں گی ذرا سوچنے جب اسے "جی میرے لال" کی سرگوشی سنائی نہیں دی ہو گی تو کیا ہوا ہو گا، اس کے جسم میں چھپی سکیاں سست کر اس کے ہوتوں پر آتی ہوں گی اور ادھر اس کی نصفی بہن کو جب بھوک لگی ہو گی اور اس نے قید رکو ماں سمجھنے سے انکار کر دیا ہو گا۔ اسے بستر سے ماں کے سینے کی حرارت اور ہوتوں کی زمی نہیں ملی ہو گی تو وہ کرب سے چینی نہیں ہو گی۔ ہو سکتا ہے اس سفید پوش شخص کا سارا گمراہ ان کے گرد جمع ہو گیا ہو، ساری بیان جل گئی ہوں۔ ان کے پاس کھلونوں، مشاخیوں، پچلوں اور کھانوں کا ڈھیر لگا دیا ہو گا لیکن اس وقت دیکھنے اور سننے والوں کو معلوم ہوا ہو عکھے کی سختی ہوا، بستر کی صاف چادر، نئے استری شدہ کپڑے، کھلونے، مشاخیاں، پچل اور کھانے سب کچھ ہو سکتے ہیں۔ لیکن ماں نہیں ہو سکتے اور ادھر ان کی ماں نے اگر بھی تک خود سوزی نہیں کی، اگر کسی ٹرین نے اس کا قیمتہ بنایا، اگر اس کی نیش کسی سرداخانے میں ورثا کا انتظار نہیں کر رہی، اگر اسے کسی قبرستان میں اماجنا دفن نہیں کیا گیا تو بے چین وہ بھی ہوئی ہو گی، حلق اس کا بھی کڑوا ہوا ہو گا۔ خون اس کی آنکھوں سے بھی پکا ہو گا اور جنہیں اس کے منہ سے بھی نکلی ہوں گی۔

پچھلے چھوٹوں سے یہ بچے نہیں سوئے، دہ ماں بھی نہیں سوئی لیکن محترم نواز شریف اسی طرح مطمئن نیند سو رہے ہیں۔ جناب اسحاق ڈار بریک قاست لے رہے ہیں۔ لٹخ کر رہے ہیں، ڈنر کھا رہے ہیں۔ جناب مشاہد حسین لندن سے اچھی خبریں سیست رہے ہیں۔ جناب شجاعت حسین گورنر پنجاب بننے کے لئے پرتوں رہے ہیں اور جناب سرتاج عزیز کائنٹن سے رابطوں پر نازار ہیں۔ ہر چیز معمول پر ہے، ملک ترقی کی طرف گامزن ہے اور حالات بہتر ہیں۔ واہ، واہ کسی نے کہا تھا اقتدار کے جسم میں دل نہیں ہوتا۔ میرا خیال

ہے اقتدار کے جسم میں دل تو ہوتا ہے اس کا معدہ اور مثانہ بھی ہوتا ہے اگر نہیں ہوتا تو غالباً ضمیر نہیں ہوتا کہ ایسا ہوتا تو وہ جناب اسحاق ڈار سے یہ ضرور پوچھتا جناب اگر چھپ کھرب 20 ارب 20 کروڑ روپے ایک ماں کو پہنچے اور دو بچوں کو ایک ماں واپس نہیں دلا سکتے تو آپ کے اس بجٹ کو تاریخی بجٹ کہنا ظالم نہیں؟

آئیے ہم دعا کریں یہ پہنچ سو جائیں۔ یہ مٹھائی، پھل، دودھ، کپڑے اور کھلونوں ہی سے بہل جائیں۔ ان کی چینیں بد دعا نہیں، ان کی سکیاں عرش سے پیچھے پیچھے ہی دم توڑ دیں ورنہ کچھ بعید نہیں ستر ماڈل کی بے چینی رکھنے والا رب ہر آنکھ سے نیند اڑا دے، ہر زبان کا ڈاکٹر چین لے، ہر چہرے کو چیخ اور ہر آواز کو سکلی بنادے۔

(نوٹ یہ کالم 1999ء کے بجٹ پر لکھا گیا)



اے میرے خدا تو کہاں ہے!

ماستر جیفری اور نئے عبداللہ میں کئی چیزیں، کئی باتیں مشترک تھیں مثلاً دونوں بے گناہ تھے، دونوں مخصوص تھے، دونوں بچے تھے اور آخر میں دونوں دہشت گردی کا شکار ہوئے۔

ماستر جیفری گیارہ ستمبر کی صبح اپنی ماں کے ساتھ گھر سے لکا، ماریا، اس کی ماں نے یہ کہنی کے دفتر جانا تھا، وہاں سے فارغ ہونے کے بعد اس نے جیفری کو تین سکولوں کی "وزٹ" کرانی تھی تاکہ وہ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر سکے اور اس کے بعد اس نے گروسری مارکیٹ سے کچن کے لئے سودا سلف خریدتا تھا۔ جیفری کے لئے یہ شینڈول انہائی دلچسپ تھا کیونکہ اس میں اس کے لئے چار بڑی خوشخبریاں تھیں اول ماں کا دن بھر ساتھ، دوم درلڈزریلیٹ سینٹر کی سیر، سوم سکول کی وزٹ اور چہارم گروسری مارکیٹ سے کینیڈین شہد کی خریداری جو اس کی مرجوب غذا تھی۔ ماریا نے اپنی کاری ایمن میلن کی پرائیوریت پارک میں بھروسی کی، جیفری کا ہاتھ پکڑا اور درلڈزریلیٹ سینٹر کی بلند و بالا عمارت میں داخل ہو گئی، اس کی یہ کہنی کا دفتر اسی عمارت میں تھا، ماریا اور جیفری ابھی بمشکل کہنی کے استقبالیہ تک پہنچنے تھے، ایک خوفناک دھماکہ ہوا، درلڈزریلیٹ سینٹر کی عمارت ایک جانب جگی، گروپبار کا ایک طوفان اٹھا، شیشے کی دیواریں کرچی کر پی ہو کر بکھریں اور لائٹ چلی گئی۔ اب اندر گھپ اندر ہمرا تھیں تھیں، دھواں تھا اور دوڑتے بھاگتے قدموں کی آوازیں تھیں۔ ماریا نے جیفری کو انھیا اور سیرھیوں کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی، سیرھیوں پر سینکڑوں لوگ تھے۔ ایک عجیب قسم کی خوفناک دھمک پیل تھی، کسی کو کسی کی خبر نہ تھی، ماریا خوفزدہ جیفری کو سینے سے لگائے اس بھاگتے دوڑتے، مارتے دھاڑتے ہجوم میں کو دیکھی، وہ ابھی دو منزل یونچے اتری تھی کہ پیچھے سے لوگوں کا تازہ ریلا آیا، ماریا کا پاؤں رپتا، وہ آگے کی طرف جگی اور جیفری اس کے ہاتھوں سے نکل گیا، ماریا نے اپنے لخت جگر کو جا گتی آنکھوں سے لوگوں کے کندھے اور سر وال سے الجھتے اور یونچے گرتے دیکھا، یونچے جہاں سیرھیاں تھیں اور ان سیرھیوں پر درجنوں بلکہ سینکڑوں ہزاروں پاؤں تھے، اب ماریا کو معلوم نہیں ان قدموں میں سے کون سا قدم تھا جو پہلی بار سیرھیوں پر گرے جیفری کے نرم، ملائم، مخصوص اور کمزور جسم سے سکرا یا۔ جیفری نے جیتنے ماری اور پھر اس کے بعد اس کا کمزور، مخصوص، ملائم اور نرم جسم قدموں تک کھلتا چلا گیا یہاں تک کہ جب ماریا وہاں پہنچی تو وہاں خون کے چند دسیوں اور چند پہنچی مسلی آنٹوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ماریا پاگل ہو گئی، ہوش و جواس کھو جیٹھی۔ وہ آج کل نیوجرسی

کے ایک ہسپتال میں زیر علاج ہے۔ اسے جب بھی ہوش آتا ہے، اس کے دماغ میں جیفری کی آخری تصوری انجرا آتی ہے، سیڑھیاں، جیفری، جیفری کا خوف سے ستاپیلا زرد چہرہ، جیفری کی آنکھوں سے ابتنے آنسو اور آخر میں جیفری کے جسم سے نیکتا سرخ لہو، ماریا جیخ مارتی ہے اور دوباہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔

جیفری مر چکا ہے۔ دہشت گردی کا شکار ہو چکا ہے۔ ماریا دہشت گردی کا شکار ہو جائے گی، مر جائے گی۔ خیر مرتونہب بھی جائے گی، نخنے عبداللہ کی ماں نہب ہے یہ تک معلوم نہیں امریکہ کون ہے۔ کتنی دور ہے اور وہ افغانستان سے کیوں ناراض ہے۔ نہب یہ سب کچھ جاننا بھی نہیں چاہتی کیونکہ نہب کی ڈکشنری میں مرنے کے لئے یہ سب کچھ جاننا ضروری نہیں۔ اس کے لئے تو بس اتنا کافی ہے اس کے مخصوص اور بے گناہ عبداللہ نے جب آخری پانچگی لی تھی تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو فرات بہر رہے تھے۔ اس کے سر سے خون کی ایک دھار ابل ابل کرنہب کے دامن میں گر رہی تھی اور اس نے شدید خوف، تکلیف اور اذیت میں اپنی ماں کا بازو پکڑ رکھا تھا۔ عبداللہ نہب کا پہلا اور آخری بچہ تھا، پہلا اس لئے کہ عبداللہ کی پیدائش کے چند ماہ بعد عبداللہ کا باپ شہید ہو گیا تھا اور آخری اس لئے کہ لوگوں کا خیال ہے عبداللہ کے بعد نہب زندہ نہیں رہے گی۔

نخنے عبداللہ بھی دوسرا سینکڑوں، ہزاروں بلکہ لاکھوں افغان بچوں کی طرح دس اکتوبر کی رات اپنی ماں کے ساتھ پلت کر سویا ہوا تھا، وہ اور اس کی ماں ابھی نہیں دہلیز تک ہی پہنچنے تھے آسمان سے روشنی کے گولے اترے، زمین پر گرے، دھماکے ہوئے اور کابل کی فضا خوفناک آوازوں سے گونج آئی، نہب نے خوفزدہ عبداللہ کو سینے سے لگایا اور خیسے سے نکل بھاگی، باہر سینکڑوں لوگ سر ایسیگی کے عالم میں پناہ کی تلاش میں بھاگ رہے تھے۔ نہب بھی ہجوم کی رو میں بہہ گئی لیکن انہوں زیادہ دور نہ جاسکی، اس کا پاؤں رپٹا، وہ گری، عبداللہ اس کے ہاتھ سے نکل کر نیچے گرا، نہب اس کی طرف سر کی لیکن نہب کے پہنچنے سے پہلے وہاں قضا پہنچ گئی۔ قریب ہی ایک گولہ پھٹا، دھات کا ایک گلرا اڑ کر آیا اور عبداللہ کا آدھا سر غائب ہو گیا۔ نہب نے عبداللہ کو گود میں بھر لیا، عبداللہ نے دو توں ہاتھوں سے ماں کا بازو جکڑ کر جھر جھری لی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو یا۔ عبداللہ مر چکا ہے، نہب مر جائے گی۔

میں نے عرض کیا تاں عبداللہ اور جیفری میں کئی چیزیں، کئی باتیں مشترک تھیں مثلاً دونوں بے گناہ تھے، دونوں مخصوص تھے، دونوں بچے تھے اور آخر میں دونوں دہشت گردی کا شکار ہوئے۔ اشتراک تو خیر نہب اور ماریا میں بھی بہت ہے، دونوں مالیں ہیں، دونوں بے گناہ اور مخصوص بچوں کی مائیں ہیں لیکن اس اشتراک، اس تعلق کے باوجود دونوں میں ایک ان دیکھا، ایک ان چھوافرق بھی ہے ایک ایسا فرق ہے دنیا کا کوئی قانون، کوئی قادر، کوئی ضمیر، کوئی اخلاق نہیں مناسکتا۔ یہ فرق امریکہ اور افغانستان ہے۔ جیفری امریکن بے گناہ تھا اور عبداللہ افغان بے گناہ۔ ماریا امریکن ماں تھی اور نہب افغان ماں اور جذہ یوں اور شتوں کی تھی ڈکشنری کے مطابق امریکن ماں

زیادہ ماں اور امریکن بے گناہ زیادہ بے گناہ ہوتا ہے شاید اسی لئے پوری دنیا کی آنکھیں جیفری کے لئے تر ہیں لیکن عبد اللہ کو رونے والا اس دنیا میں کوئی نہیں۔

یہ عجیب بات نہیں ایک بچہ نیویارک میں مرتا ہے تو وہ بے گنا، معصوم اور مظلوم ہوتا ہے لیکن اسی مر، اسی رنگت اور اسی قدر کاٹھ کا دوسرا بچہ کابل میں شہید ہوتا ہے تو وہ گناہگار ہے، دہشت گرد ہے، مجرم ہے، اے خدا، اے میرے خدا، بُش کیوں نہیں جانتا، بُش کیوں نہیں سمجھتا، خون نیویارک میں نہیں یا کابل، قندھار اور جلال آباد میں، آنسو جلال آباد میں پھیلیں، قندھار، کابل یا نیویارک میں ان کا رنگ ایک ہوتا ہے۔ امریکن ماڈل کی آنکھوں سے نیلے آنسو نہیں پکتے اور نہ افغان ماڈل کے دامن میں سبز خون کے دھبے لکتے ہیں۔ امریکہ ہو یا افغانستان خون سرخ اور آنسو آبلی ہوتے ہیں اور، اے میرے خدا، بُش کیوں نہیں جانتا مظلوم، معصوم اور بے گناہ کابل میں مرے یا نیویارک میں اس کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہوتا ہے۔

اے میرے خدا بُش نہیں جانتا، بُش نہیں مانتا لیکن تو تو جانتا ہے، تو تو مانتا ہے پھر تو کیوں خاموش ہے تو کیوں چپ ہے۔ اے میرے خدا تو کہاں ہے۔

مرنے کا حق

ہمارے بابا جی اشناق احمد جوانی میں شہر سے گاؤں آئے تو اپنے خاندانی موچی کے گھر چلے گئے، موچی ایک ان پڑھ دانشور تھا۔ اس نے اشناق احمد سے پوچھا "پھر پڑھ میں تم نے کیا سمجھا" اشناق احمد ان دنوں خود کو بقراط کھجتے تھے۔ انہوں نے موچی پر علمی دھاک بخانے کے لئے کہا "چاچا تم جانتے ہو مکھی کی آنکھ میں تین ہزار اشٹے (عدسے) ہوتے ہیں۔" موچی نے تقدیم لگایا اور اشناق احمد کی طرف دیکھ کر بولا "اتنے شیشوں کا کیا فائدہ وہ بیٹھی تو پھر بھی گوبر پر ہے۔"

میرا خیال ہے، موچی کا یہ جواب ہماری وزارت داخلہ کی نظرود سے نہیں گزرا، ورنہ وہ پاکستان میں ہوم لینڈ سیکورٹی کی طرز پر ونگ بنانے کا فیصلہ نہ کرتی۔ یہ بات بہت دلچسپ ہے۔ ایف بی آئی ہماری وزارت داخلہ کا ایک سپیشل ونگ بنائی کر دے گی، اس ونگ کے چاروں صوبوں میں ذیلی دفاتر ہوں گے۔ امریکہ اس ونگ کو انتہائی حساس آلات فراہم کرے گا، یہ آلات موبائل وین میں نصیب ہوں گے۔ اس موبائل وین سے مشکوک افراد کی سرگرمیوں پر نظر رکھی جائے گی۔ ان حساس آلات کے ذریعے مشتبہ افراد کی بند کرے سے گفتگو سنی جاسکے گی اور ریڈار کی مدد سے مجرموں کا یچھا کیا جاسکے گا۔ یہ سارا انتظام جہادی اور نہدیں تنظیموں کو مانیز کرنے کے لئے کیا جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ صحیح ہے ایف بی آئی کے پاس انتہائی حساس آلات ہیں۔ امریکہ میں ایسے ایکس بڑے سامنے ادارے ہیں جو دن رات ایف بی آئی کے لئے سیکورٹی آلات ایجاد کر رہے ہیں۔ یہ وہ ادارہ ہے جس کے پاس مجرموں کی ہوشی کے آلات ہیں۔ جس کے پاس ایسے آلات ہیں، جو میک اپ اور پلاسٹک سرجری کے نیچے جھاٹک سکتے ہیں۔ جن کے کیروں میں پورے امریکہ کے مجرموں کا ریکارڈ محفوظ ہے۔ جو جنی کوئی مجرم کسی حساس جگہ کے اردوگرد کھاتی دیتا ہے۔ یہ کیرے ذیولی آفسر کے سامنے فوراً اس کی ہستی رکھ دیتے ہیں۔ ان کے پاس ایسے آلات ہیں جن کی مدد سے تین ہزار مکانوں میں ہونے والی گفتگو سنی اور ریکارڈ کی جا سکتی ہے۔ یہ لوگ چھوٹے چھوٹے آلوں کی مدد سے جھوم کے والوں کی دھڑکیں گن سکتے ہیں اور ان دھڑکنوں کی تعداد سے دو ہزار لوگوں میں سے مجرم پہچان سکتے ہیں۔ ان کے پاس ایسے سامنے طریقے ہیں جن سے یہ

فت بال کھیتے بچوں میں جرائم کے رجحانات معلوم کر سکتے ہیں۔ یہ اپنی لیبارٹریوں میں ڈی این اے ٹائٹ کر کے بتا سکتے ہیں فلاں جوزے کا تیسرا بچہ وہشت گرد ہو گا اور پانچوں سیاست دان۔ یہ لوگ چوہوں، بلیوں، طوطوں، اور کاکروں پر جوں سے جائے واردات اور مجرم کا پہاڑا لگا سکتے ہیں۔ یہ سیلاٹ کے ذریعے چلتی گاڑیوں کے چوسز نمبر اور انہجمن بردا کیجھ سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے آپ امریکہ میں کہیں بھی ہوں آپ ایف بی آئی کی نظروں سے دور نہیں۔ پورے امریکہ میں ایف بی آئی کے 56 فیلڈ آفس ہیں۔ ہر فیلڈ آفس "پیش ابجنت ان چارج" کی سربراہی میں کام کرتا ہے۔ یہ فیلڈ آفس تمام بڑے شہروں اور حساس مقامات پر قائم ہیں۔ ان کے پیچے تمام شہروں، قصبوں اور دیہات میں "ریڈیلینٹ ابجنسیز" کا جال بچھا ہے۔ ان ابجنسیوں کے کارندوں کے پاس بے شمار اختیارات ہیں۔ یہ کسی بھی شخص کو، کسی بھی وقت، کسی بھی جگہ روک سکتے ہیں۔ اس کی تلاش لے سکتے ہیں، اس سے پوچھ پرستال کر سکتے ہیں، لاس انجلس، نیویاک اور واشنگٹن ڈی سی کے تین فیلڈ آفس کا بجٹ پاکستان آری کے کل بجٹ سے تین گنا اور پاکستان کے مجموعی اخراجات کے برابر ہے۔ ہر فیلڈ آفس کے پاس اپنے ہیلی کاپٹر، ہوائی جہاز اور موڑ بولس ہیں۔ یہ لوگ کسی بھی ہنگامی صورت حال میں امریکہ کے تمام حکومتی اور پرانیوں اداروں کے وسائل استعمال کر سکتے ہیں۔ ایف بی آئی کا چیف چوہیں گھنٹوں میں کسی بھی وقت امریکی صدر سے رابطہ کر سکتا ہے اور امریکی صدر کا گریس، بیٹھ اور کابینہ سے منظوری لئے بغیر ایف بی آئی کے بجٹ میں اربوں ڈالر کا اضافہ کر سکتا ہے لہذا کہا جاتا ہے۔ ایف بی آئی امریکہ کی انتہائی پارسون، انتہائی مہنگی اور انتہائی جدید ابجنسی ہے لیکن یہاں پہنچ کر وہی سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ موچی اور کمی خورد والا سوال!

ایف بی آئی انتہائی جدید آلات، انتہائی اختیارات اور انتہائی بجٹ کے باوجود ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ نہیں روک سکی، ہیوندا گون کو جاتی سے تو نہیں بچا سکی، اوکلا ہوما میں بھم دریافت نہیں کر سکی اور صدر کینیڈی کی خلافت نہیں کر سکی۔ ذرا سوچئے جس ابجنسی کے وسائل، جس ابجنسی کی مہارت اور جس ابجنسی کے اختیارات فلسطینیوں کو خودکش حملوں سے باز نہیں رکھ سکے، جس ابجنسی کے آلات اسرائیلوں کو اسرائیل میں تحفظ نہیں دے سکے، جس کے سیلاٹ، جس کے ریڈار، جس کے بوسٹننے والے آلات اور جس کے پلاست سرجی کے پیچے جھاگٹنے والے کیسرے اسامہ بن لادن اور طاعر کا کھونج نہیں لگا سکے، جس کی مہارت، جس کی حالات، واقعات اور شواہد جاٹھنے کی صلاحیت امریکی سفارت خانوں پر حملوں کا سد باب نہیں کر سکی، وہ پاکستان اور پاکستانیوں کو کیا تحفظ دے گی؟ ذرا سوچئے اس سائنسی کمال، اس نیکنا لوچی ریوولوشن اور اس تاریخی اختیار کے باوجود امریکہ کے پاس اپنے شہریوں کو بچانے کا صرف ایک طریقہ ہے وہ اپنے شہریوں کو "پاکستان چھوڑ دو" کا مشورہ دیتا ہے وہ انہیں دروازے بند رکھنے، کیس ماسک سرہانے رکھنے، مسجدوں اور مدرسوں سے دور رہنے اور مسلمانوں سے کم سے کم رابطے کے مشورے دیتا ہے لیکن ہمارا کمال دیکھنے ہم اس ادارے، اس

ایجنسی کی مدد سے پاکستان میں پیش و نگہ بنا دیں گے، ہم ان ماہرین کے تعاون سے اپنے ملک سے دہشت گردی ختم کر دیں گے جو دن لذت بریہ سفر تباہ ہونے سے نہیں بچا سکے۔ ہم ان مہارتوں، ان سامنی کمالات کے ذریعے پاکستان میں دہشت گردی کی وجوہات تلاش کر دیں گے جو دس ماہ کی سروٹ کوششوں کے باہم جو دیگر ایجاد ستمبر کی وجہ دریافت نہیں کر سکے، ہم ان موبائل وینوں کی مدد سے پاکستان میں مجرم پکڑ دیں گے جو اربوں ڈالر خرچ کرنے کے باوجود دن لذت بریہ سفر اور پینا گون کے اصل ملزمون تک نہیں پہنچ سکیں اور جو صدر نیندی کے اصلی قاتل کا فیصلہ نہیں کر سکے۔ اگر یہ لوگ، اگر یہ ادارے اتنے ہی کرشمہ گر، اتنے ہی شعبدہ ہاں ہیں تو امریکہ میں نیند کی دوا دیں کیوں ناپیدہ ہو رہی ہیں۔ امریکیوں کو نیند کیوں نہیں آ رہی، امریکی صدر اور نائب صدر ایک گاؤں، ایک جہاز میں سفر کیوں نہیں کرتے اور امریکی سفارت کار بھیں بدلتے، شلوار قمیص پہن کر باہر کیوں نکلتے ہیں۔

بات اتنی ہی ہے آپ ایجنسیوں، سیلیٹسٹوں، ریڈاروں، آلوں، گولیوں اور سکینزوں سے انہیں ڈرا سکتے ہیں جو موت سے ڈرتے ہیں جس بندے نے مرنے کا فیصلہ کر لیا ہو دنیا کی کسی ایجنسی، کسی ادارے، کسی یورو کے پاس اس کا کوئی توڑ نہیں ہوتا، آپ آٹھ ہزار دو سو بارہ سیلیٹسٹ لے آئیں۔ زمین کی ایک ایک انج چیکنر لگادیں مگر آپ اس ٹھنڈ کے قہر سے نہیں بچ سکیں گے جو جان یعنی پر رکھ کر براہر آ گیا ہو۔ آپ دنیا کے ہر ٹھنڈ سے زندگی کا اختیار لے سکتے ہیں لیکن آپ اس سے اپنی مرشی کی موت مرنے کا حق نہیں چھین سکتے۔ لایئے اب آپ ایسی ونگ اور ایسی مشین لایئے جوانسان سے مرنے اور مارنے کا حق چھین سکتا!



کامی کازی

ایڈرل "یاما کا شیر و اونٹی کو" پہلا جاپانی تھا جس نے خود کشی کو باتا تھا مدد و ہمکت عملی بنایا۔

1944ء میں جاپان نگفت کے دہانے پر پہنچ چکا تھا۔ امریکی بحریہ مارٹی و حاڑتی آگے ہوتی چارہ تھی۔ یاما کا شیر و کے ذہن میں آئیڈیا آیا۔ اس نے سوچا "کیوں نہ جاپانی خون میں شامل خود کشی کی خواہش کو وار کا بچ کی شکل دے دی جائے۔" اس نے جاپان بھر سے 27 نوجوان بچ کے اور 20 برس سے کم عمر ان نوجوانوں کو جہاز اڑانے کی تربیت دی جب یہ نوجوان پائلٹ بن گئے تو جاپانی فضائیہ اپنے لڑاکا طیاروں میں نصف ٹن بارود بھرتی اور یہ طیارہ کسی نوجوان پائلٹ کے حوالے کر دیتی، پائلٹ طیارہ اڑاتا اور سیدھا امریکی شہری کے کسی بحری جہاز پر جاگرا تا۔ 25 اکتوبر 1944ء سے جنوری 1945ء تک تین ماه میں جاپان نے اپنے 2604 حصے جن میں ہر اکٹس میں امریکہ کے 40 اور فلپائن میں 16 حصے بحری جہاز تباہ ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں امریکی بحری کی کرنٹوٹ گئی اور امریکی نیول چیف وائٹ ہاؤس کو "آخری ہتھیار" کے استعمال کا مشورہ دینے پر مجبور ہو گیا۔ ان نوجوان پائلٹوں کو جاپانی قوم "کامی کازی" کہتی تھی۔ ان فدائیوں نے جاپانیوں کے بارے میں "نگنے، ست رو اور بزدل" کا مفریقی قصور توڑ دیا۔ زیمنی مجازوں پر بھی جاپانی نوجیوں کا رو یہ "کامی کازی" جیسا ہوتا تھا۔ یہ لوگ خون کے آخری قطرے تک لڑائی کے قابل تھے۔ جاپانی نوجی جب لڑتے لڑتے بے بس ہو جاتے تو موت کو پسپائی یا نگفت پر فوکیت دیتے۔ ہر جاپانی نوجی کی جیب میں تیز استرا ہوتا تھا نگفت کے قریب پہنچ کر وہ استرے سے اپنی شرگ کاٹ لیتا تھا۔ شاید کہی وجہ تھی دوسری جنگ عظیم کے دوران جاپانی قیدی نہ ہونے کے برادر تھے۔

کامی کازی کی اس سوچ نے اتحادیوں کو ہلاک رکھ دیا۔ ان کا خیال تھا جو قوم بارود باندھ کر بحری جہازوں پر کو دیکھتی ہے اسے نگفت نہیں دی جا سکتی لہذا امریکہ آخري ہتھیار استعمال کرنے پر مجبور ہو گیا یوں 16 اگست 1945ء کو صبح آٹھ بج کر پندرہ منٹ پر پہلے ہیر و شیما اور پھر 19 اگست کو دن گیارہ بج کر دو منٹ پر ناگا ساگی پر اسٹم بم گرا دیا گیا۔ ہیر و شیما میں ایک گھنٹے میں 42 ہزار 95 اور ناگا ساگی میں 74 ہزار لوگ ہلاک ہوئے جبکہ تباہی و بر بادی کا سلسلہ آگے ہوتا چلا گا۔ ان دو دھماکوں نے جاپان کی کمر توڑ دی۔ جاپان نے ہتھیار پھینک دیئے۔ اتحادیوں نے جاپان کو جزل ڈگس میکا قصر کے حوالے کر دیا۔ جزل میکا تھر ایک

زیریک، معاملہ فہم اور سمجھدار کمانڈر تھا۔ وہ 1945ء سے 1952ء تک جاپان کا "حکمران" رہا۔ اس نے اپنے قبضے کے ابتدائی مہینوں میں جاپان اور جاپانیوں کے بارے میں دلچسپ و ستاویز تیار کی جس میں اس نے جاپان کی صورتحال پر روشنی ڈالی۔ اس نے کہا جاپانیوں میں خودکشی کا قدرتی رجحان پایا جاتا تھا۔ جگ نے اس رجحان کو مقدس فریضے کی شکل دے دی۔ ہم نے ایتم بم گرا کہ اس فریضے کو انتقام کا نام دے دیا۔ اب ہیر و شیما اور نا گا ساگی کے بعد تمام جاپانی شہریوں کی زندگی کا ایک ہی مقصد ہے۔ "امریکہ کو تباہ کرنا، امریکیوں کو قتل کرنا" اگر ہم نے فوری طور پر اس سوق کا رخ نہ بدلتا تو پورا جاپان کا می کازی بن جائے گا اور ہر جاپانی اپنے ساتھ دس میں امریکی لے مرے گا۔ میکا تھر نے اس خطرے سے پہنچنے کے لئے ایک فارمولہ بنایا۔ امریکی حکومت کی منظوری کے بعد اس فارمولے کو 1947ء میں جاپان کا آئین بنادیا گیا۔ آئین کے تحت جاپان سے جاگیرداری نظام ختم کر دیا گیا، خفیہ پولیس کا مکمل بند کر دیا گیا۔ نوجوان کو رائے دہی کا حق دے دیا گیا اور تعلیم عام کر دی گئی۔ میکا تھر کا کہنا تھا، ہم صرف تعلیم سے جاپانی ڈہن بدل سکتے ہیں۔ ہمیں مستقبل کے خطرات سے پہنچنے کے لئے جاپانیوں کے بارے میں امریکی دلوں میں موجود نفرت ختم کرنا ہوگی۔ جاپانیوں کے لئے اپنے تعلیمی اداروں کے دروازے کھولنا ہوں گے۔ لہذا اس دور میں امریکہ نے اپنے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جاپانیوں کو دھڑا دھڑ دھڑے دینا شروع کر دیئے۔ دوسری طرف میکا تھر نے جاپان میں دانشوروں کا ایک ایسا طبقہ پیدا کیا جو جاپانی نوجوانوں کو یہ بتاتا تھا جنگ کا رخ بدل چکا ہے۔ اب ہم اگر امریکہ سے بدلہ لینا چاہتے ہیں تو ہمیں ٹینکنوں کی بجائے کارخانے لگانے ہوں گے، تو پوں کی جگہ لیبارٹریاں بنانا ہوں گی، یہ سلسلہ سالوں تک چلتا رہا یہاں تک کہ 1972ء میں جب امریکی فوج "اوکی نیوا" سے نکلی تو جاپانی سوق تبدیل ہو چکی تھی۔ کامی کازی کا شکار جاپان صنعت و حرفت اور سائنس و تکنالوجی کے دور میں داخل ہو چکا تھا۔ آج وہی جاپان دنیا کی دوسری بڑی اکاؤنٹی ہے۔ اسکے پاس دنیا میں سب سے زیادہ مالیاتی ذخایر ہیں اور اس کا لوہا دنیا کے تمام بازاروں میں سونے کے بھاؤ بکتا ہے۔

یہ سب میکا تھر اور اس کی سوق کا کرشمہ تھا۔ اگر اس وقت وہ زیریک جزل بھی چارج بش، رمز فیلڈ یا کون پاؤں کی طرح سوچتا اور غاروں میں چھپے جاپانیوں کو نکال کر مارنا شروع کر دیتا تو آج شاید دنیا میں امریکہ کا نام و نشان تک نہ ہوتا کیونکہ جوش انتقام سے ابھتے جاپانی امریکے میں پھیل جاتے اور پورے امریکہ کو بہوں سے ازادی یہیں دعا کیں دے امریکہ اس سمجھدار اور معاملہ فہم جزل کو جس نے جاپانی سوق کو بدل کر امریکہ اور امریکیوں کو بچالیا۔ آج تھیک 57 برس پھر وہی صورتحال ہے۔ امریکہ عالم اسلام میں اپنے خلاف ہزاروں لاکھوں کامی کازی اور اکھڑا کر چکا ہے، یہ کامی کازی امریکہ اور امریکیوں کو تباہ کرنے کے لئے کربانہ ہے بیٹھے ہیں۔ حزب اللہ ہو، عمل ملیشیا یا شامی سو شہنشاہی، بعث پارٹی ہو، لہٰنی کیونٹ پارٹی ہو، الدعوۃ، فلسطینی اسلامی جہاد، الاقصی شہدار گلیڈ، آرمڈ اسلامی گروپ، مولی جماعت اسلامیہ، کردستان در کرز پارٹی،

چین جانباز، طالبان، جیش محمد یا القاعدہ ان اسلامی تنظیموں کے لاکھوں جوان سروں پر کفن باندھ کر گلی گلی امریکیوں کو تلاش کر رہے ہیں یہ جوان نفرت اور انتقام کے سلسلے ایتم ہیں۔ جن دن ان بھوں کو پھٹنے کا موقع مل گیا، یہ دنیا کے استعمار کو اس طرح جزوں سے ہلا دیں گے جس طرح فلسطینیوں نے اسرائیلی جزیں ہلا دی ہیں چنانچہ اب امریکہ کے پاس اپنے بچاؤ کا صرف ایک ہی راستہ ہے وہی راستہ جس کا انتخاب میکار تھر نے کیا تھا۔ امریکہ القاعدہ کے جوانوں کو عام معافی دے دے اور ان تمام مسلم ممالک جن میں ان تنظیموں کی "روٹس" موجود ہیں ان کے جوانوں پر اپنی یونیورسٹیوں کے دروازے کھول دے۔ ان جوانوں کے ذہن میں یہ بات بخدا دے "تم لوگ ہم اور رانکلوں سے امریکہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اگر تم لڑتا چاہتے ہو تو یہاڑیوں میں آ کر امریکہ کا مقابلہ کر دو" انہیں باور کرائے بندوق اور توپ پر تو کسی نہ کسی کا قبضہ ہو سکتا ہے لیکن علم، کتاب اور تحقیق کوئی نہیں چھین سکتا۔ آؤ جاپانیوں کی طرح ہمیں اس میدان میں شکست دو جس کی راہ میں کوئی وزیرستان، کوئی شبرغان اور کوئی تو را بور انہیں آتا۔

یاد رکھنے اگر آنے والے چند ہمیں میں امریکہ نے میکار تھر کی طرح نہ سوچا تو دنیا میں امریکہ کا نام و نشان نہیں رہے گا۔

منزل اب دور نہیں

میں نے گاڑی کی ہینڈ لائٹ خریدنی تھی، میں "سلطان دے گھوہ" چلا گیا، یہ پنڈی کا بال چٹجھ ہے، اس میں گاڑیوں کے سینڈ ہینڈ پارٹس کی سیکنڈروں دکانیں ہیں۔ میں ایک دکان میں داخل ہوا، دکاندار نے پوچھا "لیفٹ یا رائٹ" میں نے جواب دیا "لیفٹ" اس نے دوڑی سے ہاتھ بладیا، میں دوسرا دکان میں داخل ہوا۔ اس نے بھی وہی سوال کیا، میرا جواب سن کر ہاتھ کے اشارے سے آگے روانہ کر دیا، میں چھٹی ساتوں دکان میں داخل ہوا تو ہمت جواب دے گئی، یہ دکاندار بھلا غص تھا۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے دو لامیں میرے سامنے رکھیں، ایک دامیں تھی، دوسرا بائیں۔ میں نے ریت پوچھا، دکاندار نے پہلے دامیں پر ہاتھ درکھ کر نرخ بتائے، پھر بائیں کی قیمت بتائی۔ دونوں کی قیمت میں فرق تھا۔ میں نے وجہ پوچھی تو دکاندار کو پھری دار ہی کھجرا کر بولا "صاحب گاڑیوں کے بائیں پارٹس دامیں سے مبتلے ہوتے ہیں" میرے چہرے پر حیرت ہلکوڑے لینے لگی، اس نے بالوں میں چیپی ٹھوڑی پر باقاعدہ خارش کی "صاحب یہ انسان کی فطرت ہے جو اپنی جان کو دنیا کی سب سے قیمتی چیز سمجھتا ہے لہذا جب گاڑی سامنے سے ٹکڑانے لگتی ہے تو ڈرائیور خود کو بچانے کے لئے شیر چک دامیں کاٹ دیتا ہے جس کے نتیجے میں گاڑی کا بایاں حصہ تباہ ہو جاتا ہے لہذا آپ دنیا جہاں کے سینڈ ہینڈ پارٹس کی مارکیٹیں پھر لیں آپ کو ان میں بائیں حصے کے پسیئر پارٹس کم ملیں گے اور یہ تجارت کا اصول ہے جو چیز کم ہوتی ہے، وہ مہنگی ہوتی ہے۔"

میں واپسی پر سارا راستہ سوچتا رہا، بنیادی جیلوں کی اس سے اچھی کوئی مثال نہیں ہو سکتی، ہر انسان اپنے ساتھ تین جیلوں لے کر پیدا ہوتا ہے۔ بھوگ، جنس اور خود کو زندہ رکھنے کی اہل خواہیں۔ ان غرضوں کو نفیات بنیادی جیلوں یا "بیک انگلیس" کہتی ہے۔ باقی تمام جیلوں ان تینوں کے طالب سے جنم لیتی ہیں۔ اگر ہم ان تینوں کا تجربہ کریں تو ہمیں ان میں سے "خود کو زندہ رکھنے کی خواہش" سب سے اہم محسوس ہوگی۔ انسان، وہ چیز، ہر جذبے پر قادر ہو سکتا ہے لیکن جہاں اس کی بنا کا معاملہ آتا ہے وہاں وہ کوئی سمجھوٹ نہیں کرتا، اسے زندہ ہنے کے لئے اپنے گھر بار، خاندان، یہوی بچوں یہاں تک کہ اپنے جسمانی اعضا تک کی قربانی دینی پڑتی ہے تو وہ دریغ نہیں کرتا۔ آپ کسی ایسے شخص سے ملیں جو اپنے دونوں ہاتھوں، دونوں ہاتھوں، دونوں آنکھوں اور دونوں کانوں سے محروم ہو۔ آپ کو اس میں بھی زندگی کی اتنی ہی خواہش ملے گی جتنی ایک عام

نارمل انسان میں ہوتی ہے۔ زندہ رہنے کی خواہش خطرے کے وقت باقی خواہشوں پر غالب آ جاتی ہے۔ آگ لگ جائے، سیلا ب آ جائے، ذرا لے کے جھکلے محسوس ہونے لگیں یا کوئی غیر مریٰ آفت آ جائے تو لوگ اپنے بچے، اپنے بہن بھائی چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ حادثے کے وقت ڈرائیور گ سیٹ پر بیٹھا شخص خود کو بچانے کے لئے دوسری سیٹ پر بیٹھے شخص کو خطرے میں ڈال دیتا ہے خواہ اس سیٹ پر اس کا اپنا بچہ، اپنی بیوی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ہے بخیادی جلت کی قوت، انسٹینکٹ کی طاقت جو انسان کی تمام تر اخلاقیات، تمام ترجیحوں پر حاوی ہے، میں سوچا کرتا تھا اسلام نے شہید کو اتنا رتبہ کیوں دیا، وہ کون سی خوبی ہے جس کی وجہ سے اللہ اپنی راہ میں جان کا نذرانہ پیش کرنے والوں کو اپنے دیدار سے نوازتا ہے۔ پتہ چلا شہید وہ شخص ہوتا ہے جو "خود کو زندہ رکھنے کی اہل خواہش" پر قابو پا لیتا ہے، جو جان کو اس کی امانت سمجھ کر اسی کو لوٹا دیتا ہے لہذا اللہ اس شخص کے لئے اپنے تمام دروازے کھول دیتا ہے۔

"سلطان دے گھوہ" سے لوئٹتے ہوئے مجھے خودگش بھوں کے ذریعے شہادت پانے والے فلسطینی نوجوان دنیا کی سب سے بڑی انسانی طاقت محسوس ہوئے، وہ قوت جس نے اپنی بخیادی جلت پر قابو پا لیا جس نے ثابت کر دیا دنیا میں انسان سے بڑی نیکنا اوجی نہیں اور جذبے سے بڑا کوئی ہتھیار نہیں۔ ان نوجوانوں کی کہانی دلچسپ ہے۔ ان نوجوانوں نے پہلے اسلامی دنیا کے علماء کے ایک بورڈ سے "یہ موت نہیں شہادت ہے" اکا باقاعدہ لغو کیا اپھر ان نوجوانوں نے اپنی صنوں سے چن چن کرو، لوکیاں اور لڑکے الگ کے جواناتھائی خوبصورت، انتہائی پڑھے لکھنے اور انتہائی جوان تھے۔ پھر ان نوجوانوں کی فہرست بنائی گئی۔ دلچسپ بات یہ ہے اس فہرست میں شامل تمام نوجوان تیرہ سے اخخارہ سال کے درمیان ہیں۔ پھر ان نوجوانوں کو مشن سونپا گیا، یہ نوجوان مشن پرروائگی سے قبل تصویر کھنچو گتے ہیں، اپنا "سی وی" بناتے ہیں، اپنے بدن پر بم باندھتے ہیں اور پھر یہودیوں کے کسی سور، کسی ریسٹوران، کسی بس میں بیٹھ کر بم کی چین کھینچ دیتے ہیں۔ بم پھینکنے کے کچھ دیر بعد اس شہید کے ساتھی اس کی ایک ہنسی مکراتی تصویر اور پروفائل عالمی ذرائع ایجاد کے حوالے کر دیتے ہیں۔ یہ سلسلہ پچھلے دو ماہ سے جاری ہے۔ وقت گز نے کے ساتھ ساتھ اس میں شدت آتی جا رہی ہے، اسرائیل میں ان جملوں کے بعد یہ عالم ہے کوئی یہودی ذہل روئی خریدنے کے لئے بھی مارکیٹ جاتا ہے تو نکلنے سے پہلے بلٹ پروف جیکٹ اور ہیامٹ پہن لیتا ہے۔ لوگ اب اسرائیل سے باقاعدہ لفظ مکانی کر رہے ہیں لہذا اعداد و شمار اور حالات و واقعات نے ثابت کر دیا وہ کام جو پچھلے 40 برس میں 157 اسلامی اور اسرائیل کے گرد اگر آباد 22 مالک نہیں کر سکے وہ ان چند نوجوانوں نے پچاس دنوں میں سرانجام دے دیا۔

گولڈا مائیر "در آف اسرائیل" تھی، اسے اسرائیل کی پہلی لیبر نیشنر، دوسری وزیر خارجہ اور پہلی خاتون وزیر عظم کا عنزاً بھی حاصل تھا۔ اسرائیل کو اسرائیل بنانے میں اس کا نوے فیصد ہاتھ تھا۔ ہالی وڈنے

در آف اسرائیل گولڈا مائیر پر بڑی خوبصورت فلم بنی۔ فلم کے آخری میں میں جب گولڈا مائیر سے پوچھا جاتا ہے اس خطے میں اُن کب قائم ہو گا تو وہ جمال الناصر سے کہتی ہے ”جب تک عرب اپنے بچوں سے اتنا پیار نہیں کرتے جتنا وہ اسرائیل سے نفرت کرتے ہیں اس خطے میں اُن قائم نہیں ہو سکتے“، فلسطینیں کے ان بچوں نے گولڈا مائیر کی تھیوری غلط ثابت کر دی، انہوں نے ثابت کر دیا ”جب تک اسرائیلی ماں میں بھی اسرائیل سے اتنی نفرت نہیں کرتیں جتنی عربی ماں میں کرتی ہیں دنیا میں اُن قائم نہیں ہو سکتا۔“ ان معصوم بچوں کی شہادت پوری دنیا کے سامنے اعلان ہے، فلسطینی ماڈل کے دلوں میں اللہ کی یاد اولاد کی محبت پر غالب آ جاتی ہے۔ دنیا جہان کے ذرائع ابلاغ سے نشر ہوتی تیرہ، چودہ، پندرہ سال کے شہیدوں کی یہ مسکراتی تصویریں ثابت کرتی ہیں۔ اب فلسطینی نوجوان انسان کی بیادی جلت، خود کو زندہ رکھنے کی اُن خواہش کو تکست دے چکے ہیں اور جب کوئی انسان اپنی سب سے بڑی خامی پر قابو پالیتا ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے تکست نہیں دے سکتی۔ موت کا خوف انسان کا سب سے بڑا خوف ہوتا ہے جو شخص اس خوف پر قابو پالے اسے پھر کوئی غلام نہیں رکھ سکتا۔ یقین کجھ مجھے فلسطینی کی آزادی اس طرح نظر آ رہی ہے جس طرح صبح کی کرنیں میرے سامنے کھڑی دستک دے رہی ہیں۔ میرا دل کہہ رہا ہے اب منزل دو رہیں۔

Kashif Azad @ OneUrdu.com

رمز فیلڈ کے گلے میں ہارڈ ایس

25 نومبر 2001ء کو رشید دوستم اور طالبان کے مابین معابدہ ملے پا گیا، دوستم نے وعدہ کیا طالبان نے ہتھیار ڈال دیئے تو افغانوں کو گھر جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔ پاکستانیوں کو ان کی حکومت کے حوالے کر دیا جائے گا اور عرب اقوام متحده کے پروگرام کے جامیں گے۔ معابدہ ہو گیا، میں الحق نصیری گواہ بن گئے۔ طالبان نے ہتھیار ڈال دئے لیکن دوستم نے معابدہ کے برعکس طالبان کو نزغے میں لے لیا۔ انہیں قیدی ہالیا، ان لوگوں کو چند روز صحراء میں رکھا گیا، پھر 40 فٹ لمبے، 8 فٹ چوڑے اور 8 فٹ اونچے کنٹیز لائے گئے۔ ان افغان، پاکستانی اور جیجن "جنگی قیدیوں" کو داڑھیوں، بالوں اور گردنوں سے پکڑ کر گھینٹا گیا اور اخنا کر کنٹیز میں پہنچ دیا گیا۔ ایک ایک کنٹیز میں وہ دو لوگ ٹھوک دیجے گئے۔ کنٹیزوں کے وروازے بند کر دیجے گئے، کنٹیزوں کی منزل شہر غان تھی۔ کنٹیز چلے تو چند ہی لمحوں میں اندر جس ہو گیا۔ لوگوں نے دیواروں پر تھہ دے، سکے اور نکریں مارنا شروع کر دیں لیکن جب کوئی سنوائی تھے ہو کی وہ لوگ ایک دوسرے کا پسند چانے لگے، پسند خیک ہو گیا تو وہ غنی کی تھاں میں پاگلوں کی طرح ایک دوسرے کو کائے لے، ایک دوسرے کا خون چوٹے لگے، ایک کنٹیز کے ڈرائیور محمد نے شور کی آواز سنی تو اس کے دل میں رحم جاگ گیا۔ وہ کنٹیز روک کر پیچے گیا اس نے دیکھا کنٹیز کی ایک درز سے انسانی زبان لٹک رہی ہے "جنگی قیدیوں" نے محمد کو خدا اور رسول ﷺ کا واسطہ دے کر پانی کی بھیک مانگی، محمد نے ایک بوتل میں تھوڑا سا پانی ڈالا اور بوتل اندر پھینک دی، اندر سے الحمد للہ کی آواز آئی اور تمام لوگوں نے پانی کا ایک ایک قطرہ اپنی زبان پر ٹکالیا۔ دشت لیلی پہنچ کر کنٹیز کھول دیئے گئے۔ کنٹیز نعشوں سے ائے پڑے تھے، جو چند ایک لوگ زندہ تھے وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکے تھے، ان نعشوں کو وہیں دشت لیلی میں گڑھا کھود کر غسل، کفن اور جنازے کے بغیر دفن کر دیا گیا جبکہ زندہ نیچے والوں کو شہر غان پہنچا دیا گیا۔ ایک بیٹھے بعد لوگوں نے دشت لیلی میں گددہ منڈلاتے دیکھے تو پریشان ہو کر گھروں سے نکل پڑے۔ ان کے سامنے ایک وسیع میدان میں انسانی ہڈیاں پڑی تھیں۔ زمین تازہ کھدی اور تازہ ہی بھری تھی، کھدائی کی گئی تو پہنچ فٹ گھرے اور چھوٹ چوڑے ایک گڑے سے پندرہ نوجوانوں کی نعشیں برآمد ہوئیں، نعشوں کے جسموں پر تشدید کا کوئی نشان نہیں تھا۔ دیکھنے والے نعشیں دیکھتے ہی

پکارائے، انہیں کنٹینر میں بند کر کے مارا گیا۔

شہر غان کے ان بد نصیب قیدیوں کی داستان پر ڈنگا بھی میں رہتی تھیں اللہ بھلا کرے ہیں گے لینڈ کا جو 2002ء کے شروع میں افغانستان گیا، اس نے اجتماعی قبروں پر تحقیق کی اور جولائی کے وسط میں تاریک راہوں کے ان بد قسمت راہیوں کا احوال دنیا کے سامنے رکھ دیا، ہینگ لینڈ بوشن کا رہنے والا ہے۔ پیشے کے لحاظ سے فزیشن ہے لیکن اسے اجتماعی قبروں پر تحقیق کا خط ہے۔ وہ افغانستان سے پہلے رو اندا، سری لنکا اور بوسنیا میں اجتماعی قبریں دریافت کر چکا تھا۔ ہینگ لینڈ نے پہلی بار اکشاف کیا شہر غان میں یہ ظلم امریکی فوج کی کمپنی 595 کی نگرانی میں ہوا، اس کمپنی کی کمان امریکی کپتان نٹھے کے پاس تھی، نٹھے کو اپریل 2002ء میں "اعلیٰ خدمات کے عوض کیساں مٹی کی اسیلی نے اعزاز سے بھی نواز، ہینگ لینڈ ہی نے اکشاف کیا قبل کے اس طریقے کا موجود از بک جزل ملک پہلوان تھا۔ ملک پہلوان نے 1997ء میں 1250 طالبان کنٹینر میں بند کئے اور پھر یہ کنٹینر صحرائیں چھوڑ دیے، دو دن بعد کنٹینر کھولے گئے تو تمام قیدیوں کے جسم جل کر کوئلہ ہو چکے تھے۔ ہینگ لینڈ کے ذریعے ظلم کی یہ داستان یورپ اور امریکہ پہنچی تو لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جرم کی پارلیمنٹ نے کہا "ہمیں آج انسان ہونے پر شرمندگی ہے۔" اگر نہیں ہوا تو صدر بیش، رمز فیلڈ اور کوئن پاؤں کو افسوس نہیں ہوا کیونکہ اس وقت تک ان لوگوں نے جنیوا کنوش کا متن نہیں پڑھا تھا۔ ان لوگوں کو معلوم ہی نہیں تھا جن جنگی قیدیوں کے لیا حقوق ہوتے ہیں اور معاملہ کے بعد بھی رہا تھا اس لئے فوجوں کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہیے۔ یہ لوگ جانتے ہی نہیں تھے اجتماعی قبریں انسانیت کی کتنی بڑی تو ہیں ہوتی ہیں اور انہیں معلوم ہی نہیں تھا دنیا کا فرض ہے مرنے والے کو اس کے مدھب، اس کی رسم و رواج کے مطابق فن کیا چاہے۔ کوئن پاؤں، رمز فیلڈ اور صدر بیش کو معلوم ہی نہیں تھا دنیا کا کوئی قانون، کوئی ضابطہ اور کوئی اخلاقی قدر انسان کو کنٹینر میں بند کرنے کی اجازت نہیں دیتی، ا لوگوں کو جس اور پیاس کی موت نہیں دیتی!

حیرت ہے وہ لوگ، وہ قوم جو سیکڑوں جنگی قیدیوں کو دشت یتلی میں فن کرنے والے کیپن نٹھے کو ایوارڈ دیتی ہے، اس کمپنی کو قومی ہیر و گردانی ہے جس کی نگرانی میں جنگی قیدیوں کو کنٹینر میں بند کیا گیا۔ پھر ان کنٹینر میں سے نکالی گئیں اور پھر یہ نہیں گھیت کر گڑھوں میں ڈال دی گئیں لیکن وہی قوم، وہی لوگ اور وہی لیڈر ٹیلی دیڑان پر اپنے 35 جنگی قیدیوں کی فلم دکھانے پر واپس کر رہے ہیں۔ اسے جنیوا کنوش کی خلاف ورزی قرار دے رہے ہیں۔ جی چاہتا صدام حسین کو مشورہ دیں وہ مورچے سے نکلیں، واشنگٹن جا کر رمز فیلڈ کے گلے میں ہار ڈالیں اور عرض کریں "حضور ہم آپ سے نہیں لڑ سکتے" وہ حیرت سے وجہ پوچھیں تو عرض کریں "جناب عالی فوج سے تو لا جا سکتا ہے لیکن منافقوں سے جنگ نہیں ہو سکتی۔"



ہمیں ڈکشنریاں بدلتا ہوں گی

آج گیارہ دسمبر ہے، 11 ستمبر کو گزرے آج پورے تین ماہ ہو چکے ہیں، آج امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک میں ولڈریڈ سنپروں میں مارے جانے والوں کا سوگ منایا جائے گا۔ آج صحیح کے نھیک پونے تو بچے امریکہ میں سائزِ بجائے جائیں گے، قومی ترانے گائے جائیں گے اور مرحومین سے "انہمار یتھی" کے لئے تعزیتی تقریبات منعقد کی جائیں گی، یہ تقریبات، یہ ترانے اور یہ سائزِ امریکہ کے اتحادی ممالک میں بھی بجائے اور گائے جائیں گے۔ جن ممالک کے لئے قومی ترانے بجا نہ ممکن نہیں ہوگا وہ سوگوار ڈسیس بجا کر ولڈریڈ سنپروں میں مارے جانے والے مخصوص اور بے گناہ لوگوں کے دکھ میں شریک ہوں گے، اس سارے پروگرام کے آرکیٹ اور کمانڈر صدر جارج ڈبلیو بوش ہیں۔ انہوں نے 6 دسمبر جمعرات کوتاروے کے وزیرِ اعظم کے ڈکشنریاں پر بیان کیا ہے ان سوا رفاقتیات کا اعلان کیا اس کا کہنا تھا جس طرح اتحادیوں نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکہ کا ساتھ دیا باکل اسی طرح گیارہ ستمبر کے واقعے میں مرنے والوں کے سہ ماہی سوگ میں بھی پوری دنیا کو امریکہ سے محبت اور دوستی کا ثبوت دینا چاہیے۔

ہم بھی امریکہ کے اتحادی ہونے کی حیثیت سے اس غم میں برابر کے شریک ہیں، ہمیں آج بھی سائزِ بجائے، ترانے گائے اور تعزیتی تقریبات برپا کرنی چاہیے، ہو سکتا ہے جب یہ طریق شائع ہو رہی ہوں تو پاکستان بھی سرکاری سطح پر گیارہ ستمبر کو یوم سوگ قرار دے چکا ہو اور پورا ملک ولڈریڈ سنپروں کے مرحومین کے غم میں ڈوب چکا ہو، ہمیں ایسا کہتا بھی چاہیے کیونکہ انسان ہونے، ایک مہذب، حاس اور ہمدرد قوم ہونے کی حیثیت سے ہمیں بھی مخصوص اور بے گناہ لوگوں کی بلاکت کی شدید نہ مرت کرنی چاہیے، ہمیں مسلمان کی حیثیت سے بھی دنیا کے ہر مظلوم، ہر بے کس اور ہر بے گناہ کا ساتھ دینا چاہیے، گلوبل ولیج کے شہری کی حیثیت سے بھی ہمیں اپنے ساتھیوں، اپنے ہمایوں اور اپنے پارٹنپروں کی خوشی اور ٹھی میں برابر شریک ہونا چاہیے لیکن تعزیتی تقریبات منعقد کرتے ہوئے، ترانے گاتے اور سائزِ بجائے وقت ہمیں ایک آدھ چیز، ایک آدھ اور بات کا خیال بھی تو رکھنا چاہیے، ہمیں یہ بھی تو طے کرنا چاہیے مرحوم کون ہے، مظلوم کون ہے، بے گناہ اور مخصوص کون ہے۔

اگر واقعی مخصوص، بے گناہ اور مظلوم وہ لوگ ہیں جو کسی جرم، کسی گناہ، کسی غلطی کے بغیر ان دیکھی

موت کا شکار ہو گئے تو پھر ہمیں وقت نکال کر ہیر و شیما اور ناگا ساگی کے ان بے گناہوں، مظلوموں اور مخصوصوں کے لئے بھی سائز بجانے، ترانے گانے اور تعزیتی تقریبیں کرنا پڑیں گی جو قدرت کی غلطی سے جاپاں میں پیدا ہو گئے تھے۔ جن کا جنگ چھیرنے میں رتی برابر حصہ نہیں تھا، جو جاپانی جرنیلوں سے بھی اتنی ہی نفرت کرتے تھے جتنی انہیں برطانوی، فرانسیسی اور امریکی کمانڈروں سے تھی لیکن جنگ سے اس نفرت، اس بے گناہی، اس مظلومیت اور اس مخصوصیت کے باوجود یہ لوگ ایتم بم کا رزق بن گئے اور پھر سانحہ ہر سنک ناگا ساگی اور ہیر و شیما کی زمین نے صحت مند پودا اگایا اور نہ ہی ان بد نصیب شہروں نے کسی مکمل بچے کو جنم دیا، اگر بے گناہ، مظلوم اور مخصوص کے وہی معنی ہیں جن میں ولڈ ٹریڈ سنسٹر کے مرحومین کو تو لا اور فن کیا جا رہا ہے تو ہمیں ویتنام کے مخصوصوں، مظلوموں اور بے گناہوں کے لئے بھی وقت نکالنا ہو گا، ان بے گناہوں، ان مظلوموں اور ان مخصوصوں کے لئے جنہیں میکنوں کی "جہن" سے باندھ کر مارا گی، جنہیں رخم لگا کر بچھوؤں، سانپوں اور بھوکے چوہوں کے پیخروں میں پھینکا گیا، جن کی کھوپڑیوں کو پیالہ بنا کر شرائیں "سرہ" کی گئیں اور جن کی زمیں کے ایک ایک پچے، ایک ایک ایش میں بم بوجے، اگائے اور کانے گئے اور جس ویتنام کو امریکی اخباروں نے زندہ انسانوں کا قبرستان لکھا، اگر بے گناہ، مظلوم اور مخصوص کے وہی معانی ہیں جن کا ولڈ ٹریڈ سنسٹر کے نام، ڈاک اور بھیری کو کفن پہنایا جا رہا ہے تو پھر ہمیں ان عراقیوں کے لئے بھی ایک آدھ سائز، ترانے اور تقریب کی آجیاں نکالنا ہو گی جن کا صدام حسین کو صدر بنا تے ایران سے جنگ لائے ہوئیت پر عملہ کرنے اور امریکی اتحادیوں کو لکارنے میں ذرا بہرہ تھے ہمیں تھا۔ جو اتنے ہی مظلوم اور اتنے ہی بے گناہ تھے ولڈ ٹریڈ سنسٹر کے مرحومین تھے لیکن اس مخصوصیت، اس مظلومیت اور اس بے گناہی کے باوجود یہ لاکھوں مرد، یہ لاکھوں عورتیں اور یہ لاکھوں بچے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے بھوں کا شکار ہو گئے اور ہو رہے ہیں۔

لیکن سمجھنے اگر یہ دنیا بھی زندہ لوگوں کا قبرستان نہیں بنی، ابھی سات براعظموں پر محیط زمین پر آنکھیں موجود ہیں اور ان آنکھوں میں آنسو آتے اور آآ کر پہنچتے ہیں، ابھی ماوں کی کوکھ بھر نہیں ہوتی، ابھی دلوں نے دھڑکنا بند نہیں کیا اور اگر ابھی انسانی ضمیر میں جیا اور ایمان باقی ہے تو پھر اس دنیا کو ان مرحوم افغانوں کے لئے بھی سائز بجانے، ترانے گانے اور تعزیتی ریزنس کرنا ہوں گے جو اتنے ہی مظلوم، اتنے ہی مخصوص اور اتنے ہی بے گناہ تھے ولڈ ٹریڈ سنسٹر کے مرحوم تھے لیکن اپنی تمام تربے گناہی، مخصوصیت اور مظلومیت کے باوجود امریکی بھوں کا شکار ہو گئے، اگر ہم یہ نہیں کرتے، اگر ہم افغانیوں، عراقیوں، ویتنامیوں اور جاپانیوں کے لئے ترانے نہیں گاتے، سائز نہیں بجاتے تو پھر ہمیں ایک اور کام کرنا ہو گا۔ ہمیں دنیا بھر کی ڈکشنریاں جمع کر کے مظلومیت، مخصوصیت اور بے گناہی کے معانی بدلنا ہوں گے۔ ہمیں یہ لکھنا ہو گا "مخصوص، بے گناہ اور مظلوم وہ ہوتا ہے جو چھلی دس پندرہ نسلوں سے امریکی ہو، گورا ہو، عیسائی ہو اور امریکی انتظامیہ اس کے اصل قاتلوں کا پتہ چلا نے میں ناکام ہو چکی ہو۔"

میمنے اور بھیڑیے کی کہانی

وہ شخص ایک صحافی تھا ان دولاں کھبیاں میں سے ایک معمولی صحافی جو اس وقت دنیا کے ایک سو اسی ممالک میں بکھرے پڑے ہیں۔ اس کی تعلیم بھی کوئی خاص نہیں تھی ایک معمولی سی یونیورسٹی کا معمولی سا گرینججویٹ ہے یہ روزگاری اور ایڈ و پیغیر صحافت کے جو ہرگز میں بھالا یا۔ اس کی معلومات، اس کی معاملہ بھی بھی قابل ذکر چیز نہیں تھی وہ ہر باریش شخص کو طالب اور ہر پراسرار شخصیت کو ملائمر سمجھتا تھا۔ اس کا آئی کیوں لیوں، اس کی حالات کو سمجھنے کی صلاحیت بھی انتہائی پست تھی، وہ اسامہ بن لادن کو طارق روڈ کے پلازوں اور فیصل کالوں کی بندگی و تاریک گلیوں میں تلاش کر رہا تھا، ہاں البتہ اگر اس میں خوبی تھی تو بس اس کا نام ڈبلیل پرال تھا اور وہ امریکی تھا اپنے احباب و اخواہ واقع پوری دنیا میں آگ لگا گی۔ وہ ایسے ہاؤں اس کا مدعاً بن گیا اور جارج ڈبلیو بش، ڈک چینی، رمز فیلڈ اور ویٹری اس کے لواحقین، وہ دنیا کے تمام اخبارات، ریڈیو، ٹیلی و ویژن اور میگزینوں کی "ہٹ نیوز" ہو گیا، اس کے اخوا کو ٹیلی و ویژن اور ریڈیو کے بلنسٹر میں جھوٹی طور پر چار سو چھتیس گھنٹے کو رنج ملی اور اس پر دنیا کی پانچ سو زبانوں میں سازھے تین ارب لفظ لکھے گئے، جب وہ مرا تو دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ نے اس کے لئے تو ہے پڑھئے۔ بش، تو فی بھیڑ اور پروین مشرف نے تغیرتی ڈیاناں جاری کئے۔ پینفا گون اور واسیٹ ہاؤس سے انتقام لینے کے اعلانات ہوئے۔ ایری فلیشیر نے شیخ عمر امریکہ کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا اور قانون کی پرانی کتابوں سے حوالے نکال کر ثابت کیا گیا۔ 1931ء میں امریکہ اور مشرکہ ہندوستان کے درمیان مجرموں کو ایک دوسرے کے حوالے کرنے کا معہدہ ٹھی پایا تھا گو پاکستان اس معہدے کے سولہ سال بعد معرض وجود میں آیا لیکن اس کے باوجود وہ اس کا پابند ہے۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا اور یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ صرف اس لئے کہ وہ امریکی تھا، اس کا رنگ سفید تھا اور اس کا نام ڈبلیل پرال تھا۔

دنیا میں ڈبلیل پرال کے علاوہ بھی ظلم ہوتا ہے۔ ڈبلیل پرال کے علاوہ بھی اس کردہ ارض پر مظلوم موجود ہیں لیکن ان کی طرف دنیا کی نگاہ اُختی ہے اور شہری دل میں غبار، دور نہ جائیے صرف افغانستان میں جھاک کر دیکھ لجھے۔ نومبر 2001ء سے پہلے افغانستان میں 14 ہزار غیر ملکی خاندان آباد تھے۔ ان میں سے

اکثریت عربوں کی تھی۔ پاکستانی اور یورپی مسلمان بھی تھے۔ یہ لوگ روی فوجوں کی واپسی کے بعد افغانستان میں آباد ہو گئے۔ ان لوگوں نے اللہ کے لئے شاندار اور آرام دہ زندگی ترک کی تھی۔ یہ لوگ سعودی عرب، قطر، دوحہ، ابوظہبی اور سوڈان کی جدید اور پُرانی سائش زندگی چھوڑ کر کابل کے غاروں میں آبے تھے۔ ان میں سے اکثر دنیا کی بہترین اور مہنگی یونیورسٹیوں کے فاضل تھے۔ دنیا کے کسی ملک میں ان کے خلاف کوئی پرچہ، کوئی کیس درج نہیں تھا مگر امریکہ کی مدد سے شاملی اتحاد آگئے آیا۔ اس نے کابل پر قبضہ کیا اور ان چودہ ہزار خاندانوں کو مختلف کمانڈروں میں باتھ دیا۔ نومبر 2001ء تک یہ خاندان افغان سرداروں کی ذاتی جیل میں ہیں۔ یہ سردار، یہ کمانڈر ٹیلی فون پر ان کا لواحقین سے رابطہ کرتے ہیں ان سے دس لاکھ روپے فی کس طلب کرتے ہیں۔ مطابق پورا ہو جائے تو یہ انہیں سرحد پار بند رعباں یا مکران پہنچا دیتے ہیں جہاں سے لوگ لانچوں کے ذریعے چوری پچھے چھپے اپنے اپنے وطن کو لوٹ جاتے ہیں۔ اگر سوداہ ہو یا لواحقین سے رابطہ نہ ہو سکے تو ان لوگوں کو بھیز بکریوں کے باڑوں میں شدید سردی اور بھوک کے جہنم کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ پاکستان کے سینکڑوں نوجوان ان سرداروں اور ان کمانڈروں کو کروڑوں روپے ادا کر کے گھر واپس لوٹے، کمانڈر بھی ان لوگوں کو تھوک کے حساب سے ایک دوسرے کے ہاتھوں فروخت کرتے رہتے ہیں۔ ابھی پچھلے ہی میئنے رشید و ستم نے ایک کروڑ روپے میں دوسو 76 غیر ملکی خرچے۔ اب وہ انہیں آگے بخی رہے۔ اسی وہیما کیسوس صدی کے انہیں روشن اور مہذب دنوں میں افغانستان میں انسانوں کی منڈیاں لگ کر رہی ہیں۔ انسانوں کے گدوں میں رسیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ہیں۔ انسان تول کرناپ کر بیچ جا رہے ہیں لیکن اس قلم، اس زیادتی کی آواز بی بی ای اور سی این این کے حاس ماگیک و فونز تک پہنچ رہی ہے اور نہ ہی اسے واہیٹ ہاؤس کے کان سن رہے ہیں۔ ان چودہ ہزار خاندانوں میں سینکڑوں ہزاروں ڈینیل پرل ہیں لیکن رمز فیلڈ، اریٰ فلیشیر اور جارج بیش انہیں ڈینیل پرل تعلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کیونکہ یہ لوگ امریکی نہیں ہیں۔ یہ لوگ اپنے والدین کی جائز اولاد ہیں اور پیدائش کے فوراً بعد ان کے کانوں میں اذان دی گئی تھی۔

آپ اونگ افغانستان کے اندر جھانک کر دیکھ لیں، وادی پنجشیر میں کیا ہو رہا ہے، هزار شریف، قندھار اور کابل کے غاروں میں انسانوں پر کیا بیت رہی ہے، بچوں، خواتین اور نوجوانوں پر کیا کیا ظلم، کیا کیا ستم ہو رہے ہیں۔ یہ لوگ انسانی اعضا کی دکانیں بن چکے ہیں۔ ان کے جسموں سے گردے نکال نکال کر بیچ جا رہے ہیں لیکن دنیا میں ان کی چیخ سننے والا کوئی نہیں، کوئی شخص نہیں جو ان کی آواز عالمی فورمز تک پہنچا سکے۔ ان کی چینیں اقوام متحدہ کے بھروس کانوں، او آئی سی کے ضمیر سے خالی بدن تک پہنچا سکے۔ دنیا ڈینیل پرل کی بیوی کے لئے ترپ رہی ہے۔ اس کے آنے والے بچے کے لئے نوہ کنال ہے لیکن ان بچوں کے لئے اس کے پاس وقت ہے اور نہ ہی فرصت جو افغانستان میں پیدا ہوئے۔ جو افغانستان میں پیدا ہو رہے ہیں اور جنہیں جانوروں کی طرح خودیداً اور بیچا جا رہا ہے۔ دنیا ڈینیل پرل کی لاش تلاش کر رہی ہے۔ اس کے قاتمتوں کے خلاف فیملوں کے لئے

عادتیں سجا رہی ہے لیکن ان مظلوموں کے لئے کوئی عدالت بن رہی ہے اور نہ ہی ان کے قاتل تلاش کے جاری ہے یہ اور دنیا ذمہ دار کی زندگی پر فلمیں بنائی ہے۔ ذمہ دار کی بیوی کے انترو یو دکھاری ہے لیکن ان مظلوم بچوں اور ان بے کس عورتوں کی فلمیں بن رہی ہیں اور شہی انترو یو دکھائے جا رہے ہیں لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے بش اور رمز فیلڈ کی اس دنیا میں ہم سوال کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ ممکنے اور بھیڑیے کی کہانی میں تو ہر بار ظلم اور نظام کا فیصلہ بھیڑیے نے کرنا ہوتا ہے۔ ہم ممکنے تو نشیب میں کھڑے ہو کر بلندی پر پہنچنے والے بھیڑیوں کا پانی گدلا کرتے ہیں یا پھر ہمارے آباؤ اجداد میں سے کسی نے پانچ سال سو سال پہلے بھیڑیے کو کافی دی ہوتی ہے جس کی سزا ہمیں بھگتنا پڑتی ہے۔

وقت کے اس ریلے، وللہ آرڑ کی اس دنیا میں جس میں اب ظلم وہ ہے جسے امریکہ قلم کہتا ہے اور مظلوم وہ ہے وائیٹ ہاؤس مظلومیت کی سند دیتا ہے۔ ہم سوال کرنے والے ممکنے کون ہوتے ہیں لہذا آئیے اچھے سیمنوں کی طرح سرجھکائیں اور دوسروں کے مقدار میں لکھی سزا میں کاٹ کر چپ چاپ مر جائیں۔



معصوم انسان

اس کا نام محمد عمر تھا، عمر تھا، ابو بکر تھا یا اسم مجھے یاد نہیں وہ دو سال کا تھا، تین سال کا تھا یا چار سال کا توی یہ کل، اگر اندر میں دہشت گرد مجھے یہ بھی یاد نہیں لیکن مجھے اس کی شکل، اس کے سینے سے ابلتا خون اور اس کے باپ کے منہ سے نکلی چینیں اچھی طرح یاد ہیں۔ یہ چینیں، یہ خون اور یہ شکل میں نے ایک امریکی میگزین میں دیکھی تھی، وہ چھوٹا صوری ہے تھیں۔ ایک تصویر میں یہ "دہشت گرد" اپنے باپ کی انگلی پکڑ کر فٹ پاتھ پر چل رہا تھا، دوسرا تصویر میں چند اسرائیلی فوجی خود کا رہتھیاروں سے سڑک پر گولیاں بر سار ہے تھے۔ تیری تصویر میں یہ نخدا دہشت گرد باپ کا ہاتھ پکڑ کر پناہ گاہ کی تلاش میں بھاگ رہا تھا، چوتھی تصویر میں یہ دونوں دونوں دو تین فٹ اونٹی دیوار کی اوٹ میں چھپے تھے، پانچویں تصویر میں ایک گولی آئی نکھے دہشت گرد کے سینے میں پیوست ہوئی، سینے سے خون املک کر باپ کے منہ، ہاتھ اور دیوار پر کرا اور پھٹی تصویر میں باپ چھوٹا جیج گراپنے مروہ پچ کی غصہ چینجھوڑ رہا تھا۔ لیکن "دہشت گرد" کے بدن سے زندگی رخصت ہو چکی تھی، یہ میری زندگی کی واحد تصویر ہے جس سے مجھے چینوں کی آواز اٹھتی اور انٹھ انٹھ کر کانوں میں گرتی محسوس ہوئی۔ یہ تصویریں، یہ منظر مقبولہ بیت المقدس کی ایک شاہراہ کا تھا اور اسے رنگارنگ کپشوں کے ساتھ سارے مغربی میدیا نے پیش کیا۔ مجھے یاد ہے یہ تصویریں دیکھ کر میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔ "یہ پچہ کون ہے؟" مجھے میری ذات نے جواب دیا تھا۔ "تم دہشت گرد، ظالم اور گناہگار۔"

بات تصویروں کی چال پڑی ہے تو ایک تصویر اور بھی ہے جو مہینوں سے میرے دماغ میں آتش دان کی لگزوں کی طرح سلسلتی چلتی اور بجتی ہے یہ چھ ماہ کے ایک دہشت گرد فلسطینی پچ کا جنازہ ہے۔ اس تصویر کے ایک کونے میں اسی پچ کا ایک پوز چسپاں ہے اف خدایا پچ کی کمریہ اتنا بڑا سوراخ ہے جس سے آر پار دیکھا جا سکتا ہے، تفصیل پڑھی تو پتہ چلا اسرائیلی فوجیوں نے اس پچ پر اتنی گولیاں بر سائیں کہ تاف سے لے کر گردن تک اس کی ہر چیز دھواں بن گئی۔ اس تصویر نے بھی مجھے سے پوچھا تھا "میں کون ہوں" میں نے جواب دیا تھا "تم دہشت گرد ہو، ظالم اور گناہگار ہو۔"

یہ وہ تصویریں ہیں، ان جیسی اور بھی سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں تصویریں ہیں جن کے ایک ایک نقطے، ایک ایک لکیر میں ظلم کی لاکھوں کروڑوں کہانیاں جیسی ہیں لیکن ان لکیروں، ان لفظوں اور ان تصویروں پر

عالیٰ خمیر نے جہاں لی اور نہ ہی انسانیت کی نیند ٹوٹی۔ یہ نیند ٹوٹ بھی کیسے سکتی تھی، یہ جہاں آبھی کیسے سکتی تھی کہ ان تصویریوں کے تمام متفق مسلمان تھے اور قاتل اسرائیلی، امریکی اور یورپی! اور لفظوں، معنوں اور مظہروں کی نئی لعنت کے مطابق انسان صرف وہ ہے جس کا رنگ سفید ہے، جس کی ماں کلب میں ناچتی ہے، باپ شراب پی کر فٹ پا تھے پر گر پڑتا ہے۔ جس کا نبض ماں سے شروع ہو کر ماں پر دم توڑ دیتا ہے، جو مرد سے مرد اور عورت سے عورت کی شادی پر ایمان رکھتا ہے، جو جو اکھیتا اور ناجائز پچ پیدا کرتا ہے، جو امریکی ہے، جو اسرائیلی ہے، جو برطانوی، آسٹریلوی اور فرانسیسی ہے اور ان فرانسیسیوں، آسٹریلویوں، برطانویوں، اسرائیلیوں اور امریکیوں کا ناخن بھی ٹوٹ جائے تو یہ مظلوم ہیں اور باقی دنیا بھروسے ماری جائے۔ تو پوں کے گلوں کا شکار ہو جائے، گولیوں سے چھلنی ہو جائے، کیمیکل اور بائیوجنکل ہتھیاروں کا نشانہ بن جائے وہ ظالم ہے، گناہگار ہے، دہشت گرد ہے۔

جناب چارچ بیش کو آج بیت المقدس شہر، حیثے اور شمالی غزہ کی یہودی بستی کے 28 آنجمنانی یہودی تو محصور دکھائی دے رہے ہیں لیکن انہیں قلعہ جنگی کی وہ بارہ تیرہ سو نعشیں نظر نہیں آ رہی ہیں جو ایک ہفتہ پہلے تک سانس لیتے اور خواب دیکھتے انسان تھے لیکن انہیں شمالی اتحاد کے درندوں نے باندھ کر شہید کر دیا، لوگوں کو زندہ جلایا گیا، انہیں سر میں مار کر قتل کیا گیا اور انہیں یہی کاپڑ سے بم مار مار کر مارا گیا افغانستان میں اتنی نعشیں گریں، اتنا خون بیا کہ ریڈ کراس کے الہکار ایک بیٹھنے سے نعشیں ہٹا رہے ہیں، خون دھو بے ہیں لیکن خون صاف ہوتا ہے اور نہ ہی نعشیں ختم ہوتی ہیں۔ بیش اور نوئی بلیز کو وہ ہزاروں افغان دکھائی نہیں دے رہے جنہیں دو میئے میں تین ہزار حملوں میں خاک اور خون میں تہلا دیا گیا، جنہیں زندہ رہنے، آزاد رہنے اور اپنی مرضی سے سانس لینے کی سزا دی گئی، کیا یہ سارے لوگ گناہگار تھے، ظالم اور دہشت گرد تھے، اگر نہیں تھے تو پھر انہیں کس جرم، کس گناہ کی سزا دی گئی۔ یہ لوگ صرف اس لئے مار دیئے گئے کہ یہ لوگ سنترل ایشیاء کے تیل کے قریب پیدا ہو گئے تھے۔ انہیں امریکی عورتوں کی بجائے مسلمان ماوں نے جنم دیا تھا، انہیں پیتسادینے کی بجائے ان کے کان میں اذان دے دی گئی تھی اور یہ اللہ کے بنائے ایک مرد اور ایک عورت کی چائز اولاد تھے، آج بیش اسرائیلی طیاروں، یہودی روپوں اور جیوبیں کو ہر فلسطینی گھر گرا دینے اور ہر کلد گو فلسطینی مسلمان کو قتل کرنے کی اجازت دے رہا ہے کیوں؟ کیونکہ اس کی دشمنی کے مطابق انسان صرف گوری چہری والی مخلوق ہے۔ زندہ رہنے آزاد رہنے کا حق صرف گورے کو حاصل ہے۔ رہی باقی دنیا تو دنیا کے سارے لوگ چارپائے بن جائیں یا پھر گلے میں پسند ڈال کر گام امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے حوالے کر دیں۔ واہ بھی واہ، زندہ باد آپ کی مخصوصیت اور آپ کے محصور انسان!

(نوت: یہ کالم صدر بیش کے اس بیان سے متاثر ہو کر لکھا گیا جس میں انہیوں نے کہا "میں بیت المقدس میں مرنے والے محصور انسانوں (یہودیوں) کے قتل کی شدید نعمت کرتا ہوں۔")

قیامت

کائنات کی وسعتوں سے ایک سیارچہ لگا، خلائیں لبرا یا اور سیدھا زمین کی طرف دوڑ پڑا، زمین کے قریب پہنچ کر خٹکا، رکا، سینڈ کے ہزاروں میں سے میں کچھ سوچا۔ اپنے زاویے میں ”پوائنٹ“ کا لاکھواں حصہ تبدیلی کی، شاہ شاہ کرتا ہوا زمین کے قریب سے گزرا اور کائنات کے کسی اندر ہے غار میں گم ہو گیا۔

یہ جون 2003ء کے دوسرا عشرے کی بات ہے۔ 16 جون کو جب سیارچے کو گزرے تو ان دونوں چکے تھے ناسا کے حاس آلات نے پہلی بار اس قیامت کی نشاندہی کی، خلائی تحقیق کے ماہرین کی ہاتھیں برف ہو گئیں، ہونا بھی چاہیے تھیں کیونکہ یہ دنیا کی تاریخ میں زمین کے اتنے قریب آنے والا پہلا سیارچہ تھا۔ یہ زمین سے ایک لاکھ 30 ہزار کلو میٹر کے فاصلے سے گزرا، خلائیں اس فاصلے کو بال بر ابر دوری سمجھا جاتا ہے، سیارچے کی الیالی ایک سو تیس کلو میٹر تھی جبکہ اس کی رفتار 23 ہزار کلو میٹر فی محدود تھی۔ اُری یہ سیارچہ اپنے روت سے ایک سینٹی میٹر کا لاکھوں حصہ دایس یا بائیس ہو جاتا تو یہ سیدھا زمین سے آنکھ راتا جس کے نتیجے میں ہیر و شیما پر گرانے گئے بم سے ہزار گناہ بڑا دھماکہ ہوتا۔ مشرق سے مغرب تک، اور شمال سے لے کر جنوب تک آگ لگ جاتی اور گھاس کی جڑوں سے چیز کی بلند ٹہنیوں تک ہر چیز خاکستر ہو جاتی۔ سارے سمندروں کا پانی بخاپ بن جاتا۔ زمین کا درجہ حرارت وہاں پہنچ جاتا جہاں پھر موم ہو جاتے ہیں۔ زمین کے اندر چھپے لاوے باہر نکلتے اور نیو یارک کے مجسم آزادی سے ہمالیہ کی آخری چوٹی کی ہر چیز، ہر زندہ، ہر زندہ اور مردہ ہے سیال مادہ بن جاتی، یہ سیال مادہ آگے بڑھتا اور روں کے دس ہزار دو سو چالیس، امریکہ کے آٹھ ہزار چار سو میل، فرانس کے چار سو پچاس، چین کے چار سو، برطانیہ کے دو سو سانچھ، اسراeel کے ایک سو سانچھ، بھارت کے پوہتر اور پاکستان کے پچیس ایکٹم بم پھٹ جاتے، زمین کا درجہ حرارت دس ہزار سینٹی گریڈ سے ایک کروڑ چالیس لاکھ سینٹی گریڈ تک چلا جاتا اور زمین سورج بن جاتی۔

یہ تباہی اور اس کے اثرات چار لاکھ سال تک قائم رہتے۔ ساڑھے چار لاکھ سال بعد زمین پر آسیجن پیدا ہوتی۔ جلی سری بلندیوں کے نیشیں میں پانی ہورے لیتا، زمین کی تہوں سے کوئی ایک آدھ بیج نکلتا، بیج سے ایک آدھ کوپل پھوٹتی اور پھر اس کوپل سے زندگی کا نیا سفر شروع ہوتا۔ یہ سفر زمین پر پہلے انسان کی صورت میں پڑا ڈالتا۔ وہ تنگ دھڑک انسان زندہ جانوروں کا خون پینا، کپا گوشت کھاتا، اپنی بقا کے

لئے پہاڑوں، وادیوں، صحراؤں اور غاروں میں بھاگتا پھرتا، اسے خوکریں لگتیں، وہ گرتا اور لوہے کے چند راؤ، چند بھدی سی "پڑیاں" کچھ کیل اور کچھ قبضے اس کے ہاتھ آلتے، وہ انہیں اٹھا کر حیرت سے دیکھتا، گمان کرتا لیکن اس کا گمان تھک کے بے بس ہو جاتا کیونکہ چار لاکھ 52 ہزار تن سو 12 سال بعد کا انسان یہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا یہ چند راؤ جنہیں وہ حیرت سے دیکھ رہا ہے، کبھی امریکہ کے مجسم آزادی کے ہاتھ میں پکڑی مشعل تھی، یہ "پڑیاں" کیپ کینورل کے خلائی شیش پر کھڑی چاند گاڑیاں تھیں۔ یہ کیل، یہ قبضے و اسیٹ ہاؤس، پینٹا گان، 10-ڈاؤنگ سٹریٹ، فرچ پریزینٹی، جرسن چالسٹری اور اشٹر پتی بخون کے دروازے ہیں۔ وہ حیرت سے زمین پر پڑی ہڈیاں دیکھتا، کھوپڑیاں اٹھا کر سوچتا اور پریشان ہو کر انہیں زمین پر دے مارتا اور بھاگ کھڑا ہوتا کیونکہ وہ صدر بیش اور اسامد بن لادن کی کھوپڑی میں تفریق نہ کر پاتا، تفریق تو خیر رہی دور اسے تو یہ تک معلوم نہ ہوتا۔ بن لادن کون تھا اور بیش اس سے کیوں ناراض تھا۔ اسے غار کھودتے ہوئے ایک گلی چیز ملتی، وہ دو تین نسلوں تک اس تو گلی چیز سے کمر پر خارش کرتا رہتا یا کان صاف کرتا رہتا، اسے یہ معلوم نہ ہوتا یہ بیش کا وہ تاریخی قلم تھا جس سے اس نے "دہشت گروں" کو مارنے کا حکم دیا تھا۔ اسے دو کھوپڑیاں قریب قریب پڑی ملتیں، وہ انہیں دیر تک حیرت سے دیکھتا رہتا اور سوچتا رہتا "یہ کون تھے" لیکن دنیا میں اسے شیرون اور یاسر عرفات کے بارے میں بتانے والا کوئی نہ ہوتا، اسے لوہے کا گھنٹہ ملتا، وہ اسے لئے پھرتا رہتا اسے کوئی واچاپی کے بارے میں نہ بتا پاتا۔

وہ کھوپڑیاں، یہ گھنٹے اور یہ ہڈیاں لے کر گھومتا رہتا۔ ایک کے بعد دوسرا نسل، دوسرا کے بعد تیسرا اور تیسرا کے بعد ہزاروں، دو ہزاروں، تین ہزاروں نسل آتی۔ انسان غاروں سے میدانوں اور میدانوں سے بستیوں میں آتے۔ بستیاں شہر بنتیں، شہر بنیوارک، واشنگٹن، شکا گو، لندن، پیرس، فرینکفورت، نوکیو، یونیک اور ماسکو بنتے۔ بڑی بڑی لیبارٹریاں، تجربے گاہیں، لا برمیریاں اور تحقیقاتی سنتر بنتے اور سفید کوٹ پہن کر آئیں سائن ٹائم کے لوگ ان کھوپڑیوں، ان قبضوں، کیلوں، چڑیوں اور راؤوں کا مطالعہ کرتے۔ مٹی میں گندھی دھاتوں، انسانی جلد، پچھلے لوہے اور تابکار مادوں کے مغلوبوں کا تجزیہ کرتے تو انہیں معلوم ہوتا زمین پر کبھی ایک بیش بھی ہوا کرتا تھا، اس بیش کے ملک کا دفاعی بجٹ 3 سو 83 میں ڈال رہا تھا۔ اس نے اور اس کے خواڑیوں نے مہلک ترین ہتھیاروں کا ابزار لگا رکھا تھا۔ ان لوگوں کی سیاست صرف 20 کروڑ لوگوں کی بنا اور پانچ ارب 80 کروڑ شودروں کی فنا کے گرد گھومتی تھی۔ اس بیش نے اپنے گھر کے نیچے اسٹی پناہ گاہ بنارکھی تھی۔ وہ خطرے کے وقت اس پناہ گاہ میں جا چھپتا تھا۔ اس کے پاس انتہائی تیز طیارے 50 ہزار گلو میٹر تک مار کرنے والے میزائل اور زمین کے دوسرے کنارے کی اطلاع لانے والے سیارے تھے۔ وہ اور اس کے آلات وزیرستان کے پانچ لاکھ لوگوں میں سے القاعدہ کے سول "دہشت گرد" ملاش کر لیتے تھے۔ وہ خون کا ایک قطرہ دیکھ کر بتا دیتا تھا اس شخص کی دسویں نسل کا چوتھا بچہ دہشت گرد ہو گا۔ زمین، سمندر، ہوا، نہاہر جگہ اس

کی حکمرانی تھی اور وہ زندگی کو موت اور موت کو زندگی میں بد لئے کا دعویٰ کرتا تھا۔

وہ آئین سائنس 14 لاکھ 56 ہزار 4 سال بعد کے آئین سائنس چند صاف ستری، نیس کھوپڑیاں میز پر سجا کر ایک دوسرے سے پوچھتے "پھر یہ لوگ مر کیوں گئے" وہ سوچتے "جب زمین پر موت اتری تو پانچ ارب 80 کروڑ شودروں کے ساتھ وہ 20 کروڑ لوگ بھی کیوں مارے گئے جن کے پاس اپنی بقا کے لئے ہزاروں سامنے ہتھیار موجود تھے، ہو سکتا ہے اس وقت کے آئین سائنسوں کی رجحت کا کوئی منہ پھٹ آئین سائنس ہاتھ اٹھائے، سکرائے، سب کو اپنی جانب متوجہ کرے اور کندھے اچکا کر کے "حاضرین وہ لوگ دہشت گردوں کا اندازہ تو لگا سکتے تھے لیکن زمین کی طرف بڑھتے سیار پوں کا تجھیش نہیں کر سکتے تھے، وہ فضا کی نیکناالوجی کو بقا کا ہتھیار بھجتے تھے، وہ خود کو بہت ذہین، بہت شاطر خیال کرتے تھے۔ ان کا کہتا تھا وہ موت سے بھاگ جائیں گے، ہو سکتا ہے وہ بھاگ بھی جاتے لیکن قیامت موت سے کروڑوں گناہ بھاری، کروڑوں گناہ تیز اور کروڑوں گناہ شاطر ہوتی ہے۔ وہ جب آتی ہے تو ناسا کے آلات جواب دے جاتے ہیں، بُش ہو یا اسامد سب فنا ہو جاتے ہیں۔"

واہیٹ ہاؤس 410 کلومیٹر

وہ یکم اپریل 1815ء کو برلن میں پیدا ہوا، جاگیردار گھرانے سے تعلق تھا۔ جسم مضبوط اور ذہن قوانینا تھا۔ تعلیم مکمل ہوئی تو سول سو سال جوان کر لیں گے ایک جلد ہی عدالتی نظام کی خرابیوں نے مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔ سیاست میں آیا، 1845ء میں صوبائی اسٹبلی کا رکن بنا۔ وہاں سے پرشیا کی پارلیمنٹ میں پہنچا، بادشاہ کا قرب حاصل ہوا، پرشیا کا نمائندہ بن کر فریکفرٹ گیا، وہاں سے فرانس میں سفر ہنا اور پھر بادشاہ نے بھرپور سے بلا کر پرشیا کا چانسلر ہنا دیا۔ اس کا نام بسمارک تھا۔

بسمارک ایک باکمال شخص تھا، وہ 1862ء سے 1871ء تک پرشیا چانسلر رہا۔ ان آنٹھ برسوں میں اس نے دنیا کو حکومت کاری کے 92 نئے دے دیے۔ اس نے اپنی ذہانت، قابلیت اور انتظامی صلاحتوں سے دنیا کا نقشہ بدل دیا۔ وہ یورپ کا پہلا شخص تھا جس نے باقاعدہ فوجی اصلاحات کیں۔ جس کا کہنا تھا ایک مضبوط وزارت خارجہ کے بغیر کوئی ملک دشمن پر فتح حاصل نہیں کر سکتا۔ جس نے دشمن کو بے یار و مددگار بنانے کی پائیں دی۔ جس کا فلسفہ تھا دشمن پر حملے سے پہلے اس کے دوستوں کو اس سے برگشتہ کر دو، تم کامیاب ہو جاؤ گے۔ بسمارک نے آنٹھ برسوں میں زار روں کو دوست بنایا۔ ڈنمک سے جنگ لڑی، آسٹریا کو شکست دی اور فرانس پر قبضہ کیا۔ بسمارک کی ان عکری اور سفارتی کوششوں سے 26 جون ریاستیں متحد ہوئیں اور دنیا کے نقشے پر جرمنی کے نام سے ایک خوبی ریاست وجود میں آئی۔ 16 اپریل 1871ء کو نیا دستور نافذ ہوا اور بسمارک جرمنی کا پہلا چانسلر منتخب ہوا۔ وہ 20 مارچ 1890ء تک قریباً 20 برس جرمنی کا چانسلر رہا۔ ان 20 برسوں میں بسمارک نے کمال کر دیا۔ اس نے جرمن امپریل فوج کی بنیاد رکھی، ریلوے لائنسیں بچائیں، ڈاک اور تار کے محکمے بنائے۔ بنکاری کا نظام وضع کیا، کمپنیوں کے چیਜ سے تعلقات بہتر بنائے۔ جرمنی سے سو شلسوں کو ازا دیا۔ اتوار کی چھٹی کو لازم بنایا، مزدوروں کے اوقات کار میل کے اور بیس پالیسی کو ضروری قرار دیا۔ وہ واقعی صاحب کمال تھا، قیصر ولیم اول نے اس کے بارے میں کیا خوب کہا تھا "بسمارک واحد شخص ہے جو مداریوں کی طرح بیک وقت پانچ گیندوں سے بھیل سکتا ہے اور ان میں سے کم از م دو ہوں گے ہوتی ہیں۔" یہ بسمارک جرمنی کو تیزی سے برطانیہ جتنی مضبوط اور فعال ریاست بناتا چلا جا رہا تھا لیکن 19 مارچ 1888ء کو بادشاہ قیصر ولیم اول کا انتقال ہو گیا۔ اس کی جگہ اس کا امر رسیدہ چنان فریڈرک بادشاہ بننا لیکن تین ماہ بعد وہ بھی فوت ہو

گیا۔ فریڈرک کے بعد 28 سالہ ولیم دوم کی باری آئی۔ ولیم دوم ایک ملکوں مزاج، جلد بازنوجوان تھا اسے دنیا فتح کرنے کا جنون تھا۔ وہ کہتا تھا جس طاقت کو استعمال نہ کیا جائے وہ طاقت نہیں ہوتی۔ بسمارک کو پادشاہ کے خیالات سے اختلاف تھا، اس کا خیال تھا، طاقت نمائش کے لئے ہوتی ہے استعمال کے لئے نہیں۔ یہ اختلاف آہستہ آہستہ انتظامی جنگ کی شکل اختیار کر گیا۔ جنگ میں شدت آئی تو بسمارک نے 20 مارچ 1890ء کو استعفی دے دیا۔ وہ اپنی جا گیر پر چلا گیا جہاں وہ 30 جولائی 1898ء کو 83 سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔

بسمارک کی اس کہانی میں کوئی دلچسپ بات نہیں۔ یہ دنیا کے دو تین ہزار ہڑتے لوگوں کی کہانیوں میں سے ایک کہانی ہے۔ میں بھی اسے پڑھ کر بھول جاتا لیکن جب بسمارک کی داستان پڑھی تو اس کے ایک فقرے پر محک کر رک گیا۔ اس نے ولیم دوم کے بارے میں لکھا تھا ”یہ تو جوان پوری دنیا کو جباہ کر دے گا کیونکہ اس کے پاس طاقت ہے لیکن ظرف نہیں۔“ بسمارک نے یہ فقرہ کہیں 1891ء یا 1894ء یا 1898ء میں لکھا تھا، اس کا انتقال ہو گیا۔ بسمارک کے انتقال سے تھیک 16 برس بعد یعنی 1914ء میں ولیم دوم نے دنیا کو پہلی جنگ عظیم میں دھکیل دیا۔ وہ سکندر اعظم کی طرح دنیا فتح کرنے لکھا لیکن جنگ ختم ہوئی تو وہ جان بچانے کے لئے اپنے ہی ملک سے فرار ہو گیا۔ ولیم دوم کی آخری زندگی ہالینڈ میں کسپرسی میں گزری۔ جرمی اتحادیوں کے قدموں میں گیا۔ سلطنت عثمانیہ بار اپارا ہو گئی اور دو تین کروڑ لوگ ہلاک ہو گئے۔ جنگ کے خاتمے پر جب دنیا کے اس تباہی کا تجربہ کیا تو ولیم دوم کے بارے میں بسمارک کے فقرے نے بڑی شہرت پائی۔ دنیا کے تمام ہڑتے دانشوروں اور تجربی نگاروں کی متفق رائے تھی ”طاقت کم ظرف کے پاس ہو تو اس سے خوفناک اور خطرناک کوئی چیز نہیں ہوتی۔“ بسمارک کو گزرے ایک سو پانچ سال ہو چکے ہیں۔ ولیم دوم کو بھی مرے ہوئے اسی پچاہی سال گزر پچے ہیں لیکن جہاں تک طاقت کے فلسفے کا تعلق ہے وہ آج بھی اسی طرح زندہ ہے، وہ آج بھی اسی طرح موجود ہے بس ولیم دوم کی جگہ جارج بیش نے لے لی اور جرمی کی جگہ امریکہ آگیا۔ دنیا بھی وہی ہے، طاقت بھی وہی ہے اور طاقت کے اطمینان کا جنون بھی وہی۔ اگر کوئی تبدیلی آئی تو اس کا نام اسٹم بم اور میزائل ہے۔ ولیم کے عہد میں 20 ہزار اسٹم بم اور 2 لاکھ میزائل نہیں تھے ورنہ آج دنیا چند بدیودار جو ہڑتوں، تھوڑے سے غاروں اور چند سن کلی، مسلی، جلی ہڑتوں کا نام ہوتا۔ اور جب سورخ حقیقیں کے لئے نکلتے تو انہیں ایک سنگ میل ملتا جس پر لکھا ہوتا ”واہیت ہاؤس 410 کلومیٹر“ وہ وہاں پہنچتے تو وہاں بھی کالی جلی مشی اور تاحد نظر گہرے گڑتوں کے سوا کچھ نہ ہوتا کہ طاقت ولیم کے پاس ہو یا بیش کے ہاتھ میں اس کا نجام خود کشی ہوتا ہے۔ بسمارک ہی نے کہا تھا آگ سے کھیلتے والے لوگ جل کر مرا کرتے ہیں اور پانی سے لڑنے والے ڈوب کر۔

صاحب ابیش کی شکل میں دوسرا ولیم پیدا ہو چکا ہے، اللہ اس دنیا پر رحم فرمائے۔



بال-بال

یہ 2 جنوری 1993ء کی سر صبح تھی۔ 7 نج کر 7 منٹ پر درجنیا میں مکین کی 123 نمبر بزرگ کے گھنل پر ایک گاڑی رکی۔ اس میں درمیانے قد کا ایک خوبصورت نوجوان نکلا۔ اس کے ہاتھ میں چینی ساخت کی اے کے 47 کلاشکوف تھی۔ نوجوان نے اترتے ہی فائر کھولیا۔ اس کا ہدف ہی آئی اے کے پانچ الکار تھے۔ تین الکار نج گئے لیکن 66 سالہ ڈاکٹر لاسگ پیٹ اور انجینئر فریک ڈارلنگ مارے گئے۔ نوجوان فائرنگ کے بعد اطمینان سے فرار ہو گیا۔

یہ نوجوان ایسل کا سی تھا۔ ایسل 3 مارچ 1990ء کو امریکہ گیا۔ سیاسی پناہی، ہی آئی اے کے ایک اعلیٰ آفسر کے بیٹے کمری مارنی کی کو دیج کپٹن "یکسل" میں ملازم ہوا۔ پہنچنی ہی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر میں حاس و متاویز پہنچا تھی۔ ایسل یہ پیکٹ لے کر اکٹھی آئی اے جاتا تھا۔ اسی آمد و رفت کے دوران اس نے ہی آئی اے پر حملہ کا منصوبہ بنایا۔ وہ بنیادی طور پر ہی آئی اے کے ایک موجودہ اور ایک سابق ڈائریکٹر کو شکار بنانا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا، ان دونوں نے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ مگر خوش قسمتی سے وہ دونوں نج گئے اور لاسگ پیٹ اور فریک ڈارلنگ مارے گئے۔ ایسل اگلے روز پر آئی اے کی فلاٹ سے پاکستان آ گیا۔ امریکی پولیس نے اس کے فلیٹ پر چھاپا مارا اور اس کے دوست زاہد میر سے کلاشکوف برآمد کر لی۔ کلاشکوف پر ایسل کا سی کے شکر پرنس موجود تھے۔ ایسل مجرم ثابت ہو گیا۔ امریکہ ایسل کو تلاش کرنے لگا، کوئی میں اس کے گھر کی گرانی شروع ہو گئی۔ اس کے خاندان کے ٹیلی فون شیپ ہونے لگے۔ اس کے دوست احباب کا پہنچا کیا جانے لگا۔ اس کی تصویریں پوری دنیا میں چھپوادی گئیں۔ اطلاع دینے والوں کو بھاری انعام کا اعلان کر دیا گیا۔ امریکی جاسوس انتہائی جدید آلات کے ساتھ پاکستان آ گئے۔ ایسل کی تلاش کے لئے سیلیٹ کی مددی جانے لگی یوں ایسل آگے آگے چل پڑا اور امریکی ایجنسیاں اس کے پیچھے پیچھے، اسے پکڑنے کے لئے امریکہ نے پاکستان میں 13 آپریشن کئے۔ اس کے گھر پر چھاپ مارا گیا۔ اس نے تواب آف ہبکنی کے پاس پناہی تو آصف علی زرداری اور نصیر اللہ باہر کے ذمہ بیٹھ پر دباو ڈالا گیا۔ چن اور بسی میں امریکی کمائندوز نے دھاوا بولا۔ افغان بارڈر پر ایک سردار کے ڈیرے کو گھیرے میں لے لیا گیا مگر وہ قابو

نہ آیا لیکن 15 جنوری 1997ء کو جب وہ ذیرہ غازی خان کے شالیمار ہوٹل کے کمرہ نمبر 312 میں سیف اللہ کے نام سے خبر اہوا تھا تو صحیح چار بجے پاکستانی کمائڈوز کی مدد سے امریکہ نے اسے گرفتار کر لیا۔ کاسی کے مجرم کو 35 لاکھ ڈالر دے دیئے گئے۔ یوں کاسی ورجنیا پہنچ گیا، جہاں فہرست کی عدالت میں اس کے خلاف مقدمہ چلا۔ اسے مزاۓ موت نادی گئی 14 نومبر 2002ء کو امریکی وقت کے مطابق رات تو بجے ایسل کو زہریلا انجکشن لگا دیا گیا، ایسل کاسی اپنے خالق حقیقی سے جاتا۔

یہ ہے ایسل کاسی کی کہانی۔ اس کہانی سے تم چیزیں سامنے آتی ہیں۔ اول امریکہ نے اپنے دو شہریوں کی موت کا بدل لینے کے لئے زمین آسمان ایک کر دیا۔ کروڑوں روپے لگائے، مسلسل ساڑھے چار سال تک کاسی کا ویچھا کیا۔ اپنا سارا سفارتی، عسکری اور معاشری دباؤ استعمال کیا اور آخر میں قانونی اور غیر قانونی طریقے سے ایسل کو اٹھا کر امریکہ لے گیا۔ دوم امریکہ کی نظر میں جمیعت آزاد ملک پاکستان کی کوئی اہمیت، کوئی جمیعت نہیں اور پاکستان کے حکمران قانون اور آئین سے بالاتر ہیں۔ جب امریکہ کو ایسل کی شالیمار ہوٹل میں موجودگی کی اطلاع ملی تو میڈیمین البرائیت نے نواز شریف کوفون کیا۔ نواز شریف ترکی کے دورے پر تھے۔ نواز شریف نے پاکستان میں چودھری نثار احمد کو امریکی کمائڈوز سے تعاون کا حکم دیا۔ حکم کی تقلیل ہوئی اور ایسل کو قانونی تقاضے پورے کے بغیر امریکہ کے حوالے کر دیا گیا اور سوم عالم اسلام ایک شدید ہے جسی اور بے شرمی کا شکار ہے۔ امریکہ نے مسلمانوں کو ان کی اوقات دھانے کے لئے ایسل کا ہی کوئین رمضان میں سزاۓ موت دی۔ اس وقت دنیا میں 161 اسلامی ممالک ہیں۔ امریکہ کے اندر 80 لاکھ مسلمان ہیں۔ امریکہ میں مسلمانوں کی 426 رجسٹریٹیوں، 165 مرکز اور 1843 اسلامی ادارے ہیں لیکن کسی اسلامی ادارے نے امریکہ کے اندر احتجاج کیا اور نہ ہی کسی مسلم ملک نے امریکہ کے باہر، اس کے بر عکس امریکہ کی 42 تنظیموں نے کاسی کی سزاۓ موت رکونے کے لئے اپنیں بھی کیس اور احتجاج بھی۔ ان میں ایمنسٹی انترنشنل، دی نیشن ڈاٹ کام، روحمند مرکز برائے تعلیم و امن اور قومی اتحاد جیسے ادارے بھی شامل ہیں۔ 14 نومبر کو جب ایسل کو موت کا انجکشن لگایا جا رہا تھا تو اس وقت بھی 185 امریکی شہری جمل کے باہر احتجاج کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے ہاتھوں میں موم بھیاں اور پھول اخخار کئے تھے جبکہ ان کے مقابلے میں پاکستان سیت 161 اسلامی ممالک میں کسی کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ وہ امریکہ سے کم از کم رمضان کے مقدس مہینے میں یہ سزا موخر کرنے کی درخواست ہی کر دے۔ یہ "سعادت" بھی امریکہ کی تین عیسائی تنظیموں ہی کو حاصل ہوئی۔

یہ درست ہے مجرم مجرم ہوتے ہیں۔ مجرموں کو سزا بھی ہونی چاہیے لیکن کیا مجرم ہونے کے بعد شہریت ختم ہو جاتی ہے؟ کیا مجرم کامندہب تبدیل ہو جاتا ہے، نہیں ہوتا۔ دنیا مجرم کے سفارتاکار غیر ملکی جیلوں میں بند اپنے مجرموں سے ملتے ہیں۔ ان کے حقوق کا خیال رکھتے ہیں۔ کرس ہو، دیوالی ہو یا عید ہو سفارتی

نمایندے اپنے مجرموں سے ملاقات کرتے ہیں۔ تھوار کے مطابق دوسرے ممالک سے ان مجرموں کے لئے رعایت بھی لیجتے ہیں لیکن ہمارے اندر تو اتنی اخلاقی جرأت بھی نہیں تھی۔ مجھے یقین ہے اگر پاکستان یا ایسی اوامر یکہ سے یہ زیر 251 دن تک موخر کرنے کی درخواست کرتی تو کاسی کو یہ تمیں روزے بھی رکھنے کی مہلت مل سکتی تھی لیکن ایسا نہ ہوا؟ میرے ایک دوست کا کہنا ہے، امریکہ نے کاسی کو جان بوجھ کر رمضان میں سزاۓ موت دی۔ وہ اس نعش کے ذریعے عالم اسلام کو اس کی اوقات سمجھانا چاہتا تھا۔ وہ ان 61 ممالک کو بتانا چاہتا تھا۔ تم میں تو اتنی بھی جرأت نہیں کہ تم اپنے مقدس مینے کا قدس ہی پھاٹکو امریکہ کا خیال صحیح تھا واقعی ان ایک ارب 45 کروڑ مسلمانوں سے وہ بھیزیں اچھی ہیں جو قصائی کو اپنی بہن کی گردن پر چھری پھیرتے دیکھ کر کم از کم باں، باں تو کر دیتی ہیں۔



برف کی ڈلی

بچپن میں ایک بار میرا ہاتھ جل گیا۔ میری ماں برف کوٹ رہی تھی، اس نے برف کی ایک ڈلی اٹھائی اور میرے زخم پر رکھ دی، مجھے فوراً آرام آگیا، میں ہاتھ پر ڈلی رکھ کر باہر چلا گیا اور دوستوں کے ساتھ کھیلنے لگا۔ ذرا سی دیر میں برف پکھلی گئی اور میرا زخم دوبارہ جلنے لگا، میں مزید برف لینے کے لئے گھر دوڑا لیکن جو نبی میں نے ایک اور ڈلی اٹھائی۔ میری ماں نے میرا ہاتھ پکڑا لیا، اس نے کہا ”پتھر برف جلے ہوئے زخموں کا علاج نہیں ہوتی یہ تو بس مریض کوڈاکٹر تک پہنچانے کا نوٹکا ہے اصل علاج تو مریم، گولی یا نیکد ہوتا ہے۔“ میں آنے والے برسوں میں بڑا ہوتا گیا لیکن عمر کے ہر حصے میں برف کی وہ ڈلی میرے شعور سے چکلی رہی، میں صحافت میں آگیا۔ مجھے چیزوں کو غور سے دیکھنے، ان کا تجربی کرنے کا موقع ملا تو معلوم ہوا وہ بات جسے میری ان پڑھ اور دیہات مال بھجنی تھی وہ پچاس بچپن برس سے اس ملک کی پڑھی لکھی قیادت کی سمجھی میں نہیں آ رہی۔ اس ملک میں آج تک جو پالیسی بنی اس کی حیثیت جلے ہوئے زخموں پر برف سے زیادہ نہیں تھی۔ برف پکھل گئی تو زخم بھی دیہی تھے اور جلن بھی، آپ دہشت گردی کو لجھے۔ اس ملک میں جب بھی دہشت گردی کا کوئی واقعہ ہوا حکومت نے موڑ سائیکل کی ڈبل سواری پر پابندی لگا دی اور زخم پر برف کی ڈلی رکھ کر مطمئن ہو گئی۔ برف کی شنڈک نے کچھ دیر جلن کو دبائے رکھا لیکن جب ڈلی پکھل گئی تو معلوم ہوا زخم بھی اپنی جگہ موجود ہے اور جلن بھی۔ آپ جیلوں کو لجھتے 25 جولائی کو سیالکوٹ جیل میں چند خطرناک قیدیوں نے 10 جھوں کو یغماں بنا لیا۔ پولیس نے کافڑا ایکشن کیا اس کے نتیجے میں مجرم بلاک اور تین بیج شہید ہو گئے۔ یہ پاکستان کی عدالتی تاریخ کا افسوسناک ترین واقعہ تھا۔ اس واقعہ سے متاثر ہو کر 27 جولائی کو پنجاب حکومت نے چند لوچپ نیچلے کے۔ وزیر اعلیٰ کو جیلوں کے لئے خصوصی سکواڈ ہنانے، سیکورٹی کے جدید آلات نصب کرنے، مجرموں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے، جیل میں جیل کی پابندی کرنے، جیلوں کی تلاشی لینے اور اچانک دوروں کا حکم دیا۔ یہ احکامات جاری کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے اصل مسئلے پر توجہ دی اور نہ ہی مینٹگ میں موجود اعلیٰ افراد نے اس کی نشاندہی کی الہزادہ زخم پر برف کی ڈلی رکھ دی گئی اور تمام لوگ مطمئن ہو کر اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

زخم اور جلن کی اصل وجہات بہت لوچپ ہیں، اس وقت آزاد کشمیر سمیت پاکستان میں 86 جیلوں میں 25 سنٹرل، 47 ڈسٹرکٹ اور 14 سب جیلوں ہیں۔ ان جیلوں میں 35 ہزار 140 قیدیوں کی

گنجائش ہے لیکن ان میں 82 ہزار 581 قیدی بند ہیں یوں وہ جیل جس میں اوسطاً 408 قیدی ہونے چاہئیں اس میں 960 مجرم بند ہیں جو گنجائش سے 135 فیصد زیادہ ہے، پنجاب میں 10 نشرل، 19 ڈسٹرکٹ اور ایک سب جیل ہے۔ ان 30 جیلوں میں 17 ہزار 637 قیدیوں کی گنجائش ہے لیکن 49 ہزار 754 ملزم اور مجرم بند ہیں۔ آپ جیلوں میں جا کر دیکھیں وہ یہ رک جو 35 لوگوں کے لئے بھی اس میں پچاہی پچاہی قیدی محبوس ہیں۔ آپ یہ بھی دیکھئے ان 82 ہزار 581 قیدیوں میں سے 58 ہزار 652 ملزموں کے مقدمات زیر ساعت یا زیر التو اہیں جبکہ پنجاب کی جیلوں میں بند 33 ہزار 758 ملزم برسوں سے فیصلوں کے منتظر ہیں۔

آپ پوری دنیا کا جائزہ لے لیں جیلیں مجرموں کے لئے ہوتی ہیں ملزموں کے لئے نہیں، ملزم تو حالات میں بند ہوتے ہیں، ہر عدالت کے ساتھ ایک بخشی خانہ ہوتا ہے جس میں وہ ملزم بند کئے جاتے ہیں جن کے مقدمات زیر ساعت ہیں لیکن پاکستان کا شاردنیا کے ان چند ممالک میں ہوتا ہے جن میں ملزموں کو بھی جیل میں دکھلیں دیا جاتا ہے لہذا سائیکل چوری کے اڑام میں محبوس نوجوان جب جیل میں عادی ڈکیتوں اور قاتلوں سے ملتا ہے تو وہ باہر نکلتے نکلتے پورا قاتل اور ڈکیت بن چکا ہوتا ہے۔ یہ ایک مسئلہ ہے دوسرا مسئلہ روئی ہے جیل پر قیدیوں کے دباؤ کی وجہ سے جیلوں میں "روئی" پوری نہیں ہوتی خود سوچنے جب 17 ہزار کا کھانا 50 ہزار لوگ کھائیں گے تو کیا صورت حال ہوگی۔ آج بھی پنجاب کے محکمہ جیل خانہ جات نے خوارک فرایم کرنے والے ٹکنیکردوں کے 8 گروہوں پر ادارے ہیں۔ تینسر پنجاب کی تمام جیلوں کے سامنے ملاقاتیوں کے لئے کوئی وینگ روم، کوئی ہال کمرہ نہیں۔ لوگ کڑی دھوپ میں سرک پر کھڑے رہتے ہیں۔ چوتھا قیدی جیل میں بند ہوتے ہیں، پنچ قیدیوں کو عدالت میں پیش کرنے کا حکم پرمند نہ کو دیتے ہیں لیکن انہیں پیش کرنے کی ذمہ داری پولیس کی ہوتی ہے، پولیس کے پاس گاڑیاں اور فورس نہیں چنانچہ ہزار میں سے بمشکل سو ڈیڑھ سو ملزم ہی عدالت میں پہنچ پاتے ہیں۔ آپ پولیس فورس اور گاڑیاں بڑھائیں یا پھر ملزم کو عدالت تک پہنچانے کی ذمہ داری جیل انتظامی کو سونپ دیں۔ انہیں گاڑیاں دیں، بھی فورس دیں تاکہ مجرموں اور ملزموں کا فیصلہ ہو سکے۔ دنیا بھر میں عدالتوں کے قریب بنائی جاتی ہیں۔ اگر یہ کے دور میں بھی جیل اور عدالت کے درمیان "واکنگ ڈس نیس" ہوتا تھا تاکہ طورم کو آسانی سی عدالت تک پہنچایا جاسکے لیکن آج پاکستان میں جیلیں عدالتوں سے میلوں دور ہیں۔ بعض ملزموں کو تو پانچ سو کلو میٹر کا سفر کر کے عدالت لایا جاتا ہے اس دوری کے بھی اپنے مسائل میں چنانچہ ان مسائل کے ہوتے ہوئے برف کی ہر ڈالی وقتی طور پر تو جلن کم کر دیتی ہے لیکن یہ زخم کا علاج ثابت نہیں ہوتی۔ حرمت ہے برف کی جس ڈالی کو ہماری عام آن پڑھ اور دیہاتی ماں میں بچوں کے زخموں پر زیادہ دیر نہیں رکھتیں، ہمارے حکمران اسے قومی پالیسی بناتے آ رہے ہیں۔ اسے ہر زخم، ہر مرض کا علاج سمجھتے آ رہے ہیں۔



روشن

کسی بازار میں دو جزل سور تھے۔ دونوں کا سائز ایک جتنا تھا۔ دونوں میں مصنوعات ایک جیسی تھیں اور دونوں کے مالکان بھی ایک دوسرے کے بھائی تھے لیکن ایک جزل سور پر بارہ گھنے کا ہوں کا رش ہوتا تھا جبکہ دوسرا بھائی دن بھر تکھیاں مارتا رہتا تھا۔ ایک روز خسارے کا شکار بھائی دوسرے بھائی کی دکان میں داخل ہوا اور اس کے گھنے چھو کر پوچھا "آخر میں ناکام اور تم کامیاب کیوں ہو؟" بڑے بھائی نے قہقہہ لگایا اور چھوٹے بھائی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا "منے کاروبار میں صرف دکان اور سودا کافی نہیں ہوتا، کاروباری اصول بھی درکار ہوتے ہیں۔" چھوٹے بھائی نے حیرت سے بڑے بھائی کی طرف دیکھا، بڑا بھائی بولا "برخوردار گا کب کی عزت مناسب دام اور روشن وہ اصول ہیں جو آپ کو پکارنا مدد ادا ہاتے ہیں۔" چھوٹے بھائی نے پوچھا "گا کب کی عزت اور مناسب دام تو کبھی آتے ہیں لیکن یہ روشن کیا بلا ہے۔" بڑے بھائی نے قہقہہ لگایا اور چھوٹے کے سامنے ہاتھ لہرا کر بولا "میں 1940 سے صحیح چھ بجے دکان کھوٹا اور رات پارہ بجے بند کرتا ہوں، میرے تمام گا کب جانتے ہیں، آندھی ہو، رزلہ ہو، بارش یا طوفان میں انہیں دکان پر ملوں گا، میری یہ روشن، میرا یہ تسلیل ہی میرا اعتبار ہے لہذا میں کامیاب ہوں!!"

بڑے بھائی کی بات درست تھی چھوٹے بھائی کے پاس دکان تو تھی لیکن تسلیل نہیں تھا بالکل ہمارے سیاستدانوں کی طرح، ان سیاستدانوں کی طرح جنہوں نے سیاست کی دکان تو کھول رکھی ہے لیکن ان کے پاس کاروباری روشن اور تسلیل نہیں۔ وہ پارلیمنٹ میں آئیں، بیانات جاری کرنے اور تقریروں کرنے کو جمہوریت سمجھتے ہیں اور جن کا خیال ہے ان کی دکانداری بھی اب چل جانی چاہیے، جو یہ سمجھتے ہیں انہیں جمہوری سسٹم زندہ رکھے گا جبکہ یہی ان کی خام خیال، یہی ان کی سادگی ہے۔ دنیا میں سسٹم اور نظام نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی اگر آپ پورے ملک کے لوگوں کو نظام کی دودو کا پیاں پکڑا دیں اور تمام لوگ اس سسٹم کا ایک ایک لفظ رٹ لیں تو بھی لوگ اور ملک ترقی نہیں کر پاتے کیونکہ سسٹم نفاذ اور تسلیل کے بعد اپنا اثر دکھاتے ہیں، رزلہ دیتے ہیں۔ آپ امریکہ کی مثال لیجئے، دنیا میں تین امریکے ہیں۔ شانی امریکہ، اس امریکہ میں تین ممالک ہیں ریاست ہائے متحدہ امریکہ، کینیڈا اور میکسیکو، سینٹرل امریکہ۔ اس امریکہ میں سات ممالک ہیں۔ ایل سلوادور،

بیلانز، پاتامہ، کوئٹہ ریکا، گوئے مالا، نکارا گوا اور ہندورس۔ جنوبی امریکہ، اس امریکہ میں 12 ممالک ہیں۔ ارجمندان، بولیویا، برازیل، چلی، کولمبیا، ایکواڈور، گویانہ، پیراگوئے، پیرو، سرینام، یوراگوئے اور دیز و یلا۔ 1776ء میں جب ریاست ہائے متحده امریکہ (یوائیس اے) نے صدارتی نظام نافذ کیا تو سنپل اور جنوبی امریکہ نے بھی اس نظام کی نقل کر لی لہذا اس وقت برعظم امریکہ کے 22 ممالک میں سے 20 میں امریکی جمہوریت ہے۔ تمام ممالک میں اسی طرح صدر منتخب ہوتے ہیں جس طرح ہڈر بیش صدر بنے تھے۔ تمام ممالک میں صدر اپنی کابینہ منتخب کرنے میں اسی طرح آزاد ہیں جس امریکی صدر پا اختیار ہے۔ تمام ممالک میں نائب صدر بھی ہیں اور تمام ممالک کے وزراء بھی سیکریٹری کہلاتے ہیں۔ 99 فیصد ممالک میں امریکہ کی طرح صدر تیسری یا چوتھی بار منتخب نہیں ہوتا لیکن، لیکن آپ یوائیس اے اور دوسرے 21 ممالک میں فرق دیکھے لیں۔ یوائیس اے کا جی ڈی پی 10 کھرب چار سو اب ڈالر ہے جبکہ ان 21 ممالک کا مجموعی جی ڈی پی امریکہ سے نصف ہے۔ کینیڈا اور برزیل کا تورقب بھی کم و بیش امریکہ کے برابر ہے۔ ان تمام ممالک کی مجموعی آبادی اور انفرادی وسائل بھی امریکہ سے زیادہ ہیں لیکن یوائیس اے اور باقی امریکہ میں زمین آسمان کا فرق ہے لہذا پھر سوال پیدا ہوتا ہے جب ستم ایک جیسا ہے، لوگوں کی شکل و شبہات، پھر اور اب واحد ایک جیسا ہے۔ یہ سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ ان سب کی آب و ہوا ملتی جاتی ہے۔ ان سب کے دریا، ہوا جیس اور سرحدیں بھی مشترک ہیں تو پھر یہ ممالک امریکہ کیوں نہیں ہیں۔ یہ 21 ممالک پر پارکیوں نہیں، چلنے اگر یہ انفرادی سڑک پر یوائیس اے کے برابر نہیں ہو سکتے تو یہ تمام ممالک مل کر جی ڈی پی، لیکن اونچی اور فوج میں امریکہ کے مساوی ہو جائیں لیکن ایسا نہیں۔ برعظم امریکہ کا 85 فیصد رقبہ اور سولہ سترہ ممالک تیسری دنیا میں شمار ہوتے ہیں۔ وہاں بھوک، بے روزگاری، لا قانونیت اور خانہ جنگلی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ بات بالکل واضح ہے یوائیس اے نے 1776ء میں ایک نظام بنایا اور پھر 2003ء تک اس پر پوری طرح عمل کیا۔ ان 227 برسوں میں اس نظام میں کوئی تبدیلی نہیں آنے دی۔ بڑے سے بڑا اور مضبوط سے مضبوط ترین صدر بھی اس نظام میں بال برابر ترمیم نہیں کر سکا۔ کینیڈی ہو، کارپری ہو، بیش، ریگن یا پھر کلینٹن امریکہ کے تمام صدور اس نظام، اس آئین کے پابند رہے، کسی سربراہ، کسی حکمران کو اس میں ترمیم کرنے کی جرأت نہ ہوئی جبکہ اس کے مقابلے میں سنپل اور جنوبی امریکہ کے تمام حکمران اپنے نظام میں آٹھویں، نویں، دسویں، بارھویں اور چودھویں ترمیم کرتے رہے، ان میں پورے پورے ایل ایف او کسیز تے رہے۔ اپنے غیر آئینی اقدامات کو آئینی شکل دینے میں مصروف رہے لہذا آج یوائیس اے اور امریکہ کے باقی 21 ممالک کے درمیان ایک لگیر کھنچ چکی ہے لکیر کے اس طرف ترقی، خوشحالی اور اس نے بے جبکہ دوسری طرف پسمندگی، بیروزگاری اور لا قانونیت۔

محظی امریکہ اور میکسیکو کے سرحدی شہر اپا سو جانے کا اتفاق ہبوا۔ اپا سو کبھی میکسیکو کا حصہ ہوتا تھا

لیکن جب امریکا بنا تو یہ شہر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک اپا سو امریکہ میں آگیا اور دوسرا میکسیکو میں۔ ان دونوں کے درمیان چھوٹی سی نہر اور کانے دار تار کی دیوار ہے دونوں طرف ایک ہی قوم اور ایک ہی نظام ہے لیکن ہر روز سینکڑوں میکسیکن مرحد پھلانگ کر اپا سو آتے ہیں۔ پکڑے جاتے ہیں اور امریکی حوالات میں بند کر دیئے جاتے ہیں! کیوں اس لئے کہ اپا سو کے امریکیوں نے اپنے آئین کو سواد و سو سال تک روشن بنائے رکھا اس میں ترمیم نہ ہونے دی جبکہ اپا سو کے اس طرف کا میکسیکو بر سوں سے ایل ایف او کا شکار ہے لہذا ان لوگوں کو اپا سو میں زیادہ روشنی زیادہ رزق نظر آتا ہے۔ کہتے ہیں روشن گدھے کو گھوڑا نہیں ہنا سکتی لیکن یہ گدھے کو گھوڑے سے آگے ضرور لے جاسکتی ہے۔



حاب

میرا دوست پریشان تھا، وجہ بہت معمولی تھی، میرے دوست نے آم خریدے اور ان میں سے آدھے خراب نکل آئے، میں نے اسے تسلی دی تو وہ پھٹ پڑا۔ ”یہ ملک نجیک نہیں ہو سکتا، میں نے جب اس گدھے کو مند مانگے پیسے دیئے تھے تو پھر بے ایمانی کرنے کی ضرورت تھی، میرا نقصان کر دیا۔“ میں نے قہقهہ لگایا اور ہاتھ سے اسے ”اٹھ“ کیا، اس نے جیرت سے میری جانب دیکھا، میں نے کہا ”تم نقصان کا غلط تجھیں لگا رہے ہو، تم مجھے چند سوالوں کا جواب دو“ وہ ہم تین گوش ہو گیا۔

میں نے پوچھا ”کیا وہاں آموں کی ایک ہی دکان تھی“ وہ بولا ”نہیں، اس پوری سڑک پر فروٹ کی بیسیوں دکانیں اور ٹھیلیے تھے“ میں نے پوچھا ”تم ان بیسیوں دکانوں میں سے صرف اس کے پاس کیوں گئے“ اس نے جواب دیا ”میں نے ساری دکانوں اور ٹھیلوں کا سروے کیا لیکن مجھے یہ شخص معقول لگا“ میں نے پوچھا ”کیا یہ تمہاری زندگی کا پہلا نقصان ہے“ اس نے فوراً جواب دیا ”نہیں یہ تو صرف چند روپوں کا نقصان ہے، تم جانتے ہو میرے ہزاروں لاکھوں روپے ڈوب چکے ہیں“ میں نے پوچھا ”کیا تمہیں ان ہزاروں لاکھوں روپے کا بھی اتنا ہی افسوس ہوا تھا“ تھوڑی دری سوچ کر بولا ”نہیں، مجھے ان چند روپوں کا زیادہ افسوس ہوا“ میں نے پوچھا ”یہ عجیب بات نہیں“ وہ چند لمحوں تک گردن جھکا کر سوچتا رہا اور پھر اور پھر دیکھ کر بولا ”ہاں یا رہ، تم نے تو نیا نظر پیدا کر دیا۔“

میں نے قہقہہ لگایا اور اسے لشو پیپر پیش کر کے کہا ”میری جان، یہ چند روپے کا نقصان نہیں، یہ بیماری طور پر اعتماد کا نقصان ہے“ اس نے جیرت سے میری طرف دیکھا میں نے عرض کیا ”اس سڑک پر فروٹ کی درجنوں دکانیں اور ٹھیلیے تھے لیکن تم نے صرف اس دکاندار پر اعتماد کیا، تم نے اس پر اعتماد کرتے ہوئے اسے من مانگے دام دیئے، اس نے لفافے میں جو کچھ ڈالا تم نے اس پر اعتماد کرتے ہوئے کھوں کر نہیں دیکھا لیکن جب گھر پہنچ کر تم نے لفاف کھولا تو اس میں سے خراب آم نکل آئے، تمہارے اعتماد کو جھٹکا لگا لہذا تم اس وقت سے پریشان میٹھے ہو، تمہاری پریشانی معاشری نہیں رو جاتی ہے“ وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا، میں نے عرض کیا ”ہر اور، ہم بہت عجیب لوگ ہیں، ہم اپنے روحانی، اخلاقی اور رہنمی صدموں کو بھی معاش اور روپے

پیسے سے ماتحتے ہیں، دنیا میں روپیہ پیسے تو آئی جانی چیز ہوتی ہے، آج ہمارے ہاتھ سے نکل گیا، کل پھر آجائے گا لیکن اعتماد چینی کی وہ پلیٹ ہے جس میں ایک بار بال آجائے تو پھر عمر بھی نہیں جاتا، بھی اس بال، اس نقصان، اعتماد کے خساے کے بارے میں نہیں سوچتے، ہم بحیثیت قوم روپے پیسے کے خسارے کو نقصان سمجھتے ہیں، یقین کرو ہماری پریشانی کی وجہ معاشری نقصان نہیں، بے روزگاری، غربت اور آمریت بھی نہیں اس کی وجہ اعتماد ہے، ہم آج تک بے نظیر کوئی بھلا کتے رہے ہیں، نواز شریف کو کوستہ رہے ہیں۔ ان سے پہلے جزل ضیاء الحق، ذوالفقار علی بھجنو، سید خان اور ایوب خان ہمارے ہدف تھے۔ ہم کہتے ہیں، ان لوگوں نے ملک کو ناقابلٰ حلائی نقصان پہنچایا، پوچھتے والے پوچھتے ہیں "کیا نقصان پہنچایا" ہم فوراً کہتے ہیں "ان لوگوں نے ملک کو امریکہ کی جھوولی میں گرا دیا، ساری امن مشری، سارے پرائیوریت اداروں کو قومیا کر کھربوں کا نقصان پہنچایا، ملک توڑ دیا، ملک کے اٹاٹے بچ کر سوکیں یونک بھر دیئے اور چیلی نیکیوں اور موڑوے جیسے ہاتھیوں کے ذریعے ملکی معیشت کچل دی وغیرہ وغیرہ مگر پندرہ کروڑ کی آبادی میں سے کوئی نہیں کہتا ان لوگوں نے ہمارے اعتماد کو نہیں پہنچائی، انہوں نے ہماری منتخب کرنے، پسند کرنے اور چننے کی صلاحیت کی تو ہیں کی۔" اس کے چہرے پر حرمت کے رنگ گھبرے ہوتے جا رہے تھے۔

میں نے کہا "اس ملک میں 129 سالی جماعتیں ور 4 ہزار لیڈر ہیں لیکن قوم نے ان لیڈروں میں صرف بینظیر اور نواز شریف پر اعتماد کیا اسلامیک اور ہمیز پارٹی کو ووٹ دیئے مگر ان لوگوں نے عموم کے اعتماد کو دھوکہ دیا، ہمیں ان پر غصہ ہے یہ غصہ اس دھوکے کا نتیجہ ہے جو ہمارے اعتماد سے ہوا، جو ہمارے اعتماد کو نہیں پہنچی لیکن ہم اس معاشری، اس اقتصادی نقصان کا روتا روتے رہتے ہیں جو اعتماد کے اس دھوکے سے کہیں کم، کہیں حیرت ہے، ہم موڑوے پر خرچ ہونے والی رقم، معاف ہو جانے والے قرضوں اور سوکیں اکاؤنٹس کا داویلہ تو کرتے ہیں لیکن ہم..... جی ہاں ہم اپنے اعتماد پر پڑنے والے ڈاکے کو بھول جاتے ہیں۔ ہمیں مشکل فوجی حکمرانوں کے سلسلے میں درپیش ہے، ہم نے ایوب خان کو جہویت کا قائل قرار دیا۔ جزل ضیاء کو معاشری منافقت کی فیکٹری کہا اور اب جزل پر ویز مشرف کو بے چک انسان کہہ رہے ہیں لیکن ہم میں سے کوئی اس اعتماد کی بات نہیں کرتا جو ان لوگوں کے جتوں تک چلا گیا، قوم نے ان لوگوں کو برداشت کیا، جس نے چاہا گیارہ سال حکومت کی، جس نے چاہا 13 سال اور جس نے چاہا 3 برس لیکن قوم نے ان کے خلاف کوئی احتجاج، کوئی ابھی نیشن نہیں کیا، ان کا ہر حکم چپ چاپ سہہ گئی، یہ لوگ پورے نظام کو تہس نہیں کرتے رہے مگر کسی نے آج تک ان سے اپنے اعتماد کا حساب نہیں مانگا۔" میرا دوست خاموش رہا۔

میں نے اس سے عرض کیا "میرے دوست، لوگ ہوں یا قومیں وہ جب تک اپنے اعتماد کا حساب نہیں کر سکیں وہ ترقی نہیں کر سکتیں، ان کی پریشانی، ان کا غصہ دور نہیں ہو سکتا!"



ترقی

پاکستانی قوم کے بارے میں نام کا تبرہ حرف آخر ہے، نام برطانوی صحافی ہے، افغانستان کے بھر ان میں اسے پاکستان رہنے کا اتفاق ہوا، اسے ملک کے طول و عرض پر سفر کرنے اور پاکستان اور پاکستانیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اپنے اس تجربے کی بنیاد پر اس نے اس ملک کے باسیوں کے بارے میں وہ خوبصورت تبصرہ کیا ہے جسے پڑھ کر دل خوش ہو جاتا ہے "نام نے کہا پاکستانیوں میں حرکت بہت ہے، یہ دن میں 24 گھنٹے اپنی جان پر کھیلتے ہیں لیکن اس رسمک اس حرکت سے انہیں حاصل کچھ نہیں ہوتا ان کی جدوجہد کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔" نام نے اس سلسلے میں ہر ہی خوبصورت مثال دی۔ اس نے بتایا "وہ اندر وون ملک سفر کر رہا تھا، ایک جگہ بیٹھتے چھاٹک بھم ہو گیا، دونوں اطراف مزیک رکی تھی۔ میں نے دیکھا ایک نوجوان دیہاتی سائیکل کے پیڈل مارتا چھاٹک تک آیا، سائیکل سے اترنا، سائیکل اخہالی، کندھے پر رکھی اور چھاٹک کی بغل میں موجود ایک فٹ جگہ سے گھستتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ جب وہ اس جدوجہد میں مصروف تھا تو ٹرین اس کے سر پر چکنی چکی تھی لیکن وہ بے خبر چھاٹک عبور کر گیا، دوسری سمت پہنچ کر اس نے سائیکل نیچے اتاری، چھاٹک لگا کر اس کی کاشی پر بیٹھا اور گاڑیوں میں سے راستہ بناتا ہوا عابر ہو گیا، اس سارے ٹول کے دوران اس نے ٹرین کی طرف آنکھی اٹھا کر نہیں دیکھا، مجھے اس کی بہادری نے ششدیر کر دیا، میں بے اختیارات لیاں بجائے گا۔" میں نے سوچا اس شخص کو لازماً جلدی ہو گی، اس نے کہیں نہ کہیں وقت پر پہنچنا ہو گا لہذا اس نے فرض کی ادا سائیکل کے لئے جان تک کی پرواہ نہ کی، چھاٹک کھل گیا، مزیک چل پڑی۔ ذرا دوسری ایک جمیع لگا تھا، میں نے دیکھا، وہی بہادر شخص اپنے سائیکل کے کیریز پر کھڑا ہو کر جمیع میں جھاٹک رہا تھا۔ میں نے رک کر لفتیش کی تو معلوم ہوا وہاں مداری کا کھیل ہو رہا ہے اور میرا بہادر ہیز و بڑے انہاک سے وہ کھیل دیکھ رہا ہے۔ میں حیران رہ گیا اور سوچنے لگا اگر اس شخص نے اس کھیل ہی میں وقت برپا کرنا تھا تو پھر اسے اپنی جان جو کھوں میں ڈالنے کی کیا ضرورت تھی۔ تب مجھے اندازہ ہوا یہ شخص اس پوری قوم کا نقیباتی نمائندہ ہے۔ یہاں لوگ بہت تیز بھاگتے ہیں، ان کی زندگی میں حرکت اور افراғزی ہے لیکن اس افراعزی، حرکت اور بھاگ دوڑ کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔"

مجھے نام سے سو نیصد اتفاق ہے واقعی ہم لوگ چار اشارے توڑ کر گھر پہنچیں گے اور پھر دھوئی اور

بیان پہنچ کر دیریک پیٹ پر خارش کرتے رہیں گے، ہمارے پاس کرنے کے لئے کچھ نہیں ہو گا یہ معاملہ صرف ہم عوام تک محدود نہیں، ہماری حکومتوں کی کوششوں کا بھی سبی نتیجہ نہ تھا ہے، ہماری زیادہ تر پالیسیاں سائیکل کندھے پر رکھ کر پھانک عبور کرتی ہیں اور پھر کیریز پر کھڑی ہو کر مداری کا تماشہ دیکھنے میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ آپ گورنمنٹ ہینک کو لیجھتے، ڈاکٹر عشرت حسین نے 26 اگست کو لاہور میں ایوان صنعت و تجارت میں تاجریوں اور صنعتکاروں سے خطاب کیا۔ اس خطاب میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ”تمام آثار ملک میں معاشی ترقی کی نشاندہی کر رہے ہیں بنکوں سے اس سال 44 کی بجائے 153 ملین قرضے لئے گئے مشینزی کی درآمد میں بھی 37 فیصد اضافہ ہوا۔ سیلز ملک کی وصولی 24 فیصد، سیمنٹ کی پیداوار 12 فیصد اور سیل کی پیداوار 21 فیصد بڑھی یکن اس ترقی کے باوجود روزگار میں اضافہ نہیں ہوا، روزگار کے ذرائع نہیں بڑھے یہاں پہنچ کر میری اکنامکس فیل ہو جاتی ہے۔“ ڈاکٹر صاحب کی پریشانی بجا ہے واقعی اگر جوں نکنے والی مشین میں سیب ڈالے جا رہے ہوں، مشین بھی چل رہی ہو یکن جوں کا جگ خالی ہو تو حیرانی کی بات ہوتی ہے دیکھنے والوں، مشین چلانے والوں کو اس صورتحال پر پریشان ہونا چاہیے۔ خود سوچنے جس ملک میں ہینک زیادہ قرضے چاریں کر رہے ہوں، مشینزی کی درآمد میں اضافہ ہو، سیلز ملک کی وصولی اور کارخانوں کی پیداوار بھی بڑھ رہی ہو اس ملک میں روزگار کے موقع بھی بڑھ جانے چاہیے۔ بے روزگاری میں کمی بھی آئی چاہیے یکن ہمارے ملک میں اکنامکس کا یہ بنیادی اصول بھی تکلف کھا پکا ہے۔ نتیجے ملک پہنچ کر حرکت بے نتیجہ ہو چکی ہے، یہ کیوں ہے؟ ایسا کیوں ہے؟

یہ معاملہ صرف معیشت تک محدود نہیں اس ملک میں اسپلیاں ہیں ایکش بھی ہوتے ہیں ارکان کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے لیکن جمہوریت نہیں۔ اس ملک میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے لیکن علم میں اضافہ نہیں ہو رہا۔ اس ملک میں پولیس اور تھانوں میں بھی اضافہ ہو رہا ہے لیکن جرم کم نہیں ہو رہے، امن و امان میں اضافہ نہیں ہو رہا۔ اس ملک میں مسجدیں اور مدرسے بھی بڑھ رہے ہیں لیکن مذہبی رواداری اور نظریاتی برداشت میں اضافہ نہیں ہو رہا اور اس ملک میں زرعی پیداوار بڑھ رہی ہے فریکٹروں اور ٹوب ویلوں میں بھی اضافہ ہو رہا ہے لیکن لوگوں کی بھوک میں کمی نہیں آ رہی لوگوں کا رزق کشاوہ نہیں ہو رہا، یہ کیا ہے؟ حرکت بھی ہے، اضافہ اور ترقی بھی ہے لیکن اس ترقی، اس اضافے اور اس حرکت کا جو نتیجہ نکلا چاہیے وہ نہیں نکل رہا خلقت خدا کو اس ترقی، اس اضافے کا کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا۔ بات پھر ہام کے تصریح پر آکر رکتی ہے۔ ہم من جیٹ القوم پھانک عبور کر جاتے ہیں لیکن جہاں ہمارے اس رسمک، اس کوشش اور اس حرکت کو شر آور ہونا چاہیے وہاں پہنچ کر ہم سائیکل کے کیریز پر چڑھتے ہیں اور مداری کا تماشہ دیکھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ سائنس کا ایک کلیے ہے اچھی مشین وہ ہوتی ہے جو کم ان پت لے کر زیادہ آؤٹ پٹ دے۔ تو میں بھی مشینوں کی طرح ہوتی ہیں اچھی تو میں محنت سے زیادہ نتیجے حاصل کرتی ہیں ہم کیسی قوم ہیں ہماری مشینیں ایک ٹرک گماہ سے ایک کا چینی نہیں بنا سکتیں، چار ہزار کارخانے 40 بے روزگاروں کو روزگار نہیں دے سکتے۔

دودن

میں 1995ء میں اسلام آباد کے ایک ماؤن دلچ راول ناؤن میں رہتا تھا، راول ڈیم کے پہلو میں آباد یہ بستی بنیادی طور پر گوالہ کالوئی تھی جو کبھی وفاقی دار الحکومت کو دودھ فراہم کرنے کے لئے بنائی گئی تھی لیکن یہ منصوبہ کامیاب نہ ہوا کا لہذا سی ڈی اے نے اسے عام شہریوں کے لئے کھول دیا۔ لوگ آئے، پلاٹ خریدے، گھر بنائے اور آباد ہو گئے لیکن اس آباد کاری کے باوجود اس ماؤن دلچ کی "لک" گوالہ کالوئی جیسی ہی رہی، اس بستی سے چند گز کے فاصلے سے مری روڈ گزرتی ہے۔ نیلوں فیکٹری اور شہزاد ناؤن کو جانے والی روڈ بھی اس کے دامن سے الجھ کر جاتی ہے۔ راول ڈیم جیسی تفریح گاہ بھی اس کے پہلو میں آباد ہے مگر کوئی اجنبی راول ڈیم پر کھڑے ہو کر مری روڈ پاپارک روڈ سے گزرتے ہوئے یہ تصویر نہیں کر سکتا کہ چند گز دور ایک ایسی بستی ہے جہاں سڑکوں اور گلیوں میں بھیں دنداناتی پھرتی ہیں۔ جہاں بارہ مینے کراچتے اور نالیاں سڑکوں پر بھتی ہیں۔ جہاں سے سی ڈی اے کے سینٹری ایکاروں کو گزرے مدت ہو چکی ہے اور جہاں سے سڑکوں کو مرمت ہوئے ایک عرصہ، ایک دور گزر چکا ہے لیکن پھر 1995ء میں یہاں ایک عجیب واقعہ پیش آیا، اس وقت کی وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کا روحانی بزرگ بابا ملتانی کہیں سے آ کر راول ناؤن میں خیمنہ زدن ہو گیا، پھر وزیر اعظم کا تھا، روز ان کا دم کیا پانی وزیر اعظم ہاؤس جاتا تھا چنانچہ راتو رات بابا ملتانی کے لئے راول ناؤن میں پلاٹ پیدا کیا گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس پر تعمیر شروع ہو گئی، بابے کا گھر بننے لگا۔ میں بابا ملتانی کے اس زیر تعمیر گھر سے ایک آواز کے فاصلے پر رہتا تھا، روز گزرتے ہوئے بابا ملتانی کو بھی دیکھتا اور اس کے گھر کی تعمیر میں معروف لیبرفورس کو بھی۔

پھر ایک دن وہاں اس سے بھی بڑا واقعہ پیش آیا، میں نے دیکھا سہ پھر کو راول ناؤن میں سی ڈی اے کی ہیوی مشینری آئی، درجنوں مزدوروں نے سڑک کو اپنے نرخے میں لیا، سڑک صاف کی گئی، تار کوں آئی، بھری لائی گئی، سڑکوں پر پھر لائے گئے، مکھر آئے اور پھر ایک ہی رات میں وہاں میں الاقوامی معیار کی کارپٹ روڑ بچھ گئی۔ میں صحیح انھا تو یہ مجرزو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اسی دن سی ڈی اے کے چالیس چھاس سینٹری ورک آئے اور ایک آدمی گھنٹے میں راول ناؤن کو لندن بنادیا۔ میرے سمت اس بستی کے تمام بائی اس تبدیلی پر

چیران رہ گئے اور سب ایک دوسرے سے اس کی وجہ پر چھنے لگے۔ شام تک پورے شہر کو اس کی وجہ معلوم ہو گئی۔ بات دراصل یہ تھی دو دن پہلے وزیرِ اعظم جینظیر بھٹونے بنیں نہیں اپنے "بائے" کی خدمت میں حاضر ہونے کا اعلان فرمادیا تھا۔ یہ ساری تیاریاں وزیرِ اعظم کے استقبال کے لئے تھیں کہ جب وہ مری روڈ سے اتریں تو انہیں کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔ جینظیر اس روز راول ناؤن آئیں۔ تھوڑی دیر بابا ملتانی کی "روحانی محفل" کا لفظ اخیالیا اور پھر رخصت ہو گئیں لیکن وہ سڑک آج تک راول ناؤن کے قدموں میں پھی ہے۔ ہاں یاد آیا جب اس بستی میں داخل ہوتے ہیں تو شروع میں یہ سڑک ایل کی شکل میں مرتی ہے جس کے باعث وہاں آج تک کمی حادثے ہو چکے ہیں، جینظیر کے دورے کے دوران انظامیہ نے اس کے برابر ایک دوسری سڑک بنانے کا فیصلہ کیا، جنگل کا ناگیا، منی ڈالی گئی، پھر بچھائے گئے لیکن پھر انظامیہ کو محسوس ہوا بے نظم شاید دوسری بار "بائے" کے پاس حاضر ہو گئی کیونکہ بابا جی انہیں شربت دیدار سے مستفید کرنے کے لئے اب خود ہی وزیرِ اعظم ہاؤس چلے جاتے ہیں تو اس نے اس منصوبے کو اپنی توجہ کی فہرست سے خارج کر دیا لہذا آج چھ سال ہو چکے ہیں وہ سڑک وہیں کی دیس رکی پڑی ہے اس کے پھر تک مٹی میں دفن ہو چکے ہیں، کسی نے آج تک اس کی طرف مزکر نہیں دیکھا۔

یہ واحد مثال نہیں ہے پاکستان کے ایسے درجنوں شہر، سڑکیں اور مقامات ہیں جہاں کبھی کسی سر بردار مملکت نے قدم رنجا فرمائے تو ایک آدھ دن کے لئے اس مقام، اس سڑک اور اس شہر کا مقدار بدلتا گیا، رات ہی رات میں نئی سڑکیں بن گئیں، جگہوں پر لائس لگ گئیں، اجتنے گمراور بھتی ہالیاں راہ راست پر آگئیں جبکہ اس کے مقابلے میں ایسے شہر بھی ہزاروں کی تعداد میں ہیں جو اپنی پیدائش سے اب تک اس لئے گندے، بد بودار اور ناقابل رہائش چلے آ رہے ہیں کہ وہاں سے کبھی کسی وزیرِ اعظم، کسی چیف ایگزیکٹو کا گزر نہیں ہوا۔ یہ سرکاری ملازمین کی نفیات ہے جب اسے معلوم ہوتا ہے فلاں جگد سے فلاں تارنگ کو کوئی اہم شخصیت گزرے گی یا قیام کرے گی جس کے پاس اسے قارغ کرنے کا پورا اختیار ہے تو وہ اپنی پوری تو ادائی سے کام کرتے ہیں۔ آپ لا ہو رکا ماذل ناؤن دیکھ لیں، رائے وہنڈ کا جائزہ لے لیں، کراچی میں بلا دل ہاؤس اور ستر کافشن کے علاقے کا چکر لگا لیں، چیف ایگزیکٹو آفس سے ایئر پورٹ تک سڑک پر چل کر دیکھ لیں آپ کو یہ جگہیں دوسری تمام جگہوں سے مختلف کھائی دیں گے۔ نواز شریف کے دور میں مری نے بہت ترقی کی اس کی کیا وجہ تھی؟ اس کی یہ وجہ تھی کہ نواز شریف، شہباز شریف اور ان کی فیملی مری آتی جاتی رہتی تھی لہذا مری کا ترقیاتی بجٹ پورے کا پورا خرچ ہونے لگا۔ اب اس دور میں کئی نہیں ایریاں میں بہت کام ہو رہا ہے کیوں؟ اس لئے کہ انظامیہ جانتی ہے ساری کی ساری حکومت انہی علاقوں میں رہتی ہے۔

یہ ترقی اور ترقیاتی سرگرمیوں کا فلسفہ ہے آپ یقین کیجئے جب تک ہماری سرکاری مشینزی ٹرینوں میں سفر کرتی رہی ہمارا ریلوے نظام صحیک رہا۔ ٹرینیں وقت پر چلتی اور وقت پر چکتی رہیں، جب تک وزراء

اپنی تجذبہ ہوں میں گزارہ کرتے رہے اس ملک میں مہنگائی نہیں ہوئی، جب تک حکمران سرکاری ہسپتاوں کی عام واردوں میں داخل ہوتے رہے ہمارے ہسپتاوں کا نظام نحیک چلتا رہا۔ سیکرٹری بوسوں میں دفتر جاتے رہے بہیں صاف ستری اور خوبصورت رہیں، افسروں کے پچھے عام سکولوں میں پڑھتے رہے ہمارا سرکاری تعلیمی نظام اچھا ہی نہیں بیدا کرتا رہا لیکن جب ہمارا حکمران طبقہ ہماری اشرافی عوامی اداروں سے الگ ہونا شروع ہوئی تو ان اداروں کے برج گرنے لگے، بنیادیں بیٹھ گئیں، دیواریں ڈھن گئیں اور لوگوں نے صحنوں میں راستے بنالئے لہذا ہم آج زوال کی آخری حد چھوڑ رہے ہیں۔

گو 14 کروڑ لوگوں کے لئے 130 ارب روپے کا ترقیاتی فنڈ کم ہے۔ ہمارے پاس پیسے ہی نہیں ہیں یہ ساری باتیں نحیک ہیں لیکن ہم ان 130 ارب روپے سے بھی نحیک خاک ترقی کر سکتے ہیں۔ اپنے شہر اپنے دیہات، اپنے اداروں کو خوبصورت بنائتے ہیں بس ہماری حکومت کو ایک دو کام کرنے ہوں گے۔ وہ اپنے وزراء کو شہر کی مختلف بستیوں میں آباد کرے۔ انہیں عوامی ٹرانسپورٹ استعمال کرنے، نکلے کا پانی پینے، بچوں کو سرکاری سکول میں داخل کرنے اور ہماری کی صورت میں سرکاری ہسپتال کے جزل وارد میں داخل ہونے کا حکم دے دے تو پھر دیکھئے۔ یہی نظام کس خوبصورتی اور تیزی سے کام کرتا ہے، خود سوچنے جب وزیر تعلیم کے پچھے اپنی سن میں پر ہیں گے، وزیر سخت اپنا علاج امریکہ سے کرا میں گے، وزیر دیلوے چہاز پر سفر کریں گے، ایس ایچ اور پٹ لٹھے لئے وزیر داخلہ کے گھر آئے گا، وزیر خزانہ کا پچھن سرکاری خرچ سے چلے گا، بھل کے وزیر کی بھل فری ہو گی اور چیف ایگزیکٹو ہیلی کا پڑپر آئیں جائیں گے تو نظام کے انہوں سے خاک پچھے نہیں گے، آپ امدادی نیم کے چیف کو پہاڑ پر بخدا دیں گے تو اسے کیسے معلوم ہو گا سیالاب کیا ہوتا ہے، صحرائیں ایئر کنڈیشن لا کر سوئے آدمی کو گرمی کا احساس کیے ہو گا اور سائیکل یا میں گرم پانی سے غسل کرنے والے کو سردی کا اندازہ کیے ہو گا؟ برف کو برف میں اور کوئلے کو انگیشہ میں رکھ کر دیکھیں یہ نظام دو دن میں نحیک ہو جائے گا۔



نان ایشوز

غالب انگریزوں کی سازش بھائیتے والا پہلا شخص تھا، وہ کہتا تھا انگریز بر صیر کو زبان کی بیاد پر تقسیم کرے گا، وہ مسلمانوں کے منہ سے لفٹے والے الغاظ کو ارد و اور ہندوؤں کی بولی کو ہندی کئے گا۔ غالب کہتا تھا مجھے سمجھنیں آتی زبان ہندو یا مسلمان کیسے ہو سکتی ہے، زبان تو صرف زبان ہوتی ہے۔ یہ تو بالکل ایسے جیسے مسلمان کی بھیس مسلمان ہوا اور ہندو کی ہندو۔ غالب اس سلسلے میں ایک گھوڑے کی مثال دیا کرتا تھا، وہ گھوڑا پہلے کسی مسلمان راجہ کے پاس تھا، پھر اسے کسی ہندو مہاجر نے خرید لیا اور آخر میں وہ کسی سکھ کی ملکیت میں چلا گیا، غالب کہتا تھا اب بتائیے وہ گھوڑا مسلمان ہوا، ہندو یا پھر سکھ۔ وہ قہقہہ لگاتا تھا اور احباب سے کہتا تھا "اس قدر مختلف عقیدے کے لوگوں کی ملکیت رہنے کے باوجود وہ گھوڑے کا گھوڑا رہا انسان نہ بن سکا۔"

غالب کی بات صحیک تھی، واقعی زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، وہ فقط زبانیں ہوتی ہیں۔ انہیں کوئی بھی سیکھ کر بول سکتا ہے، بات فقط ایلا غلی ہوئی ہے، مفہوم اور خیال گی ہوتی ہے۔ یہ معاملہ صرف زبانوں تک محدود نہیں۔ دنیا کی کسی مادی چیز کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ یہ مخفی چیزیں ہوتی ہیں جنہیں کسی بھی مذہب کا کوئی بھی شخص اپنی روایت، اپنی شافت اور اپنی ضرورت کو ملاحظہ کر کر استعمال کر سکتا ہے۔ مثلاً آپ پتلون کو لیجھئے، کوٹ کو دیکھئے۔ یہ دونوں یورپ میں ایجاد ہوئے لیکن سات براعظموں کے 492 مذاہب کے 6 ارب لوگ یہ پہنچتے ہیں، اگر پتلون اور کوٹ کا کوئی مذہب ہوتا تو دوسرے مذہب کے لوگ انہیں کیوں استعمال کرتے؟ میں پتلون اور کوٹ کو "لادین" سمجھتا تھا لیکن جب سرحد اسلامی نے اسے غیر شرعی کہا اور تعلیمی اداروں میں پتلون اور شرکت کے خلاف قرار داد منظور کی تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا، قرار داد میں فرمایا گیا "پتلون، شرکت غلامی کی نشانی اور غیر شرعی لباس ہے لہذا سرحد کے تمام سرکاری، نیم سرکاری اور جنی تعلیمی اداروں میں شلوار قیص کو بطور یونیفارم رائج کیا جائے" اس قرار دار پر اپوزیشن نے واک آؤٹ کیا۔ اے این پی کے پاریمانی لیڈر بشیر احمد بلور نے اس پر بڑا خوبصورت تبصرہ کیا، انہوں نے کہا "اگر پتلون غیر شرعی ہے تو اسلامی میں گلی قائد اعظم کی پیش شرکت والی تصویر بھی اتنا روی جائے۔"

سوال یہ ہے اگر لباسوں کا تعلق مذہب سے ہے تو پھر شلوار اور قیص بھی مسلمانوں کا لباس نہیں، قیص کرتے کی جدید شکل ہے اور کرتا بر صیر کے ہندو لالے پہنا کرتے تھے۔ اس کرتے کو قیص کی شکل بھی ہندو درزیوں نے دی تھی۔ شلوار بھی مسلمانوں کا لباس نہیں، عرب تو تمہند بامدھتے تھے، یہ شلوار تو سکندر اعظم

ہندوستان میں لایا تھا۔ رہی غلامی کی نشانی تو اس وقت پاکستان میں انگریزوں کی چھوڑی ہزاروں نشانیاں ہیں۔ ان نشانیوں میں سب سے بڑی نشانی خود انگریزی زبان ہے۔ اس کے بعد ریلوے ہے، بجلی، ریل یا اور سڑکیں ہیں، چاروں صوبوں میں اسلامیوں کی عمارتیں ہیں۔ آلو، بکھی، تمبا کو اور چائے ہے اور بنا سچی گھنی اور موڑ کاریں ہیں، ہم یہ نشانیاں تو قبول کر رہے ہیں لیکن ہمیں چالون شرت سے غلامی کی بوآتی ہے۔ پورے سرحد میں تمبا کو اور نسوار کے استعمال پر کوئی پابندی نہیں لیکن چالون اور شرت غیر شرعی دکھائی دے رہی ہے۔ یہ عجیب بات نہیں، یہ عجیب اصول نہیں۔ اگر اس اصول کو قانون بنادیا جائے تو پھر ٹیلی ویژن، ریل یا اور کپیوور یعنی میسائی ہوئے، ڈسپرین، پیشیلین، ٹیلی فون، ہوائی جہاز اور آپریشن تھیز یہودی ہوئے۔ موڑ سائیکل، کاریں اور ٹرک بودھ ہوئے اور ریفری ٹریلر اور اسے ہی دہریے ہوئے۔ ان تمام چیزوں کے خلاف بھی تو قرارداد پیش ہوئی چاہیے۔ ان پر بھی تو پابندی لگتی چاہیے، سرحد میں کتنے ہی ہسپتال غلامی کے دور کی نشانی ہیں۔ لیڈی ریلینگ ہائپل کس نے بنایا، ریل یا پشاور کس نے قائم کیا، پشاور کے ریلوے شیشن پر تو عکھے تک انگریزوں کے لگے ہیں اور سرحد اور افغانستان کے درمیان ڈیورنڈ لائن تک انگریزوں کی قائم کردہ ہے آپ غلامی کی یہ ساری نشانیاں برداشت کر رہے ہیں لیکن بچوں کے یونیفارم سے آپ کو غلامی کی بوآتی ہے۔ یہ عجیب بات نہیں۔

بات یونیفارم کی نہیں، بات تعلیم کی ہے۔ سوال یہ ہے کیا صوبہ سرحد کے تمام بچوں کو تعلیم کا حق مل رہا ہے؟ یقیناً نہیں مل رہا۔ اس وقت بھی سرحد کے دیڑھ کوڑھ پچھے تعلیم سے محروم ہیں۔ قرار و اوقتو یہ پیش ہوئی چاہیے تھی "25 اپریل کے بعد صوبہ سرحد کا کوئی پچھے تعلیم سے محروم نہیں ہوگا۔" مل تو یہ منظور ہوتا چاہیے تھا" جس میں کمیٹی کی حدود میں دو پچھے سکول سے مسلسل غیر حاضر ہوئے اس کا نام قانون فارغ" قانون تو یہ بننا چاہیے تھا" جن والدین نے اپنے پچھے سکول داخل نہ کرائے وہ چار سال کے لئے جیل میں بند" یقین کچھے مسئلہ یونیفارم نہیں تعلیم ہے اگر آپ کچھ کرنا چاہتے ہیں تو تعلیم عام کریں۔ علم کو قانون بنائیں۔ یونیفارم میں کیوں الجھر ہے ہیں، برسوں پہلے پاکستان میں سوال اخراج تھا عدالتی کا روائی انگریزی کی بجائے اردو میں ہوئی چاہیے۔ اس پر کسی ستم ظریف نے براخوبصورت تبرہ کیا، اس نے کہا" مسئلہ انگریزی یا اردو نہیں مسئلہ انصاف ہے، انصاف کے لئے آواز اخفاو، عدل کا مطالبہ کرو کیونکہ مدعا کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا جس کس زبان میں فیصلہ لکھ رہا ہے، وکیل انگریزی میں جرج کر رہا ہے یا پھر اردو میں، وہ تو یہ دیکھتا ہے اسے انصاف ملایا نہیں، اس کے ساتھ عدل ہوا یا نہیں" بالکل اسی طرح جو بچھے صحیح الجھ کر رہتے ہوں، جو تے پاش کرنے مڑک اور کاغذ چھنے کے لئے کچھ اگر جا پہنچتا ہے۔ اس کو کیا فرق پڑتا ہے پچھے شلوار قیص پہن کر سکول جاتے ہیں یا پیٹ شرت، خدا کے بندو! پینٹ کی جگہ شلوار اور شرت کی جگہ قیص کا نام انقلاب نہیں، اگر انقلاب ہی لانا چاہتے ہو تو بسا نہیں بلکہ لوگوں کی سوچ بدلو۔ حیله نہیں بلکہ لوگوں کا مقدر تبدیل کرو آخر تم کب تک کر کت کے بلے سے ہا کی کھیلتے رہو گے، کب تک نان ایشوز کو ایشو بناتے رہو گے۔

آئیے سکھوں کی تقلید کریں

ڈاکٹر امیر محمد پاکستان کے نامور رہنی سائنس دان ہیں۔ وہ چند برس پہلے بھارتی پنجاب کے دورے پر گئے تھے جہاں انہیں چندی گڑھ کے سینیٹ گیست ہاؤس میں خبریاں لیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے وہاں عجیب منظر دیکھا۔ انہوں نے دیکھا گیست ہاؤس کے لان میں سبزیاں اور گندم اگی ہے۔ انہوں نے وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا بھارتی پنجاب میں زراعت کے لئے بھلی مفت ہے۔ گیست ہاؤس کا بل بہت آتا تھا لہذا لان میں فصلیں اگادی گئیں جس کے نتیجے میں بھلی فربی ہو گئی۔ چندی گڑھ کی حکومت کا یہ نتیجہ فیصلہ تھیک تھا۔ بھارتی پنجاب میں نہ صرف زرعی بھلی مفت ہے بلکہ ان تمام اداروں، فیکٹریوں اور ملوؤں کو بھلی بھلی میں سبستہ دی جاتی ہے جو کسی نہ کسی حوالے سے زراعت سے وابستہ ہیں مثلاً اگر کسی ورکشاپ میں فریکٹری مرمت ہوتے ہیں یا تحریش کے ہمراہ بنائے جاتے ہیں تو اس ورکشاپ کے مالک ان لوگوں کی بھلی سماں بیچنے میں فراہمی جائے گی۔

بھارت میں ایسا کیوں ہوتا ہے اس کا پس منظر بہت دلچسپ ہے جب 1947ء میں ملک تقسیم ہوا تو بھارت کو خوراک کے لالے پڑ گئے۔ تقسیم سے پہلے پنجاب پورے ہندوستان کو خوراک فراہم کرتا تھا۔ تقسیم کے بعد زرخیز پنجاب پاکستان کے پاس آگیا، اور بھر، ناموار اور بے آباد پنجاب بھارت کو مل گیا۔ چیلنج بڑا تھا بھارتی حکومت نے بھی ہنگامی اقدامات کئے۔ لینڈ ریفارمز کی گئیں، جاگیر داریاں ختم کر کے زمینوں کو چھوٹے چھوٹے فارمز کی شکل دے دی گئی، سرکاری خرچ پر زمین ہموار کی گئیں اور پورے پنجاب میں سرکیں بنائی گئیں۔ 1948ء میں حکومت نے اعلان کیا دیہات کو 76 اور شہروں کو 24 فیصد بھلی دی جائے گی۔ دیہات کے لئے الگ گرینیشین بنائے گئے، ہر آدھ میل بعد ایک نیوب دلی لگایا گیا۔ جہاں نیوب دلی ممکن نہیں تھا وہاں زمین میں ”بور“ کئے گئے، پاپ ڈائل گئے اور سرکوں پر ذیزل پمپ رکھ دیئے گئے لوگ آتے پہنچاتے، اس کا پاپ بور کے منہ پر لگاتے اور اپنا کھیت سیراب کر کے پمپ واپس رکھ آتے۔ دوسرا طرف آپ حکومت کا رو یہ بھی دیکھئے، پنجاب کے 5 چیف مشرکاں بینہ کے اجلاس دیہات میں کرتے تھے، آج بھی جب کٹائی کا موسم آتا ہے تو تمام صوبائی سیکرٹریوں کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے، وہ دیہات میں جائیں۔ کسانوں کے سائل سنیں اور شام کو وزیر اعلیٰ کو دورے کی رپورٹ دیں۔ حکومت نے منڈیوں کو شہروں سے نکال دیا۔ ہر ضلع کونسل میں ایک بڑی منڈی بنا دی جو سیزین میں 24 گھنٹے کھلی رہتی ہے اور کسانوں کو گیکس اور کمیشن سے آزاد

کردیا گیا اس کا نتیجہ یہ تکلا آج ایسٹ پنجاب نہ صرف پورے بھارت کی غذائی ضروریات پوری کر رہا ہے بلکہ بھارت ہر سال دس زریٰ اجناس برآمد کر کے دو سو 36 ارب روپے کما آتے ہیں۔

آپ الیہ ملاحظہ کیجئے بھارتی پنجاب کا رقبہ 50 ہزار 3 سو 62 مربع کلومیٹر ہے جبکہ پاکستان کا پنجاب 12 لاکھ 5 ہزار 3 سو 44 مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے۔ بھارتی پنجاب کا صرف 42 لاکھ 66 ہزار ہیکٹر رقبہ قابل کاشت ہے جبکہ پاکستانی پنجاب کے ایک کروڑ 11 لاکھ 10 ہزار ہیکٹر ایسا پر فصلیں کاشت ہو سکتی ہیں۔ بھارتی پنجاب کے کسان سال میں دو بار 78 لاکھ 71 ہزار ہیکٹر کاشت کرتے ہیں جبکہ پاکستان کے پنجابی سال میں دو مرتبہ ایک کروڑ 59 لاکھ 60 ہزار ہیکٹر بوتے اور کانٹے ہیں۔ بھارتی پنجاب کا 94 فیصد علاقہ سیراب ہوتا ہے جبکہ پاکستانی پنجاب کی 83 فیصد زمینوں تک پانی پہنچتا ہے۔ اب آتے ہیں گندم کی طرف۔ بھارتی پنجاب کے 33 لاکھ ایک ہزار ہیکٹر پر گندم بوئی جاتی ہے جبکہ ہم 59 لاکھ 34 ہزار ہیکٹر پر گندم کاشت کرتے ہیں لیکن جب کنائی کا موسم آتا ہے تو بھارت ایک ہیکٹر سے 4 ہزار 2 سو 80 کلوگرام گندم حاصل کرتا ہے جبکہ ہم صرف 2 ہزار 3 سو 27 کلوگرام گندم انحصار ہے۔ یہ فرق کیوں ہے؟ یہ فرق صرف پانی کی کمی کے باعث ہے۔ بھارتی پنجاب میں 9 لاکھ 25 ہزار ٹیوب دیل ہیں جن کی بھلی بالکل مفت ہے جبکہ پاکستانی پنجاب جو بھارتی پنجاب سے چار گناہ بڑا ہے اس میں صرف 4 لاکھ 35 ہزار 2 سو 28 ٹیوب دیل ہیں۔ رقبے کو مانند کھا جائے تو یہ ایک اور آنکھ کا تاب بنتا ہے پاکستان میں کسان کو بھلی بھی بہت مہنگی ملتی ہے چنانچہ وہ کھیت کو کھل کر پانی نہیں دیتا جس کے نتیجے میں وہ زیادہ رقبہ کاشت کرتا ہے لیکن اسے فصل بھارت سے آدھی ملتی ہے اس میں یقیناً ٹریکٹروں اور کنائی کی مشیوں کی کمی بھی آڑے آتی ہو گی کیونکہ بھارتی پنجاب میں 3 لاکھ 98 ہزار 9 سو 27 ہیکٹر اور 7 ہزار 3 سو کمائن ہارویٹرز ہیں جبکہ پاکستان میں صرف 2 لاکھ 10 ہزار 6 سو 28 ہیکٹر اور 7 سو 62 کمائن ہارویٹرز ہیں لیکن اصل مسئلہ بھلی اور پانی ہی ہے۔ ہم حکومت کے اس اقدام کو سراہتے ہیں جس میں اس نے کسانوں کو بھلی میں 33 فیصد رعایت دینے کا اعلان کیا یقیناً اس سے پنجاب کی زریٰ نسوں میں زندگی کی رو و ور جائے گی، حالات بہتر ہو جائیں گے۔ جناب پرویز الی اور وزیراعظم میر ظفر اللہ جمالی کا یہ اقدام قابل تعریف ہے لیکن اس کے باوجود منزل ابھی دور ہے ابھی کچھ اور اصلاحات اور چند مزید اقدامات کی ضرورت ہے۔ ہم اپنا تقابل امریکہ، برطانیہ، برازیل اور ملائشیا سے نہیں کرتے، ہمیں کرنا بھی نہیں چاہیے کیونکہ ان کے ماحول، زمین اور یمننا لوگی اور ہماری یمننا لوگی، زمین اور ماحول میں بہت فرق ہے لیکن بھارتی پنجاب اور پاکستانی پنجاب میں تو کوئی فرق نہیں۔ یہاں کی زمین، موسم اور جنی کہ زیان تک ایک ہے لہذا بھارت کا پنجابی اگر گلے میں نہ اڑا کر فصل حاصل کر سکتا ہے تو ہم بھی ایسا کر سکتے ہیں، وہ اگر ایک ہیکٹر سے سازھے چار ہزار کلوگرام گندم حاصل کر سکتا ہے تو ہم بھی ایسا کر سکتے ہیں لیکن اس کے لئے ہمیں وہی کچھ کرنا ہو گا جو بھارتی پنجاب کی حکومت نے کیا تھا جو سکھوں نے کیا لہذا آئیے سکھوں کی تقلید کریں۔

دھوتی اور کرتا

بات پھر گندم کے بھر ان پر آ رکتی ہے۔ پنجاب حکومت نے اس سال بھی گندم کی بین الصوبائی نقل و حمل پر پابندی لگادی اور حب معمول و فاقہ وزیر خوارک یار محمد رند نے یہ پابندی اٹھانے کا حکم دے دیا لیکن اس دائی مسئلے کی جزوں پر پرویز الہی نے توجہ دی اور نہ ہی جناب رند نے، ان دونوں نے سوچا تک شیش وہ کیا وجہات ہیں جن کے باعث ایک ایسا زرعی ملک جس کے پاس 80 ملین ہیکٹر قابل کاشت رقبہ اور دنیا کا سب سے بڑا تہری نظام ہے وہ ہر سال غذائی قلت کا کیوں شکار ہو جاتا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا اگر ہم صرف سکھوں کی تقلید کر لیں تو بھی غذا کے بھر ان سے نکل سکتے ہیں لیکن شاید ہماری ایل ایف او میں پھنسی حکومتوں کے پاس ملک، اس ملک کے مستقبل کے بارے میں سوچنے کا وقت ہی نہیں۔

برسول پہلے کی بات ہے بھارت بھی اسی ہی قلت کا شکار تھا لیکن اس نے اپنے روسوبوں پنجاب اور ہریانہ کو زرعی زون قرار دیا اور کاشنکاروں کو مراعات دیئی شروع کر دیں لہذا آج مشرقی پنجاب نہ صرف پورے بھارت کی غذائی ضروریات پوری کر رہا ہے بلکہ بھارت ہر سال اربوں ڈالر کا بیچ اور غلہ بھی برآمد کرتا ہے۔ بھارت نے یہ سب کیسے کیا؟ یہ سوال بہت دلچسپ ہے۔ بھارت نے پنجاب میں زراعت کو تین حصوں میں تقسیم کیا کاشنکاری، مارکینٹنگ اور تحقیق۔ کاشنکاری کے سلسلے میں حکومت نے سب سے پہلے ہیوی مشینزی کے ذریعے پورے پنجاب کو ہموار کیا۔ تمام دیہات اور قصبوں گورنمنٹ کوں کے ذریعے شہروں سے ملایا، پنجاب میں زرعی آلات بنانے والی تیکشیروں کی حوصلہ افزائی کی۔ ٹریکٹر، ڈرل مشینوں اور کٹائی کی مشینزی کے کارخانے لگائے۔ زرعی استعمال کیلئے مفت بجلی دی۔ پنجاب بھر میں شوب و لیوں کا جال بچھایا، زرعی ماہرین کو دروازے دروازے پہنچایا اور شیخ اور کھادستی کر دی، مارکینٹنگ کے سلسلے میں بھی بڑا دلچسپ تحریک کیا گیا۔ پنجاب میں غلہ منڈیوں کو شہر سے نکال کر ضلع کوسل پہنچا دیا گیا۔ ہر چوبیس دیہات کے درمیان ایک غلہ منڈی بنادی گئی۔ اس غلہ منڈی کا سارا فرش پختہ ہوتا ہے۔ اس میں بڑے بڑے شیڈ اور گودام ہوتے ہیں۔ سیزن میں یہاں 24 گھنٹے کام ہوتا ہے۔ راتوں کو یہ قللہ لائیوں کے ذریعے بتعذ نور ہوتی ہے، اگر رات دو بجے بھی کوئی کاشنکار غلہ لے کر منڈی پہنچتا ہے تو اسے وہاں مزدور اور مشی ملتے ہیں۔ ان منڈیوں میں کسانوں اور ڈرائیوروں کے

لئے بڑے بڑے ہال کرے ہیں، کسان مال کی ٹرالی کھڑی کرتے ہیں اور ہال میں پچھی چار پانیوں پر جا کر سو جاتے ہیں۔ مارکیٹ کمپنی کا سکرٹری چینیں گھنٹے اس منڈی میں رہتا ہے جبکہ سکرٹری سٹھ کے اعلیٰ افسروزان منڈیوں کا دورہ کرتے ہیں اور کسانوں کے درمیان رات گزارتے ہیں۔ ان منڈیوں میں کاشتکاروں سے کسی قسم کی کمیشن یا آڑھت وصول نہیں کی جاتی کمیشن صرف خریدار ادا کرتا ہے۔ اتروائی، بھروسائی اور وزن کے نزد بھی مقرر ہیں مثلاً پنجاب کی ایک ہزار منڈیوں میں ترک یا ٹرالی سے ایک بوری اتارنے کا معاوضہ 35 پیسے اور بھروسائی اور وزن کے 50 پیسے وصول کئے جاتے ہیں جبکہ 50 گلوکی خالی بوری (بارداں) ایک روپے ستر پیسے میں ملتی ہے۔ بھارت کا تیسرا رعنی کمال تحقیق تھا۔ حکومت نے 1970ء میں حصار میں چون سگھ ہریانہ ایگری پلجر یونیورسٹی قائم کی۔ اس کا ماڈل فیصل آباد ایگری پلجر یونیورسٹی سے ملتا جلتا تھا۔ حکومت نے یونیورسٹی کو اندر ہا دھن دند فنڈ رفراعہم کئے۔ اس وقت یونیورسٹی کا بجٹ ایک ہزار ملین روپے ہے یہ پاکستانی یونیورسٹی کے مجموعی بجٹ کے برابر ہے۔ اس بجٹ کا 14 اشاریہ 8 فیصد اساتذہ، 120 عام استاد اور 263 درمیانے درجے کے ریسرچ سکالر ہیں۔ اس یونیورسٹی میں 94 پروفیسر 222 ریسرچ کے پروفیسر اور 120 ایسوی ایٹ پروفیسر پڑھانے اور 165 تحقیق پر مامور ہیں۔ یوں کل 1150 اساتذہ ہیں۔ یونیورسٹی نے اب تک 1150 گریجویٹ، 5117 پوسٹ گریجویٹ اور 2500 پی ایچ ڈی پیدا کئے جبکہ ہمارے ملک میں کل اڑھائی ہزار پی ایچ ڈی نہیں ہیں۔

Kashif Azad @ OneUrdu.com

بھارت کی زراعت پرستی اور کسان پروری صرف یہیں تک محدود نہیں وہاں بچ کی قیمت ہر حال میں 40 روپے کلو رہتی ہے پاکستان میں یہ 70 روپے تک چلی جاتی ہے۔ وہاں سو فیصد کاشتکاری ذرل کے ذریعے ہوتی ہے پاکستان میں کسان ہزاروں سال پرانے طریقے یعنی "چھٹے" کے ذریعے بچ بوتے ہیں۔ بھارتی پنجاب میں یوں 125 اکتوبر سے 15 نومبر تک مکمل ہو جاتی ہے جبکہ ہم نومبر، دسمبر اور جنوری تک بچ بوتے رہتے ہیں۔ وہاں کمائن میشینوں کا خرچ 300 روپے فی ایکڑ ہے جبکہ یہاں ہزار روپے ایکڑ ہے۔ بھارت میں حکومت سپورٹ قیمت پر سو فیصد گندم خریدتی ہے جبکہ پاکستان میں کسانوں کو مقدار ہی سے سپورٹ قیمت نصیب ہوتی ہے۔ بھارت میں گندم کو محفوظ رکھنے کا پورا پورا انتظام موجود ہے جبکہ پاکستان میں اگر کسی سال زیادہ گندم پیدا ہو جائے تو وہ باہر پڑی پڑی خراب ہو جاتی ہے۔ یقیناً یہی وہ ترجیحات، یہی وہ اقدامات ہیں جن کے نتیجے میں مشرقی پنجاب ایک بوری ڈی اے پی اور ایک بوری بوریا سے 62 من فی ایکٹر فصل حاصل کر رہا ہے جبکہ ہم دو بوری ڈی اے پی اور 2 بیک بوریا ڈال کر 30 من فی ایکٹر گندم حاصل کرتے ہیں۔ مجھے یہاں مشرقی پنجاب کے ایک چیف فسٹر کے الفاظ یاد آ رہے ہیں اس نے کہا تھا "ایک زرعی صوبے کی حکومت کو شہروں کی بجائے دیہات میں نظر آنا چاہیے تاکہ پر کھیتوں اور کھلیانوں میں دکھائی دینا چاہیے۔" اس کی بات سو فیصد درست ہے واقعی مشرقی پنجاب کی حکومتیں کا بینہ کے اجلas عام دیہات میں

برگد کے درختوں تکے نوئی چار پائیوں پر کرتی ہیں تب کہیں جا کر بھارت کی بھوک اور غذائی قلت دور ہوئی۔ ہم بھی اگر گندم کے بجراں سے لٹکنا چاہتے ہیں پنجاب کو ہر ایکراو دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی کوٹ اور ٹائی اتارنا ہوگی۔ ہمیں بھی دھوئی اور کرتا پہن کر کھیتوں میں اترنا ہوگا۔ گہری کالی راتیں ناکوں پر گزارنا ہوں گیں پھر کہیں جا کر ہم عزت کی روٹی کے قابل ہوں گے۔ دنیا میں تو ہاتھ گندے کے بغیر مرغی نہیں پکڑی جاسکتی لیکن ہم لوگ لاہور اور اسلام آباد میں ایز کنڈی شنڈ کروں میں بیٹھ کر ملک کو سر بز شادا ب رکھنا چاہتے ہیں۔



سرکاری بوڑھے، غیر سرکاری بوڑھے

آپ ایک سرکاری ملازم کی زندگی دیکھئے، وہ میں بائیکس برس کی عمر میں بھرتی ہوتا ہے، اسے دفتر میں کری اور میز میں جاتی ہے، گرمیوں میں پچھا اور سردیوں میں بیٹر کی سہولت ہوتی ہے۔ حکومت اسے سرکاری کوارٹ، فلیٹ یا گھر بھی دیتی ہے، عہدے کے لحاظ سے اسے بچلی، گیس اور ٹیلی فون بھی مفت ملتا ہے۔ وہ ترانسپورٹ کی سرکاری سہولت سے بھی لطف اندوڑ ہوتا ہے۔ اس کے پورے خاندان کو اچھی بری مینہ یکل کی نعمت بھی حاصل ہوتی ہے۔ وہ زندگی کی تیس چالیس بھاریں ان سہولتوں کے ساتھ گزارتا ہے، 60 سال کی عمر میں جب وہ ریٹائر ہوتا ہے تو اس کی پیشش لگ جاتی ہے، وہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو جاتا ہے اور اپنی پیشش لے کر گمراہ ہاتا ہے، حکومت اس سال ریٹائر سرکاری ملازم میں کو 15 نصف اضافے کے ساتھ 60 رب 60 کروڑ روپے پیش دے گی۔ اب یہ سوال بہت تخت ہے مجھے معلوم ہے ہماری جذباتی قوم کے لاکھوں جذباتی لوگوں کی طبیعت پر یہ گراں گزرے گا لیکن اس کے باوجود حقیقت حقیقت ہے۔ سوال یہ ہے ان تمام ریٹائر سرکاری ملازم میں کو یہ معاوضہ کن خدمات کے عوض دیا جاتا ہے؟ انہوں نے عوام کی خدمت کی، لوگوں کے دکھ درد کم کئے یا ملک کو ترقی اور خوشحالی کی شاہراہ پر لے آئے؟ افسوس اس کا جواب لفظی ہے۔ اس ملک کے تمام سرکاری ملازم میں دوران ملازمت حکومتوں اور حکومتی کارندوں کی خدمت کرتے ہیں، ان کی تمام خدمات، ان کی تمام تر صلاحیتوں کا محور ان کے آقا، ان کے ایم این اے، ایم پی اے، ناظم اور وزیر اعظم ہوتے ہیں۔ یہ اپنی پوری زندگی ان لوگوں کے غیر قانونی احکامات کو قانونی شکل دینے، ان کی خواہشات کو قانون اور ضابطہ بنانے اور ان کی اختیارات کی ہوس کو گئے کارس پلانے میں صرف کر دیتے ہیں، رہے عوام تو جو بھی شخص سرکاری محلے کے قلعے میں آگیا وہ کبھی کی طرح جائے میں پھنس کر رہ گیا، اس کی زندگی اجیز ہوتی لہذا سوال یہ ہے ان ملازم میں کی عمر بھر کی سرکاری "خدمات" کا صد عوام کے پیسوں سے دینا انصاف ہے اس عوام کے پیسوں سے جوان کے ظلم، ان کی زیادتی کا چلتا پھرتا اشتہار ہیں جن کی زندگیوں کو ان لوگوں نے عبرت کا نشان بنا رکھا ہے۔

اب آتے ہیں کسانوں کی طرف، مزدوروں کی طرف جو اس ملک کے اصل محسن ہیں، جنہوں نے

حقیقتاً اس ملک کی خدمت کی 14، گروہ 90 لاکھ 3 ہزار کی اس آبادی میں 9 کروڑ 90 لاکھ 12 ہزار لوگ دیہات میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ ہیں جنہوں نے 30 لاکھ ان گندم پیدا کرنے والے ملک کو ایک کروز 92 لاکھ 35 ہزار ان گندم اگانے والا ملک بنایا۔ جنہوں نے 21 فیصد رتبے کو 176 اشاریہ 61 فیصد قابل کاشت رتبے میں بدل دیا۔ اس ملک میں 4 کروڑ 20 لاکھ 75 ہزار مزدور ان کے بچے اور ان کی بیویاں ہیں۔ یہ وہ طاقت ہے جس نے 37 کارخانوں کے ملک کو اڑھائی ہزار فیکٹریوں کا مالک بنایا، اس ملک میں سوتی کپڑے کے صرف 17 کارخانے تھے۔ آج ملک میں 361 کاشن میں ہیں۔ یہ مزدور پسند لڑ پر جموئی طور پر 47 ہزار 7 سو 43 میں اور لوہر پر 28 اشاریہ 6 میں گھنٹے کام کرتے ہیں۔ یہ ہر سال ملک کو 3 ہزار 2 سو 64 میں ٹن چینی اور 8 ہزار 5 سو 18 میں ٹن یہست پیدا کر کے دیتے ہیں۔ وہ تمام ہوتیں جن سے ہماری سرکاری مشینی عرب بھر لطف انداز ہوتی ہے ان کے چیچے انہیں کسانوں اور انہیں مزدوروں کا خون پینے سے لطف ہے، یہ لوگ جموئی طور پر اس ملک کی 98 فیصد آبادی ہیں جبکہ ان کی محنت اور ان کے خون پینے سے لطف اٹھانے والے 80 لاکھ لوگ ہیں جن میں 50 لاکھ سرکاری ملازم ہیں۔ یہ کسان پوری زندگی کھیتوں اور کھلیانوں میں سکتے رہتے ہیں لیکن انہیں صاف پانی ملتا ہے، دوا اور نہ ہی تعلیم۔ یہ لوگ اپنی ساری جوانی بزریوں اور اتنا جگہ کو دیتے ہیں جسے اور بے کار بوجاتے ہیں انہیں اتنا بچکانا ہے اور نہ ہی حکومت۔ یہ لوگ پانچ چھ سال کی عمر میں اس ملک کے آرام طلب شہریوں کی خدمت شروع کرتے ہیں اور خون تھوکنے اور بلغم اگلنے تک میں ہیں گھنٹے کام کرتے رہتے ہیں لیکن انہیں کچھ نہیں ملتا سوال یہ ہے کیا بڑھاپے میں ہمیشہ ان کا حق نہیں اور یہ مزدور لوگ جو بچپن میں اس ملک کا بوجھ سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ ان کا بچپن، ان کا لڑکپن، ان کی جوانی بھینیوں، مشینوں اور کانوں میں گزرتی ہے۔ یہ لوگ جب پیداوار کے بوجھ تملے دب کر معدود رہ جاتے ہیں۔ ان کے بھیپھرے جیلی بن جاتے ہیں، ان کے کندھے جھک جاتے ہیں اور ان کی کرس جواب دے جاتی ہیں تو حکومت، مملکت اور یہ سرکاری نظام انہیں بھی بھول جاتا ہے۔ یہ لوگ نوٹی ہڈیاں اور بدیودار گوشت بن کر رہ جاتے ہیں لیکن حکومت کے پاس ان کے لئے ایک گولی، ایک روٹی اور خیرات کے چند روپے نہیں ہوتے، ایمان سے کہیے کیا یہ لوگ بھی ہمیشہ کے حق دار نہیں ہیں، کیا یہ مزدور، یہ کسان اس ملک کے اصل محسن نہیں ہیں۔

ہم ہمیشہ کے خلاف نہیں ہیں یقیناً یہ بزرگوں اور بوزھوں کا حق ہے لیکن یہ حق تمام بوزھوں اور تمام بزرگوں کو ملتا چاہیے، صرف سرکاری بوزھوں کو ہر سال 37 ارب 60 کروڑ روپے کھلا دینا ظلم ہے، اس ملک میں ہمیشہ نہیں ہونی چاہیے۔ بڑھاپا الاؤنس ہوتا چاہیے، حکومت یہ پالسی بنائے کہ اس ملک کے ہر 66 برس کے بوزھے کو یہ الاؤنس دیا جائے گا، وہ بوزھا سیکریٹری ہو، جنرل نچ، گلرک یا مزدور یا پھر کسان سب کو برابر الاؤنس ملے گا، اس میں کسی کو کسی پروفیشن نہیں ہوگی خدا کے بندوں سے معاشرتی تقسیم کم از کم قدر پر حاکر تو

ختم کر دو، یہ ظلم زندگی کے اختتام پر تو روک دو، اس ملک میں کسی جگہ، کسی مقام پر تو برابری ہو، یہ کیا ملک ہے، کیا نظام ہے جس میں بڑھاپا بھی سرکاری اور غیر سرکاری ہے جس میں بوڑھے بھی دو قسم کے ہیں سرکاری بوڑھے اور غیر سرکاری بوڑھے۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

فراسوچے

اس سلسلے میں آرمی کا ستم سب سے اچھا ہے۔ آرمی اعلان کرتی ہے، پاکستان بھر کے نوجوان اپلاٹی کرتے ہیں، ان کا ذہنی، جسمانی، تعلیمی اور نفیاتی ثمیت ہوتا ہے، ہزاروں میں سے چند سو نوجوان کامیاب ہوتے ہیں۔ ان چند سو کو آئی ایس ایس بی کے کڑے نیشنوں سے گزارہ جاتا ہے۔ اکثریت فیل ہو جاتی ہے اور اقلیت پاس، یہ نوجوان جنہیں فوجی زبان میں کیڈٹ کہا جاتا ہے بلاشبہ پاکستان بھر کی کریم ہوتے ہیں۔ اس کریم کو اس کے بعد کا گول اکیڈمی کی بھی سے گزارہ جاتا ہے، انہیں دنیا کی بہترین تعلیمی، اخلاقی، نفیاتی اور جسمانی تربینگ دی جاتی ہے۔ اس تربینگ میں کامیاب ہونے والوں کو یونیورسٹی میں ڈیوٹی پر نامور کر دیا جاتا ہے، ان آفیسرز کو سیکھ لیٹھنٹ کہتے ہیں۔ آفیسرز کچھ سے بعد امتحان دیتے ہیں اور یہ ہوکر یقینیت ہو جاتے ہیں۔ کورس کرتے ہیں، امتحان دیتے ہیں اور کہن ہو جاتے ہیں، کہن چھ سات سال تک فیلہ ڈیوٹی دیتا ہے، کورس کرتا ہے، پر موشن ثمیت دیتا ہے اور کامیاب ہو کر میجر ہو جاتا ہے۔ یوں پر موشن کا پہلا مرحلہ مکمل ہوتا ہے۔ اس مرحلے پر پہنچ کر اسی فیصد آفیسر ریٹائر ہو جاتے ہیں مثلاً فرض کریں ایک نجی میں سو یکہنڈ لیٹھنٹ بھرتی ہوتے ہیں۔ ان میں سے 80 آفیسرز میجر کے رینک پر ریٹائر ہو جاتے ہیں صرف 20 ایسے خوش نصیب آفیسر ہوتے ہیں جنہیں لیٹھنٹ کریں یا فل کریں بننے کا موقع ملتا ہے۔

میجر کے بعد سلیکشن رینک شروع ہو جاتے ہیں۔ اس سچ کے لئے کوایفاٹی کرنے والے آفیسرز کو پاکستان ناف کالج سے نہایت مشکل اور کڑاوار کورس کرنا پڑتا ہے۔ اس کورس میں صرف کامیابی کافی نہیں بھی جاتی بلکہ اس میں پوزیشن بھی ضروری ہوتی ہے، کورس کے بعد میجر صاحب کو ثمیت دینا پڑتا ہے یہ ثمیت کوایفاٹی کرنے کے لئے ہر آفیسر کو تین یا چار مواقع ملتے ہیں، اگر وہ ثمیت میں بھی بہتر پوزیشن لے لے، اس کا سابق رینک بھی آٹھ سینڈنگ ہو، اس نے کمائٹ کے دوران اپنی صلاحیت کا اونہا بھی منوایا ہوا اور اس کے کردار پر بھی کوئی وحش، کوئی داعش نہ ہو تو وہ لیٹھنٹ کریں پر موٹ ہو جاتا ہے۔ اس دریا کے بعد ایک اور مشکل اور وسیع دریا سامنے آپڑتا ہے۔ پھر کورس، پھر ایٹی شنسی اور پھر اس کے ساتھ ساتھ میڈیکل فلنس۔ چھ سات سال کی انتہائی سخت سروں کے بعد رینکل بورڈز بیٹھتے ہیں، لیٹھنٹ کریں اور فل کریں لزی کا کارکروگی کا جائزہ لیتے

ہیں اور پھر ان میں فیصلہ میں سے بھی جیسے فیصلہ کاریکٹ نصیب ہوتا ہے۔ اب آپ دیکھئے ان سو آفیسرز میں سے صرف چار آفیسر بر گینڈ یئر بنے اور پھر ان چار بر گینڈ یئر زمین سے ایک آدمی ہی ایسا خوش نصیب آفیسر ہو گا جسے مجرم جزل بننا نصیب ہوتا ہے اور رہا لیفٹیننٹ جزل تو اس عہدے پر تو صرف وہی شخص پہنچ پاتا ہے جس نے سروں کے تمیں پہنچتیں برسوں میں ایک ایک لمحے میں اپنی قابلیت، اپنا اخلاص اور اپنی حب الوطنی ثابت کی ہو، فوج سوچ ہی نہیں سکتی کہ کوئی کم الہیت کا آفیسر یا جس کی حب الوطنی مشکل کو ہونوج میں شامل ہو جائے اور پھر ترقی کرتا کرتا کمانڈنگ پوزیشن پر پہنچ جائے۔ جزل چار سال تک جزل رہتا ہے، اس دوران ان اگر اس کی عمر 57 سال ہو جائے یا اپنے چار سال پورے کر لے تو اسے ریٹائر ہونا پڑتا ہے، وہ خواہ کتنا ہی جیتھیں کتنا ہی باکمال آفیسر کیوں نہ ہو، اسے ہر صورت ریٹائر ہونا پڑتا ہے۔ یہ فوج کا قانون بھی ہے اور روایت بھی۔

یہ ہے فوج کا پرمون ستم جس میں صرف اور صرف اہل لوگ آگے بڑھتے ہیں۔ اس جنگل، اس پاپ لائن میں کوئی ایسا جو زندگیں جس سے کوئی سولین اندر داخل ہو سکے، پرمون صرف انہی لوگوں کو ملتی ہے جو اس پاپ لائن کا حصہ ہوتے ہیں۔ دنیا کا بڑے سے بڑا جنگل منصوبہ باز آجائے، کوئی وارنینگ ناوجی میں پی اچ ڈی کر آئے، کوئی شخص ڈھنی، جسمانی، روحانی اور تعلیمی سطح پر خود کو دنیا کی سب سے بڑی فوجی شخصیت ثابت کر دے تو بھی وہ ہذا و لاست جزل بھرتی نہیں ہو سکتا۔ جزل تو رہا وہ دیگر کی بات وہ بر گینڈ یئر، کریل اور مجرم بھرتی نہیں ہو سکتا۔ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟ اس لئے نہیں ہو سکتا کہ ہم بھجتے ہیں آرمی ایک ایسا حساس ادارہ ہے جس کی ایسے شخص کے حوالے نہیں کیا جا سکتا جس نے اس ادارے میں رہ کر صفر سے سو تک ٹریننگ نہ لی ہو، جس کے شب دروز اس ادارے کی آنکھ سے نگز رے ہوں جس کی الہیت، ذمہ داری، حب الوطنی اور اخلاص کے ایک ایک ایک مالکیوں کی مکمل سکریننگ نہ ہوئی ہو۔

فوج کے بر عکس ہمارے سول ستم میں ایک عجیب روایت ہے۔ میاں نواز شریف کو ایک بیکار معین الدین پسند آگئے انہوں نے انہیں 16 لاکھ روپے ماہانہ تنخواہ کی پیشکش کی اور انہیں باہر سے لا کر "سی بی آر" کے چالیس ہزار لوگوں کی فورس پر بٹھا دیا۔ انہیں ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے ریٹائرڈ ہمبدیدی ارنسٹ بیگ پسند آگئے انہوں نے انہیں پانچ چھوٹا کامیک دیا اور پیٹی سی ایل کی سائٹھ ہزار ملاز میں کی کمان ان کے حوالے کر دی۔ نواز شریف کے بعد پرویز مشرف نے عنان اقتدار سنبھالی تو انہوں نے بھی یہ سلسہ جاری رکھا۔ سی بی آر میں بھارتی معاویت پر کسلیٹیس بھرتی کئے گئے۔ این آرمی میں ذمہ دار لاکھ روپے کے پہنچ پر دوسری سروز کے لوگ لئے گئے۔ اب حکومت پیٹی سی ایل کے لئے دس لاکھ روپے ماہانہ تنخواہ پر بیرون ملک سے چیزیں میں درآمد کر رہی ہے، اے ذمہ داری پی، آئی ذمہ داری پی، آر ذمہ داری ایف سی اور ایس پی ایف سی جیسے اداروں کے سربراہان بھی آگے پیچھے دائیں پائیں ہاشم کے جا رہے ہیں۔ مشری آف کا مرس میں "فارنز" آچکے ہیں

جبکہ بخalon میں تو پہلے یہ غیر ملکی نائب صدور کام کر رہے ہیں۔ یہ ایک دوسرا ماذل ہے جس میں کسی بھی پوسٹ پر کسی بھی شخص کو برداشت لگایا جاسکتا ہے، کوئی بھی ادارہ کسی بھی شخص کے حوالے کیا جاسکتا ہے اس کا وہی نتیجہ لکھتا ہے جو نکل رہا ہے۔

ہم ایسا قانون کیوں نہیں بنادیتے جس کے تحت فوج کی طرح پاکستان کے تمام اداروں کے سربراہ انہی اداروں کے آؤٹ شینڈنگ آفیسرز ہوں، فوج کی طرح کسی ادارے میں کسی بھی پوسٹ پر برداشت تقرری نہ ہو سکے، فوج کی طرح تمام اداروں کے شاف کالج ہوں، ہر سکیل پر ترقی کے لئے کورس اور پرموشن نیٹ ہوں کماڈنگ پوزیشنوں کے لئے تمام ادارے اپنے آفیسرز کو شاف کالج میں پروفیشل کورس کرائیں، ملٹری سیکرٹری برائی کی طرح تمام اداروں میں ایک ایسا خفیہ سیل ہو جس میں تمام ملازمین کی کارکردگی کا مکمل ریکارڈ ہو، ہر ادارے میں تیس چالیس برس کی آؤٹ شینڈنگ سروں کے بعد جو تین چار شاندار آفیسرز اور پر آئیں ان میں سے جو بہتر ہوا سے اسی ادارے کی سربراہی سونپ دی جائے، چھ مہینے میں اگر وہ ناکام ہو جائے تو دوسرے کو موقع دیا جائے، وہ ہدف پورانہ کر سکے تو تیسرے کو چانس دیا جائے، تیسرے کے بعد پوچھا آئے اور چوتھے کے بعد پانچواں تاکہ ہر ادارے میں داخل ہونے والا جو نیز آفیسر جانتا ہو جس طرح یقینیت محنت کے بل بوتے پر آرمی چیف کے عہدے تک پہنچ سکتا ہے بالکل اسی طرح وہ بھی واپڈا، پی ایل، پی ایل وی، ای بی فی ای، ای بی ای اور ای ای بی پی کا چیئرمین بن سکتا ہے۔ پاکستان کے تمام اداروں کے تمام ملازمین جانتے ہوں جس طرح ایک جزل 57 سال کی عمر تک پہنچ کر یا چار سال کی جریئی کے بعد ریٹائر ہو جائے گا بالکل اسی طرح ان کے ادارے کا چیئرمین، ڈائریکٹر جزل اور سیکرٹری بھی چار سال کی سربراہی یا سانحہ سال کی عمر میں ریٹائر ہو جائے گا اور دنیا کی کوئی طاقت اس کی مدت ملازمت میں اضافہ نہیں کر سکے گی۔ ذرا سوچئے جس ستم کے ذریعے ہماری فوج دنیا کی کامیاب ترین اور ناقابل تکلف فوج بن چکی ہے وہی ستم ہمارے سول اداروں کا مقدار کیوں نہیں ہدل سکتا۔ جب ہم فوج کی کمائی صرف ایک ایسے قابل فوجی کے ہاتھ میں دیتے ہیں جس نے کیریئر کا آغاز آرمی رکروٹمنٹ منٹری کی امتحان گاہ سے کیا تھا تو ہم سول اداروں کی عنان اقتدار اسی ادارے کے کسی آؤٹ شینڈنگ آفیسر کو کیوں نہیں سونپ سکتے؟



تضادات

شاد جی کا خیال تھا، اس ملک کا سب سے بڑا مسئلہ معیشت ہے جب تک اقتصادیات کا پہیہ صحیح رفتار سے نہیں چلتا۔ یہ ملک نجیک نہیں ہو سکتا ”خدا کی پناہ“ شاد جی نے پہلو انوں کے شاکل میں ران پر ہاتھ مارا۔ ” جس ملک کا گرو تحریث تین اشاریہ چھ فیصد ہو، زراعت کی شرح نمایک اشاریہ چار فیصد ہو، آبادی کی شرح دو اشاریہ آنھ فیصد ہو، جس ملک میں 4 کروڑ 15 لاکھ مزدھوں ہوں، ایک ہزار پانچ سو سو لفڑیوں کے لئے ایک ڈاکٹر، 31 ہزار 5 سو 79 افراد کے لئے ایک ڈاکٹر، تین ہزار 6 سو 39 مریضوں کے لئے ایک نرس اور ایک ہزار 4 سو 90 بیماروں کے لئے ایک بستر ہو۔ آپ اسے پیسے کے بغیر کیسے نجیک کر سکتے ہیں“ شاد جی نے ران پر دوسرا ہاتھ بھی دے مارا۔ ”بھائی صاحبِ معیشت نجیک کریں، افسوس نہیں، گاہیں، تریکھیں چلا کیں، منڈیاں ہنا کیں، کاکے گھنے کیں اور تعلیم بڑھانے کیں پھر کہیں جا کر ملک نجیک ہو گا۔“

مجھے ہمیشہ کر طرح شاد جی سے اختلاف تھا، میرا کہنا تھا اس ملک کا سب سے بڑا مسئلہ ”تضاد“ ہے۔ ہمارے نظام، ہماری کارکردگی اور ہماری کوششوں میں ایک منافقت پائی جاتی ہے۔ یہ منافقت، یہ تضاد ہمارے سفر کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ خدا کی پناہ، ملک کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان لیکن ملک میں اسلام ہے اور شہری جمہوریت۔ ہمارا اسلام آج تک تقریب طلف برداری سے آگئے نہیں گیا ہماری جمہوریت پر ہمیشہ آمریت کا سایہ رہا، ہر حکمران نے قانون اور آئین کی بالادستی کا نعرہ لگایا لیکن ہر حکمران اور ہر حکومت خود کو قانون اور آئین سے بالاتر بمحبتی رہی۔ باہت تیرہ سو کے قریب تو آئین میں تراجمیں ہو چکی ہیں۔ کتنے حکمران کتنے سیاسی اور عسکری رہنماء ہیں جن پر اقتدار کے دوران مقدمے بنے جن پر کیس چلے، جنہیں سزا ہوئی اور جو جیل گئے یہاں تو آپ دس میں ہزار لیڈروں کی تاریخ میں ٹریپک کی خلاف ورزی تلاش نہیں کر سکتے۔ جس دنیا میں آپ اپنا حکمران یا اس کے خاندان کا کوئی فرد دکھا دیں جس پر اقتدار کے دوران مقدمہ ہنا ہو یا وہ تھانے کچھری میں پیش ہوا ہو جبکہ قانون تو رتے ہی یہ لوگ ہیں۔ اتحاد، ایمان اور تنظیم ہمارا ”موٹو“ ہے لیکن اتحاد کا یہ عالم ہے چند کوں کے بعد زبان، ثقافت اور سوچ بدل جاتی ہے ملک میں 32 زبانیں اور 24 علیحدگی

پسند تھیں ہیں۔ پاکستان کے اندر پاکستان کا جمنڈا جلایا جاتا ہے۔ ملک توڑنے کے لئے جلوے ہوتے ہیں، علیحدگی پسند تھیں باقاعدہ ایکشن میں حصہ لیتی ہیں۔ چنابی غدار اور سندھی غاصب کے نفرے لگتے ہیں، ادھر ایمان کی حالت یہ ہے ہم بس اور داچائی کے سامنے لیٹ جاتے ہیں، رہی تنظیم تو ہم آج تک قوم کو قطار بنانے کا طریقہ نہیں سکھا سکے۔ کشمیر، افغانستان، بھارت اور شوالیں پروگرام ہماری سفارشکاری کے چار بڑے اہداف تھے لیکن ہر حکومت نے ان چاروں "ایشور" پر بچپنی حکومتوں سے مختلف موقف اختیار کیا۔"

میر انس پھول گیا، شاہ جی بدستور انہوں پر ہاتھ مارتے رہے۔ میں نے عرض کیا "شاہ جی، اردو ہماری قومی زبان ہے، اس زبان کے لئے ہم نے پاکستان حاصل کیا، بناگالیوں کو ناراض کیا لیکن 54 سال گزرنے کے باوجود ہم اپنی قومی زبان کو قومی زبان کا درجہ نہیں دے سکے۔ آج بھی ہماری ساری دفتری، قانونی اور حکومتی سرگرمیاں انگریزی میں ہوتی ہیں۔ آج بھی اس ملک کے ستر فیصد لوگ اردو نہیں لکھ سکتے 45 فیصد بول نہیں سکے اور 38 فیصد بھجو نہیں سکتے۔ اسلام ہمارا قومی مذہب اور اس ملک کی اساس ہے۔ ہم نے "مسلمان ہندوؤں سے الگ قوم ہیں" کا نفرہ لگا کر پاکستان حاصل کیا لیکن ملک کی 95 فیصد سزا نہیں غیر اسلامی ہیں۔ ہم آج بھی رہ ہماری میثت کے لئے ناگزیر ہے جیسی فضول اور غیر شرعی بحث میں الجھے ہوئے ہیں۔ ہم مسلمان ہیں لیکن پاکستان کو اسلامی ریاست کہتے ہوئے شرماتے ہیں۔ ہم اپنے پاسپورٹ، اپنی سرکاری محتاویات پر اسلامی جمہوری پاکستان لکھتے ہیں لیکن خود کو ہزار لاکھ مسلم اور ملک کو ہزار ان اسلامک میثت کہتے ہیں۔ ہم اسلام پر مغدرت خواہ ہیں۔ ہماری پوری قوم جمہوریت کے بخار میں جلتا ہے۔ ملک میں ایک سو 51 سیاسی جماعتیں ہیں، یہ تمام جمہوری پارٹیاں ہیں لیکن ان میں سے کوئی جماعت جمہوری طریقے سے اقتدار میں آنے کے لئے تیار نہیں۔ ہر جماعت، ہر جمہوری لیدر کسی شعبدے، کسی کرشے اور کسی چھپر پھاڑ خوشخبری کا منتظر ہے۔ قرباً تمام سیاسی جماعتوں میں شخصی یا خاندانی امریت قائم ہے۔ دس دس سال پارٹی کے ایکشن نہیں ہوتے۔ پارٹیاں دوسری پارٹیوں کے لیدروں کو ایکشن لڑنے کا حق دینے کے لئے تیار نہیں۔ فاروق لغاری، مولانا طاہر القادری اور غلام مصطفیٰ جتوئی جیسے جمہوریت کے سرپرست بھی حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں "بینظیر اور نواز شریف کو ایکشن لڑنے کی اجازت نہ دی جائے" اور اب آپ تازہ ترین اطیفہ بھی ملاحظہ کریجئے حکومت اکتوبر 2002ء میں ایکشن کرائے گی، اقتدار غواام کے منتخب نمائندوں سے حوالے کر دیا جائیگا لیکن صدر کے پاس غواام کی منتخب کردہ اس بیلی اور اس اسکلی کے اعتماد سے بننے والی حکومت توڑنے کا اختیار ہو گا اور ہم نہ صرف اس صدارتی اختیار کے ساتھ جنم لینے والی جمہوریت کو جمہوریت کہہ رہے ہیں بلکہ ہماری زیادہ تر جمہوری پارٹیاں اس جمہوریت کو تسلیم کرنے پر بھی آمادہ ہیں۔"

میر انس دھوکنی کی طرح چل رہا تھا، شاہ جی پہلو انہوں جسمی حرکتیں کر رہے ہیں۔ میں نے پانی کا گلاس چڑھایا اور اُشو سے من صاف کر کے "شاہ جی یہ وہ تضادات ہیں جو ہمیں لے بیٹھیں گے، اگر ہم نے بھی

کرنا ہے وزیرِ اعظم اور اسمبلی کی معطلی کا اختیار ایک باور دی شخص کے ہاتھ ہی میں دینا ہے تو پھر اتنی بھی چوری مشق کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایکشن کیوں ضروری ہیں، آپ سائز ہے تین سو لوگ پکڑیں، انہیں اسمبلی میں بھائیں اور اعلان کر دیں یہ عوام کے منتخب نمائندے ہیں۔ ”کہیں سے کوئی الف دین لا گئیں۔ اس سے حلف لیں اور عوام کو حکم دیں“ تا حکم ہانی اسے وزیرِ اعظم سمجھا جائے“ بات ختم، کم از کم ایکشن کے اخراجات تو فتح جائیں گے۔ اگر اسلام اور ماؤرن اسلام دون مختلف چیزیں ہیں تو آپ اس ملک کا نام ماؤرن اسلام ک شیٹ آف پاکستان رکھو دیں۔ کم از کم ہمارے قول فعل کا اتنا دتو ختم ہو جائے گا، اگر ہم نے اگر یزی ہی سے کام چلانا ہے تو آپ اگر یزی کو قومی زبان کا درجہ دے دیں تاکہ اردو اور اگر یزی کے درمیان لٹکنے کا سلسلہ تو بند ہو جائے، اگر جمہوریت وہ ہے جسے آپ جمہوریت سمجھتے ہیں تو پھر آپ مہربانی فرمائ کر پاکستان میں جمہوریت کے لفظ پر پابندی لگا دیں تاکہ عوام کو یہ تو معلوم ہو ساری جماعتیں اقتدار پاریاں ہیں اور اگر ہم نے قانون اور آئین کے ساتھ بھی کرنا ہے تو آپ مہربانی فرمائ کر یہ قانون بنادیں۔ ”آج سے اس ملک کا ہر با اقتدار شخص قانون سے بالاتر ہو گا۔ کم از کم ہم منافقت سے توفیح جائیں۔“

”شاہ جی! آخر شاہ جی ہم کب تک پھرے کے ڈبوں پر گلب کا عرق چیڑکتے رہیں گے، ہم کب تک خرافات کو عبادت گا ہیں کہتے رہیں گے، ہم کب تک چیلوں کو تیتر ٹابت کرتے رہیں گے، ہم کب تک اپنے آپ سے جھوٹ بولتے رہیں، کب تک خود کو دھوکہ دیتے رہیں گے۔“



ابا میلیم

لوگ پوری طرح متوجہ تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا، "کسی پر فاقہ آجائے اور اس نے خلاصی کے لئے اوگوں سے رجوع کیا تو اس کا فاقہ دور نہیں ہوگا اگر وہ فاقہ کشی کے عالم میں اللہ سے رابطہ کرے تو اللہ جلد یا بدیے اس کے لئے رزق فراہم کرے گا۔" ارشاد کے فوراً بعد لوگوں نے بندوں سے سوال ترک کر دیا۔ ایک اور جگہ فرمایا، "سوال کرنے والا برکت سے محروم رہتا ہے اس کی مثال اس شخص کی طرح ہوتی ہے جو کھاتا جاتا ہے، کھاتا جاتا ہے لیکن سیر نہیں ہوتا" ایک اور موقع پر ارشاد ہوا، "جو شخص اپنے اوپر سوال کا دروازہ کھوتا ہے اللہ اس پر احتیاج اور افلان کا باب واکر دیتا ہے۔" ایک اور صحابی ابن عمر روایت کرتے ہیں میں نے حضور پاک ﷺ کو فرماتے ہیں، "بھیک مانگنے والا اللہ سے اس حال میں ملے کہ اس کے چہرے پر خوش نہیں ہوگا" اور کلبازی کا واقعہ تو سب نے پڑھا ہوگا، سنا ہوگا، ایک انصاصی حضور ﷺ کے دربار میں حاضر ہوا اور دست سوال دراز کیا، آپ ﷺ نے پوچھا گھر میں کچھ ہے، عرض کیا، ایک ثاث اور ایک پیالہ، آپ نے دونوں چیزوں مٹگوا ہیں، دو درہم میں نیلام کیں، ایک درہم اسے اہل و اعمال کے کھانے پینے کے لئے دیا اور دوسرے درہم سے کلبازی مٹگوا کر اپنے دست مبارک سے اس میں دستہ خونک دیا اور فرمایا جنگل جاؤ، لکڑیاں کاٹو اور بازار میں لا کر فروخت کر دو، سوائی چلا گیا، پندرہ دن بعد آیا تو اس کے پاس دس درہم تھے آپ ﷺ خوش ہوئے اور اسے چھکی دے کر فرمایا، یہ مشغله اس سے کہیں بہتر ہے کہ تم بھیک مانگتے اور قیامت کے دن تمہارے چہرے پر داغ ہوتے۔

حیات طیبہ کی کتب کھول کر دیکھ لیجئے آپ کو محسوس ہوگا، اسلام صدقات اور خیرات کا اس قدر قابل ہے کہ بعض اوقات محسوس ہوتا ہے صدقہ اور خیرات میں بخل سے کام لینے والوں کا شاید ایمان ہی خام تصور ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ میرے آقا ﷺ نے سوال کرنے، بھیک مانگنے اور دست غرض دراز کرنے سے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا، بھیک اور بھکاریوں کے بارے میں آپ ﷺ کے فرمودات پڑھ کر احساس ہوتا ہے اللہ بھکاریوں کو پسند نہیں کرتا بلکہ ان کے مال سے برکت اڑ جاتی ہے وہ کبھی صاحبان ثروت، کبھی غنی نہیں ہو پاتے، ان کا ہاتھ ہمیشہ خلق خدا کے سامنے دراز رہتا ہے۔ اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا اللہ کے نزدیک

اوپر والا ہاتھ یچے والے ہاتھ سے افضل ہے۔ یہ نبی اکرم ﷺ کی طرف سے امت کو ایک سیدھا، سچا اور واضح پیغام ہے، آپ ﷺ کے دوسرا پیغامات کی طرح یہ پیغام بھی ہمارے ایمان کا حصہ ہے، ہم اس پیغام کی صحت پر ٹک کر کے، اس سے روگردانی، اس سے انعام برہت کر مسلمان رہ سکتے ہیں اور نہ ہی اطمینان قلب پا سکتے ہیں۔ یہ بھی ہمارے ایمان، ہمارے ایقان کا حصہ ہے لیکن اس ایمان، اس ایقان کے باوجود ہماری قوم کو بھکاریوں کی قوم کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا، پوری کی پوری قوم اللہ کے کمزور اور بے ایمان بندوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑی ہے لہذا پھر اطمینان کیسے ہو، برکت اور فتح کیسے حاصل ہو!

آپ دل پر ہاتھ رکھئے اور سوچئے، کیا ہم لا دین طاقتوں کے آگے بھکاری نہیں بن چکے، کیا ہم یورپ، امریکہ اور جاپان سے مالی امداد نہیں مانگتے۔ ہم ان سے قرضوں کی بھیک نہیں مانگتے، کیا ہم لوگ نیکناوجی، تعلیم، ادب، سیاست، معاشرت، میہشت، حکومت غرض ہر شعبہ زندگی میں غیروں کے محتاج نہیں ہو چکے؟ وہ ہمیں چند لمحے، چند لکھوے دے دیں تو ہم سانس لے لیتے ہیں، نہ دیں تو ہم اپنی نفس اپنے ہی کندھوں پر اٹھا کر پھرتے رہتے ہیں۔ ہم لوگ بھکاری ہیں، انصاف کے بھکاری، سانس کے بھکاری، نیکناوجی کے بھکاری اور نظام عدل، نظام میہشت اور نظام تعلیم کے بھکاری، ہمیں تو پولیوکی ویکسین تک بھیک میں ملتی ہے، ہمیں توڑے ویلوش، معین قریشی، فلکٹر قریشی، ذا کٹر یعقوب، شوکت عنزہ بتک بھیک میں ملتے ہیں۔ ہم تو وہ ہیں جو اپنی کمالی سے اپنے مردے تک دفن نہیں کر سکتے، اپنے ٹیکھوں، اپنے ناداروں کو دو وقت کھانا نہیں کھلا سکتے، گرم کپڑے نہیں دے سکتے لہذا پھر خود سوچئے اس قدر بھکاریوں کے لئے اللہ کی برکت، اللہ کی نصرت کیسے آئے گی، ہم اللہ کو تاریخ کر کے دن رات دعائیں کرتے رہیں تو بھی ان دعاؤں میں اثر کہاں سے آئے گا، انہیں قبولیت کہاں سے ملے گی!

معزز خواتین و حضرات چند روز بعد عید ہے اس عید اور اس عید سے چند روز پہلے تک ہم اللہ کی راہ میں صدقات، خیرات اور زکوٰۃ اور فطرانے دیں گے۔ یہ فطرانے، یہ زکوٰۃ، یہ خیرات اور یہ صدقہ دیتے ہوئے آپ ذرا ایک لمحے کے لئے سامنے کھڑے ٹھنڈے، جی ہاں وہ شخص جو آپ کے سامنے کشکوں، جھوپی یا ہاتھ پھیلائے کر کھڑا ہے آپ اس شخص کو غورے دیکھئے اور پھر اپنے آپ پر نظر ڈال کر سوچئے، کیا اس میں اور آپ میں صرف اتنا فرق ہے کہ اس نے پھٹے پرانے، پیوند لگے کپڑے پہن رکھے ہیں اور آپ سوت بوٹ اچکن اور کلف گلی شلوار قیص میں ملبوس ہیں، وہ مانجھے گائے اور سابھے کا مسئلہ ہے اور آپ آئیں ایم ایف، ورلد ہینک، امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، آسٹریلیا اور جاپان کے "مائل" ہیں۔ ہاتھ اس نے بھی پھیلایا رکھا ہے اور جھوپی آپ بھی پھیلاتے ہیں لہذا برکت اس کی زندگی بھی نہیں اور برکت اور اطمینان سے آپ بھی خالی ہیں اللہ کی مدد، اللہ کی نصرت سے وہ بھی محروم ہے اور اللہ کے کرم، اللہ کی عنایت کے دروازے آپ پر بھی بند ہیں۔

یقین فرمائیے جب تک ہم دست دراز تھے کر کے اپنی کلبہ زیوں میں دستے نہیں ٹھوکتے، ہم اسی طرح
ٹھکست خورده ناکام اور ناشاد رہیں گے۔ ہم اسی طرح ابا بیلیوں کے منتظر ہیں گے، ہم اللہ سے اسی طرح مدد
مالکتے رہیں گے لیکن ہمارے لئے آسمانوں سے اللہ کی نصیرت نازل نہیں ہوگی۔ کیوں؟ کیونکہ اللہ ہمکاریوں
کے لئے ہاتھیوں کے شکر بھیجا تا ہے ابا بیلیں نہیں۔



بد دعا میں

ہلاکو خان بخداو پہنچا اور اس کے سپاہیوں نے قتل و غارت شروع کر دی۔ سنگدل مغلوں کو جہاں کوئی سلامت دکھائی دیا انہیوں نے کاٹ دیا۔ جہاں کوئی عمارت نظر آئی جلا دی۔ جہاں کوئی کتب خانہ، لا بسیری اور درس گاہ ملی، آگ لگادی۔ تاریخ کہتی ہے خون کے دبے اور راکھ کے داغ دھوتے دھلتے دجلہ کا پانی سوکھ گیا لیکن مغلوں کی وحشت کے آثار نہ میں۔ اسی قتل و غارت گری کے دوران عراقی صوفیوں کا ایک گروہ مغلوں سپاہیوں کے بھتے چڑھ گیا، سپاہی زہد کے بوجھ تلمے دبے ان بزرگوں کو لے کر ہلاکو خان کے دربار میں حاضر ہو گئے۔ سپاہیوں کا کہنا تھا، یہ لوگ صاحبان دعا ہیں، عراقیوں کے بقول ان کی دعا بارگاہ رب العزت میں قبولیت کی سند رکھتی ہے۔ ہلاکو خان نے نخوت سے پوچھا "چھر کیا؟" سپاہیوں نے جواب دیا "حضور یہ لوگ آپ کو بد دعا میں دے رہے تھے" ہلاکو خان صوفیا کے اس گروہ کی طرف مڑا اور جلالی لمحے میں الزام کی تصدیق چاہی۔ صوفیا کرام میں سے نبیتا بزرگ نے اقرار میں گردن ہلاکر جواب یا "اے بادشاہ تم علیق خدا کے قاتل ہو، تم نے ہزاروں بے گناہوں کا خون بھایا، تم نے اللہ کی مقدس کتابوں کی توہین کی اور تمہارے سپاہیوں کے گھوڑوں نے مسجدوں کا لقنس پامال کیا لہذا اے بادشاہ تم اللہ کے انتقام سے نہیں بچ پاؤ گے، تمہیں اسی زمین پر حساب دینا ہو گا۔" ہلاکو خان اور اسکے حواری کہنے سال بزرگ کی جرأت پر حیران رہ گئے، سپاہیوں نے تکواریں سوتتے ہیں لیکن اس سے قبل کہ تکواریں کام دکھاتیں، ہلاکو خان نے ہاتھ کا اشارہ کیا، ایک بلندو بانگ تھبہ لگایا اور صوفیا کرام کے گروہ سے مخاطب ہو کر بولا "اے نکست خورده قوم کے مظلوم بزرگو! بخداو کی تباہی کے بعد ہلاکو کا حساب ہوا بھی تو کیا ہوا، اب اگر تمہاری بد دعا میں قبول بھی ہو جائیں اور ہلاکو سو بار جنم دے کر سو بار قتل بھی کر دیا جائے تو بھی بخداو آباد نہیں ہو سکتا، گردن سے اترے سرشاروں پر دوبارہ نہیں لگ سکتے، خاک ہوئی عمارتیں اور راکھ ہوئے کتب خانے دوبارہ آباد نہیں ہو سکتے، اب دنیا کا کوئی انتقام دجلہ کے کناروں پر گھاس نہیں اگا سکتا، ہلاکو خان اٹھا، صوفیا کے گروہ کے قریب پہنچا اور ان پر نظریں گاڑھ کر بولا "جاؤ میں تمہیں اس قبرستان میں زندہ رہنے کی سزا دیتا ہوں۔"

ہلاکو خان بخداو سے واپس چلا گیا۔ اب یہ تو معلوم نہیں قدرت نے ہلاکو خان سے واقعی انتقام لیا یا

پھر آسمانی طاقتیں اس سے رعایت برت گئیں لیکن جہاں تک بغداد کی تباہی کا معاملہ ہے آج بھی تاریخ جب اس موز پر پہنچتی ہے تو اپنے بال کھول لیتی ہے اور اس کے منہ سے بین کی آوازیں آنے لگتی ہیں، یہ حقیقت ہے قتل کے بعد قاتل چنانی چڑھے یا عمر بھر کی سزا بھگتے مقتول کو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، پانچ ہزار قاتلوں کی چنانی ایک مقتول، ایک مظلوم کو دو باہ زندہ نہیں کر سکتی لیکن کیا سمجھے خوش بھی بھی بڑی خوبصورت چیز ہے دنیا کے تمام کمزور، بزدل اور مظلوم لو حظین اپنے پیاروں کی نعشیں سیستے ہوئے، مظلوموں اور مقتولوں کو آخوندی غسل دیتے ہوئے یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔ ”آخر کسی نہ کسی روز قاتل نے بھی مر جانا ہے“ الحمد لله موجود میں پورا عالم اسلام اس خوش بھی، لو حظین کی اس سرشاری کا شکار ہے، پوری مسلم امہ کے دانشور امریکہ کی تباہی، امریکہ کی بربادی کی پیشگوئی کر رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے یورپ امریکہ کے خلاف اتحاد کھڑا ہوگا، کسی کا کہنا ہے عراق کی راکھ سے ہزاروں لاکھوں بن لادوں پیدا ہوں گے، کسی کا خیال ہے اب امریکہ کا کوئی شہری چین کی نینڈ نہیں سو سکے گا، کوئی اعلان فرماتا ہے ”ڈی ڈے“ شروع ہو چکا ہے لیکن کوئی ان سے یہ نہیں پوچھتا اگر بغداد کی موت کے بعد ڈی ڈے شروع ہوا، امریکیوں کی نینڈیں حرام ہو گیں، لاکھوں ہزاروں بن لادوں پیدا ہوئے یا یورپ امریکہ کے خلاف اتحاد کھڑا ہوا تو کیا فائدہ ہوگا، عراق تو گیا!

میرے ایک دوست اسی قسم کی مذہبی خوش بھی کا شکار ہیں، وہ کل میرے پاس تشریف لائے، اور آتے ہی فرماتے گے ”مظلوم عراقیوں کی نیشیں کہہ رہی ہیں امریکہ کا انجام قریب ہے، تم اپنے پاس لکھ رکھو امریکہ عنقریب تباہ ہو جائے گا“ میں نے قہقہہ لگایا، اس کا کارچھاڑا اور بڑے پیار سے کہا ”برادرم امریکہ بے شک دس ہزار مرتبہ تباہ ہو گیں ہمارے اوپرگر کے تباہ تو نہ ہو۔“ میرے دوست کو میری بات تاگوار گزری، وہ ناراض ہو کر چلا گیا۔ اسے ناراض ہونا بھی چاہیے تھا، ایک خوش بھم شخص اسی رد عمل کا اظہار کر سکتا تھا، ہو سکتا ہے میرے دوست کی خوش بھی درست ثابت ہو، واقعی کل کا سورج طلوع ہو تو دنیا کے نقطے پر اٹلانٹک اوشن کے پار بد بودار جو ہزوں اور جلی سڑی چٹانوں کے سوا کچھ نہ ہو گیں یہ بھی شخص ”ہو سکتا“ ہے، امکان، ممکن یا خیال ہے۔ آج کی حقیقت تو یہ ہے عراق کی سرزین پر نیشیں بچھے بھی ہیں اور صدام حسین کا عراق ختم ہو چکا ہے۔ اب بیش رہے یا ختم ہو جائے، امریکہ باقی بچے یا تباہ ہو جائے کوئی شخص ان نیشوں، ان جلی سڑی عمارتوں کو دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا، ہلاکو خان نے بغداد ہی کی سرزین پر کھڑے ہو کر کہا تھا ”طاقت اور بد دعاوں کی جگ میں فتح ہمیشہ طاقت کو نصیب ہوتی ہے۔“



ہم انسان کی موت مارے گئے ہوتے

تو نبی بنک برطانوی پارلیمنٹ کے رکن ہیں، انہیں وزیر رہنے کا اعزاز بھی حاصل رہا تھا، تو نبی بنک نے 20 مارچ کو برطانوی پارلیمنٹ میں خنی صدی کی انتہائی دلچسپ قرارداد پیش کی۔ انہوں نے برطانوی اور امریکی فوجیوں سے درخواست کی، بغداد کے وسط میں الزوارہ نام کا ایک چڑیا گھر ہے جس میں بیسوں جاتوں بند ہیں، یہ چڑیا گھر بھی اتحادی فوج کی بمباری سے متاثر ہو رہا ہے اتحادی فوج انسانیت کے نام پر ان جانوروں کا پورا پورا خیال رکھے اور کوشش لرے انہیں کوئی گزندشت پہنچ۔

میں سوچتا ہوں تو نبی بنک کی اس قرارداد کی گونج جب ام قصر پہنچی ہو گی تو چار سالہ عبد اللہ نے اپنے رب سے ضرور درخواست کی ہو گی یا باری تعالیٰ تم نے مجھے بیش کے درمیں انسان کی بجائے بیتلر بنایا ہوتا تو میں آج نام ہاک کروز میرائل کا شکار نہ بنتا۔ تو نبی بنک کی درخواست جب الفاؤ کے مورچے میں پڑی نعشوں تک پہنچی ہو گی جن کے ہاتھوں میں مرنے کے بعد بھی سفید پر چم تھا تو انہوں نے اپنے رب سے ضرور کہا ہو گا یا پروردگار تم نے ہمیں بن مانس ہی بنادیا ہوتا، ہم مورچوں کے بجائے الزوارہ میں ہوتے تو آج یوں بے گور و کفن نہ پڑے ہوئے۔ تو نبی بنک کی اپنی جب الیر موک کے ہسپتال میں پڑے اس پنجے کے کافوں تک پہنچی ہو گی، آنسو جس کے گالوں سے آبشار کی طرح بہرہ بہے تھے اور جنہیں جس کے طق سے آتش فشاں کی طرح پھٹ رہی تھیں تو اس پنجے نے بھی اپنے رب سے ضرور کہا ہو گا، اے مجھے پیدا کرنے والے تم نے مجھے ریچھ کیوں نہیں بنادیا تھا، میں اگر ریچھ ہوتا تو آج میں بھی کسی محفوظ مقام پر شہد چاٹ رہا ہوتا، آج مجھے نرم بستر اور دوائیں مل رہی ہوتیں، تو نبی بنک کی یہ قرارداد جب الفریہ پہنچی ہو گی تو ان پیچاس جلی کنی دھواں دیتی نعشوں نے جو آسمان سے اترتی ان دیکھی موت کا نشانہ بن گئیں اور بے گناہی اور مظلومیت جن کا جرم تھی ان نعشوں نے بھی قہار اور جبار سے ضرور کہا ہو گا ”رب ہمارے رب تم نے ہمیں زیرے اور زرافے ہی بنایا ہوتا، تم نے ہمیں الفریہ کی بجائے الزوارہ ہی میں پیدا کیا ہوتا تو آج ہم بھی ہموں سے نجٹے ہوتے۔ دنیا میں آج لوگوں کے دلوں میں ہمارے لئے بھی ہمدردی ہوتی، کاش اے ہمارے پروردگار ہم انسان نہ ہوتے جانور ہوتے، اہل زبان نہ ہوتے، بے زبان ہوتے۔

نولی بک کی یہ قرارداد، یہ درخواست اور یہ اپل جب عراق کے ان بے گناہ اور مخصوص شہریوں تک پہنچی ہو گی جن پر چار روز میں دو ہزار ایک سو کروز میزائل پھیکے گئے، جن پر بھیرہ احر میں موجود پانچ طیارہ بردار جہازوں سے لی 52، ایف 15، ایف 16، ایف 18 اور تھنڈر بولٹ طیاروں نے ایک ہزار حملے کئے، جو بصرہ، موصل، کرک اور بغداد کے شدید حملوں میں شہید ہو گئے، جن کے گھروں سے میں بیس منزلہ شعلے انہر ہے ہیں۔ جن پر دو، دو ہزار پونٹ بم گرانے گئے، جن کی نشیں دیکھ کر 39 سال و نگ کا نذر نے کہا "میں جب بغداد پہنچتا تو مجھے دل کی حرکت رکتی ہوئی محسوس ہوئی، شہر آگ کے سرخ گولے کی مانند تھا، میں نے زندگی میں ایسی تباہی نہیں دیکھی اور جن کے آگے چیچھے پندرہ سو مارتوں سے شعلے اور دھواں انہر رہا ہے، ان سب لوگوں نے اللہ سے گڑگڑا کراپل کی ہو گئی" یا پاری تعالیٰ ہمیں بھیز بکریاں، بلیاں اور خرگوش بنایا ہوتا، تم نے ہمیں کبوتر، مور اور طوطے ہی بنایا ہوتا۔ کاش ہم انسان کی بجائے چیتے، شیر، ہاتھی اور چمپیزی ہوتے، کاش ہم بندر ہوتے، کاش ہم کینگرہ ہوتے، کاش ہم اڑیاں اور نیل گائے ہوتے تو آج ہم انسان سے برستی موت سے فج گئے ہوتے۔ پورے بغداد پر بم برستے، ساری عمارتیں، ساری سڑکیں اور سارے بازار تباہ ہو جاتے۔ ہر زندہ گھر اور ہر آباد مکان جل کر راکھ ہو جاتا، ہمندوں میں خاک اڑتی اور دریا سیاہ پیچڑ کے جو ہر ہن جاتے، اگر کوئی چیز، اگر کوئی علامت سلامت رہتی۔ اگر کسی جگہ زندگی کے آثار پاتی ہوتے تو وہ الزوارہ ہوتا، وہ چیز یا لمحہ ہوتا، وہ ہمارا گھر، ہمارے پیغمبر ہوتے۔ کاش اے پورا گارتم نے بیش کے عہد میں ہمیں جانور بنایا ہوتا۔"

آپ انسانی حقوق کے اس دور کی انتہا دیکھتے، وہ پارلیment جو نونی بلیز کی جنگی تعاون سے متعلق ایک قرارداد وصول کرنے کے لئے تیار نہیں، وہ پارلیment نہ صرف نولی بک کی قرارداد قبول کرتی ہے بلکہ اس پر سمجھدگی سے غور کا وعدہ بھی فرماتی ہے، واہ، بھی واہ، کتوں اور بابیوں کے اس دور میں انسانی خون کی ارزانی اور حیوانیت کی گرانی ملاحظہ کر جائے۔ کل رات گلی میں ایک کتے نے بھونک کر دوسرے کتے سے کہا "آؤ تم اور میں کتا ہونے کا جشن منا میں کیونکہ اگر آج ہم انسان ہوتے تو بغداد کی کسی اندھی گلی میں انسان کی موت مارے گئے ہوتے۔"



یا اللہ معافی

دونوں منظر میری آنکھوں میں مخدود ہو چکے ہیں، ایک منظر میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور دوسرا ہمایوں اختر کی نگاہوں سے لیکن یہ مناظر ہمایوں صاحب کی نگاہوں سے دیکھے جائیں یا اپنی آنکھوں سے دونوں ناقابل فراموش ہیں، کیسی بلندی تھی اور اب کیا پستی ہے، کیا خوش بختی تھی اور اب کیسی بد نصیبی ہے۔

بڑے سال گزرے، یہاں ایف سیون میں ہمارے ایک بزرگ دوست ہوتے تھے۔ یہ بزرگ ہمیڈ پیٹنک ڈاکٹر تھے۔ لوگ انہیں ڈاکٹر اشراق کے نام سے پکارتے تھے، ڈاکٹر صاحب حقیقتاً ایک ایسے انسان تھے جو اپنے قرب و جوار پر اثر چھوڑتے ہیں۔ میرے جیسے سینکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگ ہوں گے جنہوں نے ڈاکٹر اشراق سے فیض حاصل کیا۔ جنہیں ڈاکٹر اشراق کی شخصیت میں چھپا یارس سونا بنا گیا۔ میں ڈاکٹر صاحب کا مستقل ملاقاتی تھا، روز شام کو دفتر سے فارغ ہو کر ڈاکٹر صاحب کے پاس حاضر ہو جاتا اور پھر جب تک تھک نہ جاتا ڈاکٹر صاحب سے گفتگو جاری رہتی۔ ایک دن میں ڈاکٹر صاحب کے گھر گیا تو مجھے وہاں وسیع پیلانے پر تبدیلی نظر آئی۔ گلی اس قدر صاف ستری تھی کہ وہاں تک تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سڑک پر دونوں طرف پولیس کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ گیٹ پر سفید یونیفارم میں دونہماہیت خوبصورت، تنومند اور وجہہ جوان کھڑے تھے، انہوں نے میرا نام پوچھا، تلاشی لی، فہرست میں نام پڑھا اور جھک کر گیٹ کھول دیا۔ میں اندر واپس ہوا تو وہاں بھی ما جعل بدلا بدلا ساتھا۔ ڈرائیک روم روشنیوں سے جگما رہا تھا، کچن میں باور دی یہرے کھڑے تھے اور میں دروازے سے ڈاکٹر صاحب کی لشت گاہ تک سرخ کارپٹ بچھا تھا، میں نے حیران ہو کر ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھا۔ انہوں نے قبیلہ لگایا اور اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر بولے یہ سب کچھ عارضی ہے ابھی ایک آدھ گھنٹے میں یہ لوگ اپنے بلب اتار کر لے جائیں گے۔ میں نے اس حیران کن تبدیلی کی وجہ پوچھی تو معلوم ہوا پاکستان نیوی کے سربراہ ڈاکٹر صاحب سے ملنے آرہے ہیں۔ نیوں چیف کی کمر میں درود تھا، کسی نے ڈاکٹر صاحب کا ذکر کیا تو انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو یاد کر لیا۔ ڈاکٹر صاحب مریض کو دیکھنے کے لئے اس کے گھر نہیں جاتے تھے لہذا مجبوراً نیوں چیف کو ان کے غریب خانے پر آنا پڑا جس کا یہ نتیجہ نکلا صبح ہی سے ڈاکٹر صاحب کے گھر اور گلی کو نیوں پولیس نے گھرے میں لے رکھا تھا، ابھی چند ہی لمحے گزے تھے۔

زیر و پر ایک 2
سامنے ٹریک رکی، بڑک صاف ہوئی، ہونروں کی آواز آئی، موڑ سائکل سواروں کا چاق و چوبند دست آیا، رکا، جوانوں نے گرد نیس جھکائیں، گازیوں کا سکواڈ تھرا، دو جوان آگے بڑھے، ایک نہایت خوبصورت اور آرام دہ گازی کا دروازہ کھولا، سفید براق وردی میں ملبوس ایک باوقار شخص نیچے اترा۔ اس نے گردن کے ہیف سے اشارے سے سلیوں کا جواب دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے گھر میں داخل ہو گیا اور باہر جی ہاں گیٹ، دو تین ہمسایوں کے گیٹ اور گلی کے دلوں سروں کو کمانڈوز نے اپنی حفاظت میں لے لیا۔

یہ ایک منظر ہے دوسرا منظر بھائی ہمایوں اختر نے آئٹن کی عدالت میں دیکھا۔ یہ اپریل 2001ء کی ایک سو گوار بیج ہے۔ امریکی مجریت خیف کپل کی عدالت میں ایک ملزم کھڑا ہے، ملزم کے ہاتھوں میں ہتھڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ہیں، اس نے جیل کا سبز یونیفارم پہن رکھا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں مالٹا رنگ کے سلپر ہیں۔ اس نے آنسو چھپانے کے لئے کالا چشم لگا رکھا ہے۔ وہ کبھی خلا میں گھورتا ہے اور کبھی کرہ عدالت میں نظر س دوزاتا ہے۔ عدالت میں اس کی اہلیہ، دو بیٹیاں اور دادا کھڑے ہیں۔ کیلوں کی بحث شروع ہوتی ہے۔ ملزم کا وکیل ملزم کی بیٹی سمیع کی درخواست پڑھ کر سناتا ہے "میرے والدین بار ہیں، یہ انتہائی مایوسی، ڈیپریشن اور نا امیدی کا شکار ہیں۔ دو دو دن تک خاموش رہے ہیں، خالی خالی آنکھوں سے دیواروں کو گھوڑتے رہتے ہیں۔ سوال کریں تو جواب نہیں دیتے، دل کے بھی مریض ہیں، بلکہ پریشر بھی ہے لہذا انہیں جیل کی بجائے فیملی کے سامنے ٹھہرنا ہی اجازت دی جائے۔ ہم شمات دیتے ہیں یہ امریکہ چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔" بیان نکل ہوتے ہی فیڈرل پر ایکیو ٹرروں سیورٹ آگے بڑھتا ہے اور عدالت کو مجاہد کر کے کہتا ہے "می لا رڈ ملزم ایک کرپٹ شخص ہے، اس نے پاکستان میں اربوں روپے کی بد عنانیاں کیں۔ ہم نے اسے حکومت پاکستان کی درخواست پر گرفتار کیا، اس کا کیس عدالت میں ہے، ہمیں خطرہ ہے اگر اسے شمات پر رہا کیا گیا تو یہ امریکہ سے فرار ہو جائے گا کیونکہ اس کے پاس میے بھی ہیں اور وسائل بھی۔" مج دلیل سن کر ملزم کی درخواست مسترد کر دیتا ہے۔ پولیس الکار ملزم کی ہتھڑی کو جھکانا دیتے ہیں اور ملزم چپ چاپ ان کے ساتھ چل پڑتا ہے، جب وہ اپنی فیملی کے قریب پہنچتا ہے تو اس کی چھوٹی بیٹی ہما ہاتھ ہلاکی ہے لیکن وہ اس کا نوش لئے بغیر جیل کی گاڑی میں سوار ہو جاتا ہے۔ گازی روانہ ہوتی ہے، اس کے عزیز واقار بھی گازیوں میں سوار ہوتے ہیں اور اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ اس سارے منظر میں جیران کن بات ملزم کے اقارب کا "صر" ہے جب تک ملزم عدالت میں کھڑا رہا، جب مج نے فیصلہ سنایا اور جب ملزم جیل کی طرف روانہ ہوا تو ملزم کے کسی عزیز کے منہ سے سکی نکلی اور نہ ہی کسی کی آنکھ تر ہوئی۔ وہ سب یوں چپ چاپ یہ کھیل دیکھ رہے تھے جیسے وہ تمام لوگ اس کا حصہ نہ ہوں جیسے یہ سب کچھ ان کے ساتھ نہیں بلکہ کسی دوسرے کے ساتھ ہو رہا ہو۔

جی ہاں ان دلوں منظروں کے مرکزی گردار ایڈر مل منصور الحق ہیں۔ پاک بھریے کے سابق چیف

جن کے لئے کبھی سریک رک جاتی تھی۔ ہزاروں لوگ جن کا انحصار استقبال کرتے تھے اور جو کبھی عزت اور توقیر کی اس چومنی پر حضنکن تھے جسے صرف حضرت سے دیکھنا جاسکتا ہے، چھوٹنیں جاسکتا تھاں آج وہی منصور الحق آئشی کی ایک جیل میں پڑے ہیں جس میں گازیوں کے دیل کپ چرانے، خواتین کی عصمت پر حمل کرنے اور نمایاں بیچنے والے چھوٹے چھوٹے مجرم قید کے جاتے ہیں، ان کا زیادہ تر وقت ڈاکٹروں کی ٹھیکانی میں گزرتا ہے جو انہیں خود کشی سے باز رکھنے میں مصروف ہیں۔ یہ ہے مکافاتِ عمل، یہ ہے قدرت کا انتقام اور یہ ہے سوچنے کے بعد والوں کے لئے اللہ کی نشانی۔

انسان دولت، آرام، سکول اور عزت کیلئے کاماتا ہے، لخت ہے اس دولت پر جو نیول چیف کو عدالت میں لاکھڑا کرے، جسے ہضم کرنے کیلئے انسان کو ڈاکٹروں کی ضرورت پڑے اور ہے کمانے کے بعد انسان کی اپنی اولاد بیگانی ہو جائے، تھیز کے تماشیوں کی طرح آئے اور کھیل ختم ہونے کے بعد چپ چاپ گھروٹ جائے اور نشانیوں میں نشانی یہ بھی ہے اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کو زمین پر بے عزت کرنے کے لئے عزت دیتا ہے۔ فقیر ہانے کے لئے دولت دیتا ہے اور جلاوطن کرنے کے لئے اقتدار دیتا ہے۔ اس وقت پاکستان میں منصور الحق کے چودہ طاہری اور چالیس پچاس خفیہ پلاٹ ہیں۔ دنیا کے مہنگے ترین علاقے ویس آئشی میں اس نے جو گھر خریدا اس نے اس کا صرف پیعادہ (اصل قیمت کا دس نیصد) 4 لاکھ 80 ہزار ڈالر دیا، اس وقت بربطاں، بوسز لینڈ اور امریکہ کے ملکوں میں منصور الحق کے گرد ڈالوں والوں پڑے ہیں۔ یہ وہ دولت ہے جو اس نے پاکستان کی روگوں سے نجوزتی تھیں ایسے دیکھنے آج اس منصور الحق کی راتیں کہاں گزر رہی ہیں آئشی جیل کے ایک مستطیل کرے میں، چھ بائی دو فٹ کی ایک دھاتی چارپائی پر، اخلاقی جرم میں ماخوذ ان پڑھ گنوار مجرموں کے درمیان اور وہ کیا پہن رہا ہے جیل کا نیلا مائل بزری بس اور وہ کیا کھا رہا ہے جیل کا بذائقہ کھانا اور وہ یہ کھانا کیسے لیتا ہے۔ ہاتھ میں پلیٹ پکڑ کر، مجرموں کی قطار میں کھڑے ہو کر، توبہ، توبہ، لاکھ بار توبہ، یا اللہ معافی۔

دیو جانی کلبی نے کہا تھا انسان مطمئن رہنا چاہے تو وہ منی کے وہ میں رہ کر بھی زندگی گزار سکتا ہے لیکن اگر وہ حریص ہو جائے تو ساری دنیا سست کر اس کی پلیٹ میں آجائے تو وہ بھی اسے کم گلتی ہے۔



منصور الحق کو واپس بھیج دیں

وہ ایک چھوٹا سا مستطیل کمرہ تھا اور کمرے میں چھ بائی دوفٹ کی دھاتی چارپائی تھی، جب وہ کروٹ بدلتے تھے تو یوں محسوس ہوتا تھا سپر گلوں کی جنہیں چارپائی سے نہیں کہیں ان کے اندر سے آ رہی ہیں۔ کمود بھی اندر ہتھا جب فطرت کی مجبوریاں انہیں کمود تک لاتیں تو وہ دروازے کے شیشے سے ہرگز رنے والے کو پورے کے پورے نظر آتے تھے۔ اس نازک صورتحال میں ان کی پوری کوشش ہوتی تھی وہ باہر دروازے کی طرف دیکھیں ہی نا۔ ساتھ ہی پانی کی نوٹی گلی تھی جب انہیں پیاس لگتی، وہ نوٹی کا لیور دباتے پانی کی ایک دھار جھبت کی طرف اٹھتی اور وہ دھار پر اپنا منہ رکھ دیتے، کمرہ چھوٹا بھی بہت تھا وہ چارپائی پر لینے لینے ناگہی کرتے تو ان کے پاؤں سامنے دیوار سے جاگراتے۔ کچھ بھی صورتحال سرباٹے والی دیوار کی تھی وہ پورے پورے انگڑائی لینے لئے بانڈوں پھیلاتے تو بیداران گے ہاتھ روک لیتی۔ وہ لیٹ لیٹ کر تھک جاتے تو انہوں کرنٹے لگتے لیکن جملتے بھی کہاں چار قدم بعد تو دیوار آ جاتی تھی، ایسے حالات میں ان کی واحد تفریغ کمرے کا دروازے تھا جس کے درمیان میں آر پار دیکھنے والا شیشہ جڑا تھا۔ شیشہ بنیادی طور پر نگرانوں کے لئے تھا۔ یہ کمرے دراصل خاص مجرموں کے لئے بنے تھے، ایسے مجرم جنہیں جنون ہو جو کسی کو نقصان پہنچا سکتے ہوں، جنہیں کوئی متعددی مرض لاحق ہو یا پھر وہ قیدی جن کا ڈھنی توازن درست نہ ہو اور ڈاکٹروں نے انہیں خطرناک قرار دے دیا ہو انہیں ان کروں میں رکھا جاتا تھا تاکہ جیل کا عملہ ہر پانچ دس منٹ بعد شیشے سے اندر جماں کر قیدی کی حرکات کا جائزہ لے سکے۔ وہ بھی ایسے ہی کمرے میں تھے، کیوں تھے؟ اس کی ایک وجہ تھی، ان کے خاندان نے عدالت میں درخواست دے رکھی تھی ”ان کے قیدی کی ڈھنی اور جذبائی حالت درست نہیں۔ انہیں خطرہ ہے کہیں وہ خود کو نقصان نہ پہنچا لے۔“ درخواست کے بعد جیل حکام نے انہیں خصوصی کمرے میں منتقل کر دیا، ہاں تو میں بتا رہا تھا ان کی واحد تفریحی کمرے کا دروازہ تھا۔ وہ دروازے کے سامنے بینچے کر گزرنے والوں کو گھنٹوں دیکھتے رہتے تھے جب تھک جاتے تھے تو دوبارہ لیٹ جاتے تھے۔

یہ ہمارے منصور الحق تھے پاکستان کے سابق نول چیف اور یہ کمرہ امریکہ کی سب سے بڑی ریاست نیکس کے دارالحکومت آئین کی ایک معمولی جیل میں تھا۔ منصور الحق کو آئین حکام نے پاکستان کی

درخواست پر گرفتار کیا تھا۔ ان پر الزام تھا انہوں نے نیول چیف کی حیثیت سے اربوں روپے کے سچلے کئے۔ حکومت نے ان کے خلاف تحقیقات شروع کی تو وہ فرار ہو کر امریکہ آگئے جہاں وہ کریمین کے پیسے سے عیش کر رہے ہیں۔ گرفتاری کے بعد آشن کے قوانین کے مطابق ضروری کارروائی ہوئی اور پھر بچ کے حکم سے انہیں نیل بیچج دیا گیا جہاں شروع شروع میں وہ میکسکو کے چوروں، نشیات فروشوں اور تکمین جرام میں مانوذ مجرموں کے درمیان رہے پھر ان کے وکیل کی درخواست پر انہیں "خصوصی کرے" میں منتقل کر دیا گیا اور ہاں میں آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گیا ہمارے سابق نیول چیف وہاں قیدیوں کے لئے مخصوص بیزی مائل نیلا بیاس زیب تن کیا کرتے تھے اور ان کے پاؤں میں مالٹے رنگ کے سلپر ہوتے تھے۔ ناشتے، لیچ اور ڈنر کے وقت انہیں خصوصی نگرانی میں نیل کے ڈانگ روم میں لا یا چاتا تھا جہاں وہ اپنی پلیٹ ہاتھ میں اٹھا کر قطار میں کھڑے ہوتے تھے اپنی باری پر کھاتا لیتے تھے، کھانے کے بعد اپنی پلیٹ خود ہوتے تھے اور چپ چاپ واپس آ جاتے تھے۔ ٹیشی کے وقت انہیں عدالت لے جایا چاتا تھا تو ان کے ہاتھوں میں ہٹکڑی اور پاؤں میں بیڑیاں ہوتی تھیں۔ ملاقات کے وقت جب یہ گم صاحب نیل آتی تھیں تو وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ جاتے تھے درمیان میں شنیے کی مضبوط دیوار ہوتی تھی وہ دونوں جو گفتگو کرتے تھیں فون کے ذریعے کرتے تھے جو ساتھ ساتھ ریکارڈ ہوتی رہتی تھی، یہ وہ حالات، یہ وہ صورت حال تھی جس سے مجبور ہو کر ہمارے سابق نیول چیف نے ٹکٹ تسلیم کر دیا، انہوں نے کرپلٹ کی حادثی کھال نیب کے خواست کرنے کی حادثی بھرپولی، خودو پاکستان کی تحویل میں دینے کی درخواست دے دی۔

منصور الحق کی درخواست منظور ہو گئی، زیب کے حکام آشن پہنچے، نیل حکام نے ان کا مجرم ان کے حوالے کر دیا، جو نبی ہمارے سابق نیول چیف پاکستان کے "حلقے" میں داخل ہوئے ان کی زندگی کا دھماکا ہی بدلتا گیا۔ نیل کا بیاس اتر گیا، انہیں خوبصورت اور قیمتی سوت پہننا دیا گیا، انہیں آرام دہ گاڑی میں ایک پورٹ اور وہاں سے جہاز کے فرست کلاس نیک پر پاکستان لایا گیا جب وہ راولپنڈی پہنچے تو انہیں کسی سیف ہاؤس، انڑو گلیشن سنتر، حوالات یا نیل میں رکھنے کی بجائے سہالہ ریسٹ ہاؤس میں خبردا یا گیا۔ انہیں وہاں نہایت ہی آراستہ پیر است آرام دہ بیڈ روم دیا گیا۔ ایک کنڈہ شنز لگ گیا۔ فرتع آ گیا، اُنی وہی آن ہو گیا اور اخبارات پہنچنا شروع ہو گئے۔ ہمارے سابق نیول چیف نوے روز تک اس ریسٹ ہاؤس میں رہے اور اس شان سے رہے کہ خانہ میں ان سے پوچھ کر ان کے لئے لیچ اور ڈنر تیار کر رہا تھا، انہیں ان کی مرضی کے ڈاکٹر اور دوامیں دی گئیں، انہوں نے جب چاہا انہیں واگ کرنے کا موقع ملا، انہیں ہر شخص، ہر آفسر نے سر کہہ کر مخالف کیا۔ آفیش اور تحقیقات کے لئے آنے والے افسروں کو بھی انہوں نے اجازت دی تو انہوں نے ان کے سامنے پہنچنے کے جہارت کی ورز وہ کھڑے ہو کر سوال پوچھتے رہے۔ رات کو اگر انہیں پانی کی ضرورت پڑی یا انہوں نے اسی کا درجہ حرارت تبدیل کرنا چاہا تو انہیں بستر سے الحناہ پڑا انہوں نے بس نیل دی اور نو کر آ کر ان کا

زیر و پاہتے ہیں
تکیہ اور چادر تک درست کر گیا۔

20 اگست کو منصور الحق کا جسمانی ریمانڈ پورا ہو گیا، انہیں احتساب کورٹ میں پیش کیا گیا۔ مجھ نے اُنکے عدالتی ریمانڈ پر جیل بھجوائے کا قلم جاری کر دیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا شاید اب ہمارے سابق نیول چیف کے ساتھ وہی سلوک شروع ہو جائے جو حقیقتاً مجرموں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے لیکن ہمارے سابق نیول چیف کی خوش قسمتی دیکھئے یعنی مجھ کے حکم کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ احتساب یورو کے چیزیں میں نے اسی سہالہ ریسٹ ہاؤس کو "سب جیل" تراوے دیا۔ ہمارے سابق نیول چیف عدالت سے لٹکے اور جیل کے نام پر سیدھے ریسٹ ہاؤس جا پہنچے اور آج چوتھا دن ہے ہمارا مجرم، ہمارا قیدی، ہمارے ملک کی تاریخ کا ب سے بڑا "واہیت کا لکر میں"؛ انہیں جیل پر نجخ کر رہا ہے، واک کر رہا ہے، سوت پکن رہا ہے اور بیگم صاحب سے "بالشفاف" ملاقات کر رہا ہے۔ یہ ہے ہمارا انصاف اور یہ ہے ہمارا معیارِ عدل!

خدا کے لئے منصور الحق کو داپس امریکہ کے حوالے کر دیں۔ انہیں دو باہ آئندن جیل بھجوادیں وہاں وہ کم از کم قیدی کی زندگی تو گزار رہے تھے وہاں انہیں اپنے جرم کی کچھ نہ کچھ تو سزا مل رہی تھی۔ جی ہاں انہیں بھیج دیا تاکہ کم از کم ان کی پنک تو ختم ہو۔

ٹھنڈے پانی کے دو گلاں

برخدا اور رعناء صدام حسین کی بیٹیاں ہیں۔ چار ماہ پہلے تک دونوں کے پاس تین مگل تھے۔ برخدا کے مگل میں 52 ملاز میں اور 12 گاؤں میں تھیں۔ اس کے ایک مگل کا سالانہ خرچ 50 لیکن ڈالر تھا جبکہ رعناء کو پیش کھلانے کا شوق تھا۔ اس کے لئے جنیوا کی ایک کمپنی پیش سرکہ بناتی تھی۔ رعناء کا اس کمپنی سے معابدہ تھا وہ یہ سرکہ کسی دوسرے گاہک کو فروخت نہیں کرے گی۔ اس کے جو تے اٹلی کی ایک کمپنی تیار کرتی تھی اور ہر جو تے پر تحریر ہوتا تھا "پیش فار پرنس رعناء" اس کے لئے کپڑے اور خوشبوگیں ہجوس سے آتی تھیں۔ پورے بخدا میں یہ مشہور تھا جو خوشبو رعناء لگاتی ہے وہ عراق میں کسی دوسری عورت کے پاس نہیں ہوتی۔ رعناء کے لئے صابن تک لندن سے آتا تھا اور یہ صابن بھی خصوصی طور پر اسی کے لئے بنایا جاتا تھا۔ برخدا اور رعناء دونوں شادی شدہ تھیں، دونوں کے لوپچے تھے۔ یہ بچے بھی ظاہر ہے سونے کے نوالے کھاتے اور ریشم و اطلس پر سوتے ہیں۔ پورا پورا مگل سنتر لی ایئر کنڈیشنڈ تھا۔ گھوڑوں کے اصطبل اور مگل کو دودھ فراہم کرنے والی گائیوں کے باڑے تک ایئر کنڈیشنڈ تھے۔ مگل کی صفائی اور دھانائی کے لئے مشینیں ہر دم موجود تھیں۔ یہ دونوں شہزادیاں اور ان کی آل اولاد جدر سے گزرتی لوگ وہاں حقیقتاً ٹکلیں بچا دیتے تھے۔ ان کے بچے ملاز میں کے منہ میں لگام ڈال کر ان کی پشت پر سواری کرتے تھے اور ذرا ذرا اسی گوتا ہی اور غلطی پر انہیں کوزوں سے ادھیزدیتے تھے لیکن صرف چار ماہ بعد یہی برخدا، رعناء اور ان کے 9 بچے بخدا کے مضافات میں دو کروں کے ایک ایسے گھر میں رہ رہے ہیں جس میں بھلی ہے اور نہ اسی پانی۔ جس تک کوئی پنٹگی جاتی ہے اور نہ اسی سرک۔ جس میں ایئر کنڈیشنر ہے اور نہ اسی ریفریگریٹر۔ ان دونوں خواتین اور ان کے 9 بچوں کی تکمید اشت کے لئے کوئی آیا ہے اور نہ اسی ملازم، یہ دونوں خواتین خود اپنے نزم و نازک ہاتھوں سے گھر کی صفائی کرتی ہیں۔ جھماڑ و دیتی ہیں، "ناکی" لگاتی ہیں۔ سرکاری قلع سے پانی لاتی ہیں، نوائلک دھوتی ہیں اور کھانا بناتی ہیں۔ صدام حسین کا ترجیح رشتہ دار عز الدین محمد حسن الماجد چند روز قبل ملاقات کے لئے ان کے گھر گیا تو "شاہ عراق" کی دونوں بیٹیاں اس کے گلے لگ کر روپڑیں۔ عز الدین محمد حسن الماجد کا کہنا تھا برخدا اور رعناء کی مظلومیت، غربت اور عمرت سے کہیں زیادہ افسوس ناک بات عام لوگوں کا رو یہ ہے۔ لوگ جانتے ہیں یہ شاہی خاندان ہے لیکن

زیر و پوائنٹ 2
انہیں سرکاری قل سے پانی تک بھرنے نہیں دیا جاتا۔ لوگ ان سے یوں کتراتے ہیں جیسے اچھوت کے مریضوں سے پرہیز کیا جاتا ہے۔

یہ ہے اس صدام حسین اور اس کے خاندان کا انجام جس کا چار ماہ پہلے تک پورے عراق میں طویل بولتا تھا۔ صدام حسین کے اختیار اور اقتدار کا یہ عالم تھا پہلے تک پھر پھڑانے سے پہلے قل بھانی سے اجازت لیتا تھا۔ اگر کوئی شاخ شوئی میں آ کر بلا اجازت ذرا سی جھوم لئی تو احساس ہوتے ہی عتاب شاہی کے خوف سے درخت پر لگے گئے سوکھ جاتی تھی یہ اس صدام حسین اور اس کا خاندان ہے جس کی اتنا کو پوری دنیا کا وزن مل کر نہیں جھکا سکا، جسے دنیا بھر کے نفیات والوں نے ”لوہے کے اعصاب کا مالک“ قرار دیا۔ جس کی دہشت سے آج نوئی بلیز اور جارج بیش نیند کی گولیاں کھا کر سوتے ہیں اور جس کے بارے میں کہا جاتا ہے عراق کے اڑھائی کروز پاشندے کے دماغ میں صدام حسین کا خوف یوں بیٹھ چکا ہے جس طرح برف میں سفیدی اور آگ میں سرخی جیختی ہے۔ امریکیوں کا کہنا ہے شاید موجودہ عراقیوں کی تیسری نسل اس خوف، اس دہشت سے آزاد ہو سکے۔ آج اس صدام حسین کی شہزادیاں اور اس صدام حسین کے نواسے نواسیاں لگیوں میں ڈل رہے ہیں اور در در وحکی کھار ہے ہیں۔

اس کی کیا وجہ ہے؟ انسانی دماغ سوال کرتا ہے۔ وہ بہت سادہ اور عام فہم سے صدام حسین کو قدرت نے لیڈر بننے کا موقع دیا لیکن وہ اڑھائی کروز والوں پر حکمران بن گیا۔ اس نے رہنمائی کے بجائے حکمرانی کو اولیت دی۔ سوال یہ ہے حکمران اور رہنمای میں کیا فرق ہوتا ہے۔ فرق بہت واضح اور صاف ہے۔ قائد اعظم محمد علی جناح پندرہ کروز عوام کے لیڈر تھے انہوں نے پاکستان بننے سے پہلے اپنی واحد اولاد، اپنی بیٹی دنیا کو عاق کر دیا۔ وہ مرتے دن تک اپنی بیٹی سے دوبارہ نہیں ملے لیکن آج بھی جب دنیا واڑیا نیویارک شہر میں نکلتی ہیں تو پاکستانی انہیں دیکھ کر رُک جاتے ہیں، گاڑیاں لکھری کر دیتے ہیں۔ سگریٹ بجھادیتے ہیں اور آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ چوم لیتے ہیں۔ لیڈروں سے نسبت قوموں اور لوگوں کے لئے تمکن کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے میسوں لوگوں کے پاس ایسے قلم، لیز پیڈ، رومال اور نیپکن دیکھے جن کے بارے میں بتایا گیا یہ نیپکن، یہ رومال، یہ کاپی اور یہ قلم قائد نے صرف ایک بار استعمال کیا تھا۔ لوگوں نے ان استعمال شدہ چیزوں کو غلاف میں لپیٹ رکھا ہے۔ رہے حکمران تو اس ملک میں کتنے لوگ ہوں گے جن کو معلوم ہو گا غلام محمد، سکندر مہرزا، فیروز خان تون، ایوب خان، سیکھی خان، جزل خیا، اور محمد خان جو شجوں کس جگہ دفن ہیں اور ان کی اولاد کس دفتر میں ملازمت کر رہی ہے۔ قدرت جب کسی شخص کو اقتدار سونپتی ہے تو اسے دونوں مواقع دیتی ہے وہ لیڈر بن جائے یا حکمران، وہ دو کمرے کے فیکٹ میں رہے، عام بس میں سفر کرے، لوگوں کے ساتھ عام کھانا کھائے یا پھر 110 کنال کے ہاؤس میں رہے، تمیں تمیں گاڑیوں کے کانوائے میں سفر کرے اور شیافتیں اڑائے لیکن افسوس دنیا میں لیڈر بننے والے کم اور صدام حسین کہلانے والے زیادہ لوگ ہیں چنانچہ

جب مہلت ختم ہوتی ہے، جب آنکھ کھلتی ہے تو شہزادے سرکوں پر بھیک مانگ رہے ہوتے ہیں اور شہزادیاں بالٹیاں پکڑ کر سرکاری نل کے سامنے کھڑی ہوتی ہیں۔ وہ اولاد جس کے لئے انسان پوری زندگی آسائیں جمع کرتا رہتا ہے وہ دو کروں کے مکان میں ملتی ہے اور اس وقت بجلی کا ایک پنچھا اور سختے پانی کے دو گلاں اس اولاد کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہیں۔



صرف دو چیزیں

اہل یوتان نے ایک دیوبھی بنائی، سفید مرمریں بدن پر ہیکھے نقوش کھودے، جوف، زاویوں اور اہمابروں میں جاذبیت بھری، قامت میں نخرا اور کاسٹھ میں ایک غور بھرا اور پھر دیوبھی کو اتنا کراچینٹر کے مرکزی چوک میں رکھ دیا۔ لوگ جمع ہوئے سراپا ناز کے حصن اور اعضا کے توازن پر داد دی۔ تھیں کا یہ سلسہ جاری تھا کہ کسی نے آواز لگائی ”لوگو! دیوبھی کی تو آنکھیں ہی نہیں۔“ لوگوں نے چونک کر چہرے کی طرف دیکھا۔ واقعی آنکھوں کی جگہ ہمارا تھی، لوگ اعضا کے توازن اور نقوش کی جادوگری میں اتنے کھو گئے تھے انہیں آنکھوں کی کسی کا احساس ہی نہیں ہوا۔ ارے ارے اس کے پاؤں بھی غیر انسانی ہیں۔ کسی نے ہانک لگائی، لوگوں کی نظریں بے اختیار دیوبھی کے قدموں میں آگریں۔ دیوبھی کے پاؤں نہیں تھے۔ بت تراش بے پھولیوں کے فوراً بعد پنگہ تراش دیئے تھے چیل کے لبے لبے بد صورت پنگہ ”اوے اس کا دل“ جمع میں سے آواز آئی، نظریں میئے پر جا آنکھیں، وہاں میں دل کے مقام پر ایک سوراخ تھا اور اس سوراخ میں لوہے کا ایک بد صورت گلزار رکھا تھا۔ لوگ سنگ تراش کو ڈھونڈنے لگے، بت ساز حاضر ہو گیا، لوگوں نے اس کی مذمت شروع کر دی جب لوگ جیخ چھ کر تھک گئے تو بت تراش نے اداں لجھے میں کہا ”حضرات یہ افتدار کی دیوبھی ہے، افتدار کی آنکھیں نہیں ہوتیں لہذا ہر وہ شخص جو دیکھ سکتا ہے اور جس کی آنکھوں میں حیا ہو وہ افتدار کا پچاری نہیں ہو سکتا، افتدار کے میئے میں دل نہیں ہوتا لہذا ہر وہ شخص جس میں رحم ہو، جو لوگوں کے دکھ دیکھ کر میئے میں بوجھ محسوس کرتا ہو، وہ بھی افتدار سنگ نہیں پہنچ سکتا اور حضرات!“ سنگ تراش سانس لینے کے لئے رکا۔ لوگ گلکلی باندھ کر دیکھ رہے تھے اور حضرات افتدار کے پاؤں نہیں ہوتے، یہ اڑتا ہوا آتا ہے اور اڑتا ہوا واپس چلا جاتا ہے۔“

میں برسوں سے افتدار کی دیوبھی تلاش کر رہا تھا، وہ دیوبھی سنگ تراش نے جس کی آنکھیں، جس کا دل اور جس کے پاؤں نہیں تراشے تھے، جس میں حیا، رحم اور وفا نہیں تھی۔ مجھے یہ دیوبھی 25 جنوری سن 2003ء کی سختی دوپہر کو پنجاب اسلامی کے باہر ملی۔ اس کے قدموں میں نواز شریف کی تصویریں پڑی تھیں۔ پنجاب اسلامی کا عملہ اندر چاتا، اسلامی کے یہ آمدوں، کافر فس روسموں، چیبردوں اور ہالوں کی دیواروں سے توازن شریف کی تصویریں اتارتی اور اخنا کردیوبھی کے قدموں میں لا پھینکتا۔ ہر تصویر کے گرنے پر تھک کی آواز آتی اور

دیوی کے پروں میں بلکا سار تھا شہر ہوتا۔ میں دیوی کے پاس کھڑا ہو گیا، اس نے بے چشم چہرے سے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی "نئے حاکم آتے ہیں تو پرانے حاکموں کی تصویریں یوں ہی قدموں میں رہتی اور کبڑیوں کی دکانوں پر بیکتی ہیں۔" میں نے پوچھا "اس زوال کے مشاہدے پر تمہیں افسوس نہیں ہوتا" دیوی نے تقبہ لگایا "افسوس! آنکھوں والوں کو ہوتا ہے، سینوں میں دل رکھنے والوں اور اپنے قدموں پر کھڑے ہونے والوں کو ہوتا، میں اقتدار ہوں، میری تو آنکھیں ہی نہیں، میرے سینے میں تو دل ہی نہیں اور میرے خنکوں کے ساتھ تو پیر ہی نہیں، پھر مجھ میں وفا، رحم اور حیا کہاں سے آئے گی، میں جس تیزی سے آتی ہوں، اس سے ہزار گناہ تیزی کے ساتھ رخصت ہو جاتی ہوں۔"

میں نے پوچھا "نئے حکمران بھی پرانے حکمرانوں کی تصویریں اتارتے ہوئے نہیں سوچتے" دیوی نے فلک شکاف تقبہ لگایا "میرے پیچاریوں کی بھی آنکھیں، دل اور پیر نہیں ہوتے۔" میں نے پوچھا "تم رہتی کہاں ہو؟" بولی "ملکوں کے باہر، اسلامیوں کی سیڑھیوں اور سیکرٹریوں کے دروازوں پر، رخصت ہوتے قدموں کی لفڑی اور دغل ہوتی گردنوں کے غرور میں" وہ رکی، سانس بھری اور روائی لجھے میں بولی "حکمرانوں کی اتنا میری خواب گاہ ہوتی ہے، حکمرانوں کا تکبر میرا لباس اور حکمرانوں کا جلال میرا دفتر، میں کسی ایک کی بن کر نہیں رہ سکتی، یہ حقیقت سب جانتے ہیں لیکن ماہتا کوئی نہیں، سب میری طلب کرتے ہیں، مجھے پوچھتے ہیں، لیکن میں ملکی کسی ایک کو ہوں اور پھر رخصت ہو جاتی ہوں، ایک کے جلاں سے نکل کر دوسرے کے جلاں، ایک کا لباس اتار کے دوسرے کے لباس اور ایک خواب گاہ سے دوسرے کی خواب گاہ میں داخل ہو جاتی ہو۔" میں نے کہا "اقتدار کے پیچاریوں کے لئے تمہارا کوئی پیغام" دیوی نے تقبہ لگایا "اقتدار کے پیچاری سانہیں کرتے، اگر سن لیں تو مانا نہیں کرتے لیکن میں انہیں تمہارے ذریعے پیغام ضرور دوں گی" وہ رکی، سانس سیمیں، نواز شریف کی تصویریوں پر ہاتھ پھیرا اور آہستہ آواز میں بولی "ان سے کہہ دو جو اقتدار لا ہوں میں رہ کر لا ہوں کے نواز شریف کا نہ ہو سکا وہ گجرات کے چودھریوں کے پاس کب تک رہے گا" ان سے کہہ دو "دنیا میں صرف دو چیزیں داگی ہیں، اللہ اور اللہ کی راہ میں کی گئی تسلی، پوچھنا چاہتے ہو تو اسے پوچھو، کرنا چاہتے ہو تو اس کی مخلوق سے سُنکل کرو، بصورت دیگر تصویر کی طرح نکلنے اور تصویر کی طرح اترتے رہو گے۔"



جب تک بند نہیں ہوتی

مرحوم جزل غلام احمد سے میری پہلی ملاقات فشر کا لوئی میں ان کی رہائش گاہ پر ہوئی تھی۔

میرے سر کریل ظفر اقبال ریٹائر فوجی آفیسر ہیں۔ جزل غلام احمد نے بھی کریل صاحب کی کمان میں "سر" کیا تھا۔ اس نسبت سے مرحوم کریل صاحب کا بے حد احترام کرتے تھے۔ سال ڈی ۱۹۷۶ سال پہلے کریل ظفر لاہور سے آئے، مرحوم جزل کو خبر ہوئی تو انہوں نے ہمیں گھر آنے کی دعوت دی یہ میری ان سے پہلی طویل ملاقات تھی۔ جزل صاحب فشر کا لوئی میں جس گھر میں رہائش پذیر تھے مجھے پہلے بھی اس میں جانے کا اتفاق ہوا تھا لہذا گفتگو کے دوران جب ان سے بے تکلفی ہو گئی تو میں نے ان کی توجہ اس گھر کی طرف مبذول کرائی اور ان سے عرض کیا "جزل صاحب میں اس ڈرائیکٹر دم میں آج چوتھی مرتبہ واصل ہوا ہوں، دلچسپ بات یہ ہے ہر بار اس گھر، اس نشست گاہ کا میزبان مختلف تھا۔" انہوں نے دلچسپی سے میری طرف دیکھا "میں پہلی بار آیا تو بے نظیر بھنوکی حکومت تھی۔" میں نے عرض کا سلسلہ جاری رکھا "اس گھر میں بے نظیر بھنوکا ایک اہم وزیر رہتا تھا، وہ وزیر صاحب اس جگہ شاید اسی صوفے پر بیٹھتے تھے اور میں یہاں جس جگہ کریل صاحب بیٹھتے ہیں، اس وقت ان وزیر صاحب کے چہرے پر اس قدر اعتاد، اس قدر یقین تھا کہ محسوس ہوتا تھا، وہ ان کی یہ نشست اور یہ گھر تینوں اس دنیا کے لئے ناگزیر ہیں۔ اگر ان تینوں میں سے کوئی ایک چیز آگے چیخپے ہو گئی تو اس کائنات کا شیرازہ بکھر جائے گا لیکن جب میں دوسری مرتبہ یہاں آیا تو اس جگہ شاید اسی صوفے پر دوسرا شخص بیٹھا تھا۔ یہ شخص ملک معراج خالد صاحب کی گمراں کا بیٹہ کا ایک گمراں وزیر تھا۔ ان سے گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا، وہ بھی پچھلے صاحب کی طرح خود کو اس سراء کا مستغل مہمان سمجھ رہے ہیں۔ ان کا خیال تھا جب تک ملک کے حالات پوری طرح سدھ رہیں جاتے ان کا قیام یہاں جاری رہے گا، میں تیری بار آیا تو ان صاحب کو رخصت ہوئے مدت گزر پچھلی تھی اور ان کی جگہ میاں نواز شریف کا ایک مندرجہ ذیل اداہ بھی کم و بیش اتنے سال یہاں گزار کر جائیں گے لیکن آج یہاں آپ تشریف رکھتے ہیں۔" میں خاموش ہوا تو جزل صاحب نے قہقهہ لگایا اور نیکن سے منصف کر کے بولے "لیکن میں جانتا ہوں میں یہاں ہمیشہ نہیں رہوں گا۔"

مرحوم ایک بہت اہم شخصیت تھے، صدر جزل پروریز مشرف کے دامیں بازو تھے، صدر اور چیف ایگزیکٹو کے چیف آف ساف تھے، ملک کے زیادہ تر امور میں ان کی رائے کا عمل خل ہوتا تھا۔ وہ حکومت اور حکومت کاری میں اس حد تک ملوث تھے کہ ان کا وجود اس حکومت کے لئے تاگزیر ہو چکا تھا۔ دن ہو یا رات، چھٹی کا دن ہو یا کوئی تہوار جب بھی کسی اہم نیفلے کا وقت آتا ان کے فون کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو جاتیں، ان کا ڈرامیور ہر وقت تیار رہتا تھا۔ وہ خود بھی ہر وقت ایسا لباس پہنچتے تھے کہ اگر تینیں رات کے وہ بجے بھی طلب کیا جائے تو انہیں لباس نہ تبدیل کرنا پڑے، وہ اسی طرح انہیں اور انہی کرچل پڑیں، ان کی میز پر فانکلوں کا اخبار ہوتا تھا، ان میں سے کچھ بہت اہم ہوتی تھیں، کچھ صرف اہم اور کچھ معمول کی دفتر کی کارروائی، ان کی میز کے ساتھ نیلی فونوں کا ریکھتا جس پر نصف درجن فون رکھتے تھے۔ ان فونوں میں سے ایک فون "ہارت لائیں" تھی جب وہ فون بجتا تو کرے میں سناتا طاری ہو جاتا کیونکہ سب کو معلوم تھا، اب دوسری طرف صدر جزل پروریز مشرف ہیں اور یہ کوئی بہت اہم معاملہ ہے، اسی میز پر پانی کا ایک گلاں بھی رکھا ہوتا تھا۔ پانی کا بال بھرا گلاں جو ہر وقت کروشی کی جائی سے ڈھکا رہتا تھا اور جسے وقت فو قتا اردوی بھرتا رہتا اور اس کی جائی درست کرتا رہتا، اسی میز کے کسی کو نے میں ایک نحاح سا بیٹھن تھا۔ مرحوم جزل جب اس پر انہی کا معمولی سادباڑا لئے تو دور کہنی گھنٹی کی آواز سنائی دیتی اور چپر اسی نوپی سیدھی کرتا ہوا اندر دائل ہوتا اور آکر سامنے کھڑا ہو جاتا۔

ایہ بھنی اب بھی وہیں ہے، چپر اسی بھی اسی طرح گھنٹی کی آواز پر کان لکھے دیکھا ہے، پانی کا گلاں بھی وہیں رکھا ہے اور اس پر کروشی کی جائی بھی اسی طرح دھری ہے۔ نیلی فون کے ریک میں فون بھی اسی طرح رکھے ہوئے ہیں اور انہیں نیلی فون میں ایک "ہاث لائیں" بھی ہے جو جب بھجتی ہے تو کرے میں سناتا ہو جاتا ہے۔ وہ میز بھی وہیں ہے اور اس میز پر فانکلیں بھی اسی طرح دھری ہیں اور ان فانکلوں میں کچھ بہت اہم ہیں، کچھ صرف اہم اور کچھ معمول کی دفتری کارروائی۔ ان کے گھر میں بھی فون اسی طرح رکھے ہوئے ہیں۔ آپ یہڑی کی انگلیاں بھی اسی طرح "کی بورڈ" کے بننوں پر موجود ہیں۔ سرونش کوارٹر میں ڈرامیور بھی تیار بیٹھا ہے، وہ گھر بھی وہیں موجود ہے، اس گھر کے نوکر، چوکیدار، گارڈ سب اپنی اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ اس ملک کے تمام اہم امور بھی اسی طرح قائم و دائم ہیں اور مشورے لینے والوں میں بھی اسی طرح مشورے کی ضرورت باقی ہے۔ اگر کوئی چیز کم ہے اگر کوئی شخص اپنے مقام پر موجود نہیں تو وہ جزل احمد ہیں، مرحوم جزل غلام احمد سابق چیف آف ساف صدر پاکستان، تمغہ ہلال امتیاز اور بس! مجھے یقین ہے اب اس گھر میں کوئی ناگزیر شخص آباد ہو جائے گا، فون کی گھنٹیاں اب بھی بھیں گی لیکن آپ یہڑا بیکاری کسی اور سے ملائے گا، یہ گارڈ، یہ چوکیدار اور یہ نوکر اب بھی حکم بجا لائیں گے لیکن اب حاکم جزل جی اے کی بجائے کوئی اور ہو گا۔ ڈرامیور اب بھی سرونش کوارٹر میں تیار بیٹھا رہے گا لیکن گاڑی کے دروازے اب کسی اور کے لئے کھلیں گے۔ میز پر رکھی فانکلوں پر دستخط اب بھی ہوں گے لیکن اب یہ دستخط کوئی اور کرے گا، ہاث لائیں بھی بجے گی، دوسری

طرف صدر مملکت ہی کی آواز ہو گئی لیکن اب یہ کال کوئی اور رسیو کرے گا۔ یہ پانی کا گلاس بھی اب کسی اور ہی کے لیوں تک پہنچے گا اور اس بٹن کو جی ہاں میز کے کسی کونے کھدرے میں چھپے اس بٹن کو بھی اب کوئی اور ہی دبائے گا اور چپڑاں بھی اب کسی اور ہی کے سامنے کھڑا ہو گا۔ سب کچھ وہی رہے گا لیکن صاحب بدل جائے گا۔۔۔ نہیں رکے بلکہ صاحب بدل چکا ہے۔

میرے بزرگ جزل غلام احمد نے تلد گلگ کے قریب حدائقے کا ڈکار ہونے سے پہلے شاید بھی شوچا تھا دنیا میں صرف مسئلے ناگزیر ہوتے ہیں۔ لوگ نہیں اور دنیا میں ہر اہم شخص کو غیر اہم ہوتے اتنی ہی دری گلتی ہے جتنی اسے غیر اہم سے اہم ہونے میں لگتی تھی اور کاج تو شاید نوٹے ہوئے بنوں کو چند لمحے، چند گھنٹیاں یاد رکھ لیں لیکن دنیا کے پاس گزرے لوگوں کے لئے بھی اتنا وقت نہیں ہوتا اور گزرے ہوئے لوگوں کو گلاس، میز، ٹیلی فون اور فائلیں نہیں صرف قبریں یاد رکھا کرتی ہیں لیکن زندگی، ہائے، ہائے یہ زندگی، اس کے غلام لوگ جنمیں ہر وقت ایک آقا کی ضرورت ہوتی ہے اور آقاوں کے یہ تخت اور یہ تاج، یہ میزیں، ان میزوں کے کنوں میں چھپے بٹن، یہ گھنٹیاں، یہ فائلیں، یہ ہات لائینس، یہ ڈرائیور اور گاڑیوں کے یہ کھلتے بند ہوتے دروازے، یہ ایک ایسا سراب ہیں جس میں گرفتار ہر شخص خود کو اس دنیا، اس نظام کے لئے ناگزیر سمجھ بیٹھتا ہے، وہ سمجھتا ہے جس دن وہ نہیں ہو گا سورج نہیں نکلے گا، گھریاں نہیں چلیں گی لیکن اس کے بعد گھریاں بھی چلتی رہتی ہیں اور سدرج بھی نکلتے رہتے ہیں۔

Kashif Azad @ OneUrdu.com

یہ آنکھ بھی بڑی بد بخت چیز ہے جب تک بند نہیں ہوتی یہ کھلتی ہی نہیں۔



بھیڑیں کبھی اتحاد نہیں بن سکتیں

جنوری 2002ء میں بغداد کے مشہور فائیو سار ہوٹل الرشید میں تصویریوں کی نمائش تھی۔ نمائش کا اہتمام خلیج کی جگہ کے گیارہ سال پورے ہونے پر کیا گیا۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے دروازے پر سینٹر بیش کی تصویر بچھا رکھی تھی جو بھی عراقی اندر داخل ہوتا وہ پہلے تصویر سے جوتے صاف کرتا، عراق کے وزیر خارجہ بھی صابری نمائش کے مہمان خصوصی تھے۔ وہ ہال میں داخل ہوئے تو انہوں نے خصوصی طور پر بیش جو نیز، نوئی بلیز، ملک لکنشن، مارگریٹ سیچر اور جان میجر کی تصاویر منگوائیں اور ان سے اپنے جوتے صاف کئے۔ نمائش کے شرکاء آخر وقت تک یہ تصاویر اپنے پیروں میں رومند تے رہے۔

نمائش کے شرکاء کی نفرت درست تھی۔ ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو اس کا بھی رد عمل ہوتا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا تصاویر رومند تے، اپنے دشمن کی تصویریوں سے جوتے صاف کرنے سے امریکہ اور برطانیہ کی عسکری قوت ختم ہو گئی، بیش اور نوئی فنا ہو گئے۔ جگہ کے خطرات مل گئے، اتحادی فوجیوں نے عراقیوں پر بم چینکنے کا ارادہ ملتا ہے اور کیا امریکہ اور برطانیہ کے جریلن سہم گئے۔ یقیناً نفرت اور احتجاج بھی ایک طاقت ہوتی ہے لیکن یہ طاقت جگہ روکنے کے لئے کافی نہیں ہوتی کیونکہ یہ طاقت تو پوس اور میزانلوں کے اروے نہ دیتے۔ دنیا میں آج تک کسی جگہ کے خلاف اتنا احتجاج نہیں ہوا۔ اس وقت دنیا کے آٹھ ہزار دو شہروں میں شور برپا ہے۔ دنیا کا کوئی ملک، کوئی شہر، کوئی قصبہ اور کوئی ایسی گلی نہیں جس میں "نووار" کے نظرے نہ لگ رہے ہوں۔ امریکہ کے اندر بھی تاریخ میں پہلی بار رسول نافرمانی کی اتنی بڑی تحریک شروع ہوئی۔ امریکہ بھر میں یونیورسٹیوں کے طالب علموں نے کاسوں کا بائیکات کیا۔ مظاہرین نے سرکاری دفتروں کا گھیراؤ کر رکھا ہے، سینکڑوں افراد گرفتار ہو چکے ہیں، امریکہ کی جیلوں میں قیدیوں کے لئے جگہ نہیں پہنچی۔ سان فرا ایسکو میں مظاہرین نے تاریخی عمارت "ٹرانس اسپریکا" اور سیکریٹ فیڈرل بلڈنگ کا گھیراؤ کر رکھا ہے، طباہ، نیٹ یونیورسٹی کی انتظامی عمارت پر قابض ہو چکے ہیں۔ کونسلیٹ کے علاقے ہارت فورڈ کی فیڈرل بلڈنگ اور دفاعی فرم یونا یونڈ میکنالوجی کے ہیڈ کوارٹر کا گھیراؤ ہو چکا ہے۔ صدر بیش کی آبائی ریاست نیکاس کے شہر آشن میں

مظاہرین خود کو زخمیوں میں باندھ کر بیٹھے ہیں۔ مینو نایونورشی کے ہزاروں طالب علموں نے راستے بند کر رکھے ہیں۔ جنوبی کوریا میں زندگی محظل ہو چکی ہے۔ آسٹریلیا میں مظاہرین نے پارلیمنٹ پر قبضہ کر لیا تھا۔ برطانیہ کا کوئی ایسا شہر نہیں جس میں مظاہرہ نہ ہو رہے ہوں۔ فرانس، جرمنی اور سری لینڈ پر احتجاج کی آگ میں سلگ رہا ہے۔ پورا عالم اسلام سرکوں پر کھڑا ہو کر ”بیش مردہ باد“ کے نعرے لگا رہا ہے۔ برطانوی وزراء استھنے والے رہے ہیں اور دوسو برطانوی ارکان پارلیمنٹ نے جنگ کے خلاف مشترک یادداشت پیش کر دی، رہی نفرت تو اس وقت دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا شہر ہو جس میں بیش اور نوئی بلیز کے پستانے نہ جلانے گئے ہوں۔ جس میں بیش اوابے اوابے، نوئی ہائے ہائے کے نعرے نہ گئے ہوں۔ جس میں امریکہ اور برطانیہ کے پرچم نذر آتش نہ ہوئے ہوں۔ جس میں بیش اور بلیز کے چہرے کپڑے کے کتوں اور بلیوں پر نہ لگائے گئے ہوں لیکن اتنی تاریخی نفرت اور اس قدر بین الاقوامی احتجاج کے باوجود جنگ نہیں رکی۔ آج عراق پر دن رات موت اتر رہی ہے۔ آگ ہے کہ چاروں اطراف سے برس رہی ہے۔ نفعیں ہیں کہ مسلسل گر رہی ہیں۔

یہ کائنات کا منفرد اصول ہے لو ہے کو صرف اپنا کاٹتا ہے۔ طاقت کو صرف طاقت روک سکتی ہے۔ نیک نیک، میزائل میزائل اور بم صرف بم سے روک سکتا ہے۔ آپ عراق کی مثال لیں امریکہ 1991ء سے عراق پر جنے کا ارادہ کھلتا تھا لیکن اس جنگ کو 2003ء تک کس چیز نے روکے رکھا۔ وہ چیز جو ایسی اور کیمیائی ہتھیاروں کا خوف قاتا امریکہ کا خیال تھا عراق کے پاس پہنچنا اس ہتھیار موجود ہیں۔ جنگ کی صورت میں عراق یہ ہتھیار استعمال کر دے گا۔ 2003ء میں معافی اپکرن بقداد آئے۔ انہوں نے تحقیق کی اور عراق کو کیمیائی ہتھیاروں سے پاک قرار دے دیا جس کے بعد اتحادی عراق پر چڑھ دوڑے۔ اگر کیمیائی ہتھیاروں کا خوف جنگ کو نو برس تک روک سکتا ہے تو ذرا سوچنے اگر عراق ایسی طاقت ہوتا، اس کے پاس بھی تام ہاک کروز میزائل ہوتے، اس کے پاس بھی ایف 15، 16 اور 18 ہوتے اور اگر وہ بھی ”بہوں کی ماں“ بنانے کی اہلیت رکھتا تو آج اتحادیوں نے عراق کو یوں گھیرا ہوتا؟ یقیناً نہیں۔ یہ بات بھی طے ہے عراق کے بعد ایران، پاکستان، شام اور دوسرے اسلامی ممالک کی باری ہے۔ امریکہ ایک ایک کر کے سارے ائمے توڑ دے گا۔ اس غربت، اس اژڈھی سے بچاؤ کا صرف ایک طریقہ ہے۔ 61 اسلامی ممالک اسکتے ہوں، ایک مشترک فوج بنائیں اور آپس میں یہ فیصلہ کر لیں کسی بھی اسلامی ملک پر جنگ کی صورت میں تمام ممالک لڑیں گے۔ آخر ہم ایک ارب 45 کروڑ لوگ ہیں۔ 61 اسلامی ممالک ہیں۔ ہمارے پاس 66 لاکھ 76 ہزار 5 سو جوانوں کی فوج ہے اور 177 ارب ڈالر کا دفاعی بجٹ ہے۔ ہم دنیا کے ایک چوتھائی وسائل کے مالک ہیں کیا ہم اتنے وسائل، اتنی بڑی فوج اور اتنی وسیع آبادی کے باوجود اپنی حفاظت نہیں کر سکتے۔ یقین فرمائیے اگر آج تمام اسلامی ممالک اپنی آمدی کا صرف دس قیصہ سائنس اینڈ تکنالوژی پر لگانا شروع کر دیں تو ہم صرف دس سال میں امریکہ کے برابر عسکری طاقت بن جائیں۔ ہماری آنکھیں اتنی چمک اور ہمارے میں اتنی طاقت آجائے کہ

دنیا کی کوئی طاقت ہماری طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے لیکن یہ کون کرے گا! یہ ہم مسلمانوں کے بس کی بات نہیں، ہم مسلمان تو بھیز بکریاں ہیں اور یہ حق ہے بھیز بھی اتحاد نہیں بنائیں اور بکریاں قصاری کے سامنے سرنہیں اٹھا سکتیں۔



60 سو 5 ہزار 76 لاکھ

پہلا پھر سات سال کے بچے نے پھینکا، جو نبی مینک دہاں پہنچا جہاں تین سو کیس ملتی ہیں۔ یہ بچہ گلی سے نکلا، مینک کے سامنے کھڑا ہوا اور پھر پھینک کر دوسرا طرف نکل گیا، مینک کے گھومتے سر سے رانفل کی قلی لگلی، مینک فائر سے پہلے بچہ غائب ہو چکا تھا، قلی گھومی مگر اس وقت تک مینک پر پھروں کی بارش شروع ہو چکی تھی، سینکڑوں بچے گلیوں سے نکلتے، مینک پر پھر پھینکتے اور بھاگ کھڑے ہوتے، یہ کھیل گھنٹوں چاری رہا مگر رکنے یہ کھیل تو 1948ء سے بیت المقدس، غزہ، مغربی کنارے اور رملہ کی گلیوں میں کھیلا جا رہا ہے، کتنی ہی شلیں پھروں سے مینکوں اور غلیلیوں سے توپوں کا مقابلہ کرتے آسودہ خاک ہو گئیں اور اس خاک سے ابا یہلوں کے کتنے ہی لشکر نکل، وہ لشکر جو اپنی چونکوں میں ملنکریاں بھر کر لوئے کے ہاتھیوں کے سامنے کھڑے ہو جاتے تھے یہ بچوں کا لشکر تھا، نسبت نوجوانوں، معدود نوجوانوں، بے بس عورتوں اور یہاں بورڈھوں کی فوج تھی جس کے پاس اپنے دفاع کے لئے پھروں اور دعاوں کے سوا کچھ نہیں تھا، لیکن اس بیکار، بے بس اور بے کس فوج نے دنیا کے تمام فرعوں کو بے بس کر دیا۔ وہاں مقبوضہ بیت المقدس کی ناہموار وادیوں میں امریکہ ہو، اسرائیل ہو یا یہودیوں کے یورپی حليف سب 58 برس سے تاک رکھ رہے ہیں، ان بے بس بچوں اور مظلوم لوگوں نے ثابت کر دیا ہا تھی انسانوں کو تو چکل کتے ہیں لیکن چذبوں کو نہیں رومند کتے۔

اب آئیے کشمیر کی طرف پوری وادی میں صرف دو ہزار مجاہدین ہیں۔ ان مجاہدین کو دنیا کے کسی کوئے سے سپورٹ نہیں مل رہی، ان کے پاس اسلحہ نہ راشن، گرم کپڑے ہیں اور نہ ہی جوتے۔ یہ لوگ مقامی زبان جانتے ہیں اور نہ راستے لیکن ان نوجوانوں نے بھارت کی سات لاکھ فوج کو کان پکڑا رکھے ہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت اور پانچویں بڑی فوج ان دو ہزار ان ترین نوجوانوں کے سامنے بے بس ہے۔ عالم یہ ہے بھارت 15 ارب 3 سو 51 میلین ڈالر کے دفائلی بجٹ اور 13 لاکھ فوج کے باوجود پاکستان کی "مد" کے بغیر کشمیر میں ایکشن نہیں کر سکتا۔

جنچنیا کی مثال یہیں، چند مشنی بھر لوگ ہیں جن کے پاس بارود ہے، گولیاں ہیں، گولے ہیں اور نہ ہی تو پہیں لیکن انہوں نے پچھلے دس گیارہ برس سے رہیں جیسی طاقت کو ہاتھی کے پاؤں سے باندھ رکھا ہے، اسے

بھی جانے دیجئے۔ آپ اسامہ بن لادن چیسے کمزور، بیمار اور بوڑھے شخص کو دیکھئے، یہ شخص کسی سلطنت کا پادشاہ ہے، اس کے پاس کوئی فوج ہے اور نہ ہی میزائل لیکن امریکہ جیسی طاقت اس سے ایسے ڈرتی ہے جیسے جیونی بارش ہے، آج بھی ولڈ تریڈ سینٹر پشاں گان کی تباہی اس شخص سے منسوب کی جاتی ہے جس کے دونوں گردے ناکارہ ہیں اور جس نے زندگی کا بہترین حصہ دیر انہوں اور غاروں میں گزار دیا۔ طالبان کو لیجئے، ان غریبوں کے پاس کیا تھا، رائفل تھی تو گولی نہیں تھی، قیس تھی تو اس رنگ کی شلوار تھیں تھی، وہ بارودی سرنگیں صاف کرنے والے کارکنوں کے جو تے پہنے اور لوہے کی فوجی ٹوپی میں کھانا پکاتے تھے لیکن ان بوریا نشینوں نے امریکیوں کے اتحادیوں کو ہلاک کھو دیا آج ان طالبان کا ماہی کا حصہ ہوئے مینے گزر چکے ہیں لیکن آج بھی امریکیوں کی آنکھوں سے خند غائب ہے۔ ڈک چینی دس اور گیارہ ستمبر کی درمیانی رات خفیہ مقام پر پہنچا گزارتا ہے۔

اب آتے ہیں اصل موضوع کی طرف! ذرا سوچئے اگر یہ چند ہزار نہ ہتے، بے سروسامان اور بے آسرائیک اپوری دنیا کو جزوں سے ہلا کتے ہیں تو 161 اسلامی ممالک کے ایک ارب 40 کروز 131 لاکھ 51 ہزار مسلمان کیا کیا نہیں کر سکتے ہیں اور مسلمان بھی وہ جن کے پاس 3 کروز 48 لاکھ 19 ہزار 7 سو 90 میٹر رقبہ اور 66 لاکھ 76 ہزار 5 سو 60 میٹر نہ فوجی ہوں اور جو ہر سال دفاع پر 76 ارب 9 سو 50 ملین ڈالر خرچ کرتے ہیں۔ جن کے پاس ایتم ہے، میزائل ہیں، جہاز ہیں اور تو جیس ہیں۔ خدا کی پناہ، ذرا سوچئے یہ آفریقہ، ایوری کوست، اردن، ایگستان، افغانستان، الیاسی، الجماہری، اندونیشیا، استھوپیا، ایران، بھرین، برکیتا فاسو، برونائی، بھنگ دیش، بوسنیا، بھن، پاکستان، تاجکستان، ترکمانستان، ترکی، تزاہی، تیونس، توگو، جبوتی، چاؤ، سرگی نام، سعودی، سوڈان، سیرالیون، سینگاپور، شام، صومالیہ، عراق، عمان، لیبیا، ماریٹانیہ، مالدیپ، مالی، امارات، مراکش، مصر، ملائیشیا، موزمبیق، ناچیر، ناچیر یا، وسطی افریقہ، یمن اور یونگنڈا۔ یہ 61 ممالک کس بدا، کس طوفان، کس طاقت کا نام ہے۔ صرف سعودی عرب اپنی فوج پر سالانہ 21 ارب 8 سو 76 ملین ڈالر خرچ کرتا ہے۔ ترکی کا دفاعی بجٹ سو اس ارب ہے، ایران دفاع پر پوتے چھارب، پاکستان ساز ہے تین، کویت سوا تین، استھوپیا سوا تین، الجیریا تین، مصر پونے تین اور عراق، مراکش، عمان اور قطر دو دو ارب ڈالر خرچ کرتے ہیں لیکن بد تسبیب دیکھئے یہ ایک ارب 40 کروز 131 لاکھ 51 ہزار مسلمان اور 66 لاکھ 76 ہزار 5 سو 60 مسلم فوجی عراق کو نہیں بچا سکتے۔ یہ اولگ، یہ ڈیڑھ ارب لوگ امریکہ کو لکار کر یہ نہیں کہہ سکتے "بس جتاب بس، آج کے بعد آپ نے کسی مسلم ملک کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تو پوری دنیا سری گلگر بن جائے گی، اس دنیا کی ہر گلی رملہ اور ہر پہاڑ جھپٹیا ہو گا اور امریکیوں کو دنیا میں چھپنے کے لئے دنیا میں جگہ نہیں ملے گی۔"

یہ عجیب یات نہیں لانے پر آئے تو سات سال کا بچہ نینک کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور بے شرمی پر اترے تو 67 لاکھ نہیں آری موت کو عراق کی طرف بڑھتے دیکھتی رہتی ہے۔ یہ عجیب تشدید نہیں، ایک ہی قوم لیکن دو دو عمل، اب ذرا آگے بڑھ کر اپنی اخلاقی بدحالی بھی دیکھئے، اپنی پوتتی بھی ملاحظہ کیجئے۔ فرض کریں

اگر کوئی اسلامی ملک کسی عیسائی ملک پر حملہ کر دیتا ہے، اس کا کیا نتیجہ نکلے گا، یقیناً پورا امریکہ، پورا یورپ و دنیا میں اس ملک کو صفحہ آستی سے منادے گا اس کے مقابلے میں امریکہ اسلامی ممالک کو تو راپورا بناتا جا رہا ہے لیکن عالم اسلام چپ چاپ تماشہ دیکھ رہا ہے۔ یہ کیا ہے، یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا فیصلہ ہے کہ ایمان قائم ہو تو اللہ کا ایک بندہ پوری دنیا کے لئے کافی ہوتا ہے لیکن ایمان میں درازیں آ جائیں تو 66 لاکھ 76 ہزار 5 سو 60 فوجی اور 176 ارب 9 سو 50 میلیون ڈالر کے فوجی بجٹ میں بھی ظالم کو منہ پر ظالم کہنے کی بہت نہیں ہوتی۔ افسوس سات سال کا وہ بچہ 161 اسلامی ممالک کے ایک ارب 40 کروڑ لوگوں سے زیادہ مرد، زیادہ با ایمان اٹکا جو جاتی تھا پتھروں سے بیکن نہیں نوٹا کرتے لیکن پھر بھی وہ میرے نبی ﷺ کی سنت بھاجاتا رہا، اللہ کے حکم پر عمل کرتا رہا۔



بیچ اس مسئلے کے

ماہر جمی کا کارڈ زیادہ دلچسپ تھا۔ "میرے جیسے بچوں کو آدم خور بش سے بچا کیں" جمی واشنگٹن کے ان پانچ لاکھ شہریوں میں سے ایک تھا جنہوں نے دو بیتے قبل عراق کے حق میں جلوس نکالا، یہ ویتنام کے بعد امریکہ کا سب سے بڑا مظاہرہ تھا۔ مظاہرے میں امریکی پروفیسروں، دانشوروں، آزاد خیال شہریوں، قدامت پرستوں اور ریٹائر جرنیلوں نے شرکت کی۔ مظاہرین کا خیال تھا "صدر بش عراق پر حملہ کر کے زیادتی کر رہے ہیں، عراق مظلوم اور امریکہ ظالم ہے۔" مظاہرین نے مطالبہ کیا "صدام کی بجائے بش کو فارغ کیا جائے" جلوس میں شریک چھوٹے بچوں نے امریکی درندگی کے شکار عراقی بچوں کی تصویریں اخشار کی تھیں۔ یہ امریکیوں کا واحد مظاہرہ تھیں تھا، اڑھائی ماہ میں وہاں ایسے 21 مظاہرے ہوئے۔ امریکی شہری عراق پر بش انتظامیہ کی پالیسیوں کی کھلی مخالفت کر رہے ہیں۔ فلوریڈا ہو، کیلیفورنیا ہو، نیویارک ہو، فلاڈلفیا ہو یا فیکس امریکی شہری ایش میں جھلکی جنون کو پسندیدگی کے نیکی و نیکی رہے۔

اب قرایورپ کی طرف آئیں اکتوبر کے پہلے بیتھے میں پورے یورپ میں امریکہ کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ فرانس، جرمنی اور برطانیہ میں جلوس نکالے گئے۔ اٹلی کے پانچ بڑے شہروں میلان، فلورنس، بولونیا، کاتانیا اور روم میں بیک وقت مظاہرے ہوئے۔ روم میں اطالوی خواتین نے تھکریاں باندھ کر عراقی شہریوں سے اظہار بھگتی کیا۔ برطانوی سفارتکارے کا محاصرہ ہوا جسے چھڑانے کے لئے پولیس کو لائسی چارج کرنا پڑا۔ برطانیہ کی برسرفتدار جماعت لیبر پارٹی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ رکن پارلیمنٹ جارج گلیوے پچھلے دونوں بغداد کے دورے پر گیا جہاں اس نے واضح طور پر عراق کی حمایت کی۔ جرمنی کے حالیہ انتخابات توڑے تھی عراق کے مظلوم عوام کے نام پر گئے ہیں۔ جرمن عوام نے عراق کے عوامیوں کو دل کھول کر ووٹ دیے۔ عراق کے حاجی کامیاب ہو گئے، اب یہ لوگ امریکہ کو باز رہنے کی ہدایت کر رہے ہیں۔ فرانس یورپ کا دوسرا بڑا ملک ہے جس میں عراق کے مسئلے پر امریکہ کے خلاف شدید رو عمل پایا گیا۔ پچھلے دو ماہ میں فرانس میں امریکہ کے خلاف 14 چھوٹے بڑے مظاہرے ہوئے۔ روس تیسرا ملک ہے جس کے شہری "شپ بش" کے نام پر لگا رہے ہیں۔ رہا اٹلی تو یہ ملک اس وقت شدید مظاہروں کی لپیٹ میں ہے۔ آئندہ اور 9 نومبر کو یورپ بھر کے 15 لاکھ مظاہرین نے فلورنس شہر کو بیٹھا بنا لیا۔ شہر میں پولیس کے چھ بڑار جوان تعینات تھے۔ جو اس کے لئے ناکافی سمجھے جا رہے تھے۔ کچھ ایسی ہی صورت حال، کینیڈا، آسٹریلیا اور جاپان بھی درجیں ہے۔ پوری

عیسائی دنیا عراق کے ساتھ کھڑی دکھائی دیتی ہے جو تو یہ ہے اسرائیل کے اندر بھی عراق کے حق میں ایسا گروہ پیدا ہو چکا ہے جو پر امن حل کا حامی ہے لیکن اس کے مقابلے میں آپ عالم اسلام کو دیکھئے، اس وقت جب دنیا کی تیسرا بڑی جنگ مسلمانوں سے شروع ہو رہی ہے اس وقت 161 اسلامی ممالک خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ پچھلے اڑھائی ماہ میں قاہروہ، بیروت اور ذھاک کے سوا کسی اسلامی کے کسی شہر میں کوئی بڑا مظاہرہ نہیں ہوا اور کسی اسلامی ملک کے پیغمبر نے "میرے بھی بچوں کو آدم خور بیش سے بچا کیں" کے نفرے نہیں لگائے۔

آج امریکہ کے چار ہزار جنگی جہاز اور اڑھائی لاکھ فوجی عراق پر حملے کے لئے تیار کھڑے ہیں۔ کسی بھی وقت عراق کے 13 باروفن شہر تو را بورا بن سکتے ہیں۔ پلانگ کے مطابق امریکہ سب سے پہلے عراق پر فضائی حملہ کرے گا۔ ماہرین بتا رہے ہیں امریکہ نے گلف وار کے دوران صرف سات فیصد گایدہ میزائل استعمال کئے تھے۔ کوہو میں تیس فیصد اور افغانستان میں سانچھے فیصد استعمال ہوئے تھے لیکن اب امریکہ عراق پر سو فیصد گایدہ میزائل گرانے گا۔ اس وقت امریکہ نے اپنے چھ سیالات عراق کی گرانی پر لگا رکھے ہیں جو پہلویں گھنٹے عراق پر نظر رکھے ہوئے ہیں، جنگ کے دوران امریکی فوجیں ترکی، اردن، کویت اور سعودی عرب جیسے مسلم بھائیوں کی مدد سے عراق میں داخل ہوں گی۔ امریکی کمانڈر جزل فریڈک مسلم ملک فطر میں اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کر چکا ہے لہذا امریکہ کے بقول عراق اب چند دنوں کا سہماں ہے۔ جی چاہتا ہے کھڑے ہو کر عالم اسلام کو طیوبت کیں ہم و نما کو بتائیں، دیکھو ہم کیسے لوگ ہیں، ہمارے سامنے عراق کے آنہ دوں کروز مسلمان مارے جائیں گے لیکن ہم محترم ہیں اور افظار یاں بھی فرمائے ہیں اور جدے بھی کر رہے ہیں، ہم مسلمان ہیں اور ہمارے دل خوف خدا سے خالی ہیں۔ ہم پار گاہ خداوندی میں کھڑے ہوتے ہیں لیکن ہماری پیشانیوں پر شرمندگی کا پسند آتا ہے اور ہی پیکوں پر ملاں کی لرزش، فرمایا تھا رسول اللہ ﷺ نے "مسلمان ایک بدن کی طرح ہوتے ہیں جس کے ایک حصے میں آنکھ ہو تو پورا بدن ترپتا ہے۔" اے نبی ﷺ وہ ترپ کہاں ہے، وہ بدن، وہ مسلمان کہاں ہیں۔ یہ تو پلاسٹک کے بے حس روپ ہیں۔ جن کا ہر حصہ الگ، ہر حصہ بے حس ہے۔ غور کیجئے پورا یورپ پورا امریکہ اور پورا مشرق بعید "بیش یہ قلم نہ کرو" کے نفرے لگا رہا ہے لیکن عالم اسلام میں سے آؤ ہے ملک "سب سے پہلے پاکستان" جیسے قلنے کات رہے ہیں اور باقی آؤ ہے بیش کے فوجیوں کو زمینی، فضائی اور سمندری راستے فراہم کر رہے ہیں۔ یہ ہیں مسلمان!

میں آج عالم اسلام کے تمام عالموں سے ایک سوال کی ج Saras کرتا ہوں "جو مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی خفاقت نہ کر سکے کیا وہ مسلمان کہلا سکتا ہے؟ کیا اسے خود کو مسلمان کہلانے کا حق حاصل ہے۔" کیا فرماتے ہیں مفتی یا ان اسلام پر اس مسئلے کے؟ ذرا بتائیے کیا ایک ارب 45 کروز مسلمان واقعی مسلمان ہیں اور ذرا فرمائیے، کیا عراق پر حملے کے بعد ہم ایک ارب 45 کروز مسلمان نبی اکرم ﷺ کے امتی رہ جائیں گے؟

(نوت: یہ کالم عراق پر امریکی حملے سے قبل لکھا گیا)



اونٹی فارتھو، خیرا

اس وقت جی ہاں رات کے اس آخری پھر بھی پاکستانی جیلوں میں ایسے سینکڑوں ہزاروں لوگ قید ہیں جو پیدائش سے صد یوں پہلے ہی بد نصیب ہو چکے تھے، پہلے تاریخ کے دھنے لگے میں ان کے دادا، ان کے دادا کے دادا اور پھر ان کے دادا بھی ہے کس، مجبور اور لاچار پیدا ہوئے پھر ان کے باپ ہاری، مزارعے، مصلی، مراثی، ترکھان، موچی اور درزی کی شکل لے کر پیدا ہوئے اور آخر میں ان لوگوں نے جنم لیا، مستر یوں، کسانوں، ہزاروں، ماشروں اور کفرکوں نے اور پھر زندگی کی چکی میں پتے پتے اور نظام کی بد بودار نالی میں بتبے بتبے یہ لوگ جیلوں میں بیٹھ گئے۔ جہاں یہ لوگ اب 21 دیں صدی سے ہزاروں سال دور غلاموں کی طرح انسانی اور غیر انسانی زندگی کی زار ہے ہیں۔ یقین کجھے یہ لوگ اس لئے جیلوں میں بند ہیں کہ ان کے مقدموں کی بیرونی کرنے والا کوئی نہیں، دنیا میں کوئی شخص نہیں جوان کے لئے عدالت کا دروازہ کھکھا سکے، جوان کے لئے دکیل کی فیس بھر سکے، جوریہ رکی مخفی گرم کر کے ان کے لئے تاریخ لے سکے اور جو ہر کارے کو دس میں روپے دے کر ان کی روپیکار جیل تک پہنچا سکے لہذا یہ لوگ جیلوں میں پڑے کسی ایسے سورج کا انتظار کر رہے ہیں جو ان پر آگ کی بجائے پھول بر سا سکے۔ لیکن مجھے یقین ہے ان کی زندگی میں کوئی ایسا دن، کوئی ایسا سورج طلوع نہیں ہوگا، ان کے ہاتھوں سے سکھوں نہیں گرے گا، ان کی زندگی کی چکلی میں پستی سانسوں کو آزادی نصیب نہیں ہوگی، رہائی نہیں ملے گی کیونکہ تقدیر کی ایف آئی آر میں ان کے خلاف تمدن جرم درج ہیں، جرم نمبر وون ان لوگوں نے اس ملک میں جنم لیا، جرم نمبر نو یہ من میں منی کا چیخ لے کر پیدا ہوئے اور جرم نمبر تحری ان کو جب بھی موقع ملا انہوں نے چھوٹا جرم کیا اور یقین کیجھے ملک کے قانون میں ان تینوں جرام کی ایک ہی سزا ہے۔ عمر قید۔

یہ بہت ہی نابکار اور ناخبار لوگ ہیں۔ ذرا دیکھئے یہ لوگ کن جرموں میں پکڑے گئے مسجدوں سے جوتے چوری کرتے، تصور والے سے روپیاں چھینتے، کھبوں سے بلب اتارتے، درخت کاٹتے، پرس چھینتے، سائکل اٹھاتے، کریانے کی دکان توڑتے، مرغی بجون کر کھاتے، جیب کاٹتے اور فائل آگے پیچے کرنے کا معاف نہ طلب کرتے اور بس لہذا آج یہ لوگ برسوں بلکہ دہائیوں سے اندر ہیں اور ان لوگوں میں بعض ایسے

لوگ بھی شامل ہیں جنہیں پولیس نے گرفتار کیا تو ان کی جیبوں سے پندرہ گرام چس یا ہیر و نکل کی ایک "پڑی" بدآمد ہوئی اور کچھ تو ایسے بھی ہیں جن سے فتح پر سونے یا لیٹ کر کسی پلک پارک کی گھاس خراب کرنے کا جرم سرزد ہوا اور میں تو ایک ایسے شخص سے بھی واقف ہوں جس نے اس جرم میں تین سال قید بھلی کر کے کئے نے ایک وکیل صاحب کی کیتا کی طرف میلی آنکھ سے دیکھا تھا۔

یہ ہیں ان لوگوں کے جرم، یہ لوگ آج جیل کی قیدی زمین پر لیت کر آزاد آسمان کی طرف دیکھتے ہیں اور پھر اس آسمان سے یہ پوچھتے ہیں "کیا ہم واقعی اسی جرم کی سزا بھگت رہے ہیں جو ہم سے سرزد ہوا؟" آسمان انہیں جواب نہیں دیتا، آسمان بھی ایسے حقیر لوگوں کو جواب نہیں دیا کرتے جو صرف حلیبے اور نہیں نقصے انسان دکھائی دیتے ہوں جو انسان نہ ہوں صرف انسان نہ ہوں۔" ان کے اس سوال کا جواب میرے پاس ہے۔ دنیا کی کوئی قیدی زمین پر تناہو کا کوئی آزاد آسمان ان کے سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ صرف میں دے سکتا ہوں ان لوگوں کا جرم بہت سی تھیں ہے ان لوگوں نے پاکستان میں رہ کر چھوٹے چھوٹے جرم کئے تھے۔ ان لوگوں نے بھی اگر آبدوزوں کے ٹھیکوں میں 33 لاکھ ڈالر رشوت لی ہوتی، اگر ان لوگوں نے بھی باعث ہزار روپ تاخواہ میں 14 ظاہری اور پچاس سانچھے خیفر پلاٹ خریدے ہوتے، اگر انہوں نے بھی آسٹن شہر کے پوش ایریا میں کروڑوں روپے کا گھر لیا ہوتا، اگر یہ بھی ملک سے بھاگ کر امریکہ چلے گئے ہوتے، اگر ان کا جرم بھی ایک ایسا کیفیت ہو جائے تو اسی ایک ایسا کیفیت ہو جائے اگر یہ بھی افریقی میں حکومت پاکستان کی اپیل پر گرفتار ہوتے، اگر یہ بھی ایف آئی اے کی گھرانی میں واپس پاکستان آتے تو آج ہاں آج یہ سارے گلرک، ماسٹر، مزدور، ترکھان اور مستری بھی سہالہ ریسٹ ہاؤس میں ہوتے، آج ان لوگوں کو بھی جن کے باپ موچی، مراثی، مصلحی، مزارے اور ہاری تھے اور جن کے دادا، جن کے دادا کے دادا اور پھر جن کے دادا کے بھی دادا پتی تقدیری کی ایف آئی آر میں لا چاری، مجبوری اور بے کسی لکھوا کر آئے تھے ان لوگوں کو بھی منزل و اثر مل رہا ہوتا، جوالات میں بھی، جیل میں بھی انہیں بلند پریشر کی دوائیں، شیوکا سامان، اسٹری شدہ کپڑے، نرم ملائم سلیپر، گاؤں، کتابیں اور اخبار مل رہے ہوتے، اور ان کی اہلیہ بھی عدالت سے انہیں ایکرناہ کپڑے اور ریفر بیگری فراہم کرنے کی درخواست کر رہی ہوئی۔ بس یہ لوگ ناپکار بھی تھے، ناپکار بھی اور چھوٹے بھی کہ یہ اس ملک میں رہ کر کوئی بڑا جرم نہ کر سکے۔

یہ چھوٹے، ناپکار اور ناپکار لوگ پوچھتے ہیں، ہمارا ملک کہاں ہے، ہماری عاداتیں، ہمارے بچ، ہمارے وکیل، ہمارا قانون اور ہمارا انصاف کہاں ہے، یہ لوگ بے وقوف اور بدھو ہیں انہیں اب تک معلوم نہیں ہوا، ان کا ملک تو ابھی بناہی نہیں، ان کی عاداتیں تو ابھی تخلیق ہی نہیں ہو سکیں، جوڑیشل اکیڈمیوں نے تو ابھی وہ بچ ہی نہیں بنائے جن کے ماتحت پر لکھا ہوا "اولی فارنحو، خیرا" ابھی یونیورسٹیوں اور کالجوں نے بھی وکیل ایجاد نہیں کئے جو غربت، بے کسی اور بے چارگی کا کیس لڑیں، ابھی وہ قانون، وہ دستور اور وہ تعزیر ہی مرتب

نہیں ہوئی جوان خبروں اور ان تھوڑے کوزندگی کے کثہروں سے باعزمت ہری کر اسکے۔
 خدا کی قسم اس کو قانون کہتے ہوئے دل سوسو بار سہم جاتا ہے جو بڑوں کو سزا بھی پکنک کی طرح دیتا
 ہے اور اس انصاف کو انصاف کہتے ہوئے آنکھوں سے خون پیلتا ہے جس کے کالوں میں غربت کی سکیاں
 نہیں پہنچتیں اور اس عدل کو عدل کہتے ہوئے دل دکھتا ہے جس کے پاس طاقتوروں کے لئے تو ہزاروں
 دروازے ہوں لیکن سکزو روں کے لئے بھی ہاں، بے بس، مجبور اور لا چار لوگوں کے لئے لاکھوں گروزوں
 دیواریں، خدا کی قسم اس ملک کو بے انسانی کھا جائے گی۔



بے قانون معاشرے کے بے زبان لوگ

فوجی اقتدار سے ذرا پہلے کراچی کے ایک اخبار میں سندھ اسپلی کے سابق پیکر نواب مرزا سے متعلق ایک خبر شائع ہوئی تھی۔ خبر کے مطابق نواب مرزا جب پیکر تھے تو انہوں نے اپنا ایک دانت مرمت کرایا تھا جس کا بل مرزا صاحب نے معمول کے مطابق اسپلی میں جمع کرادیا۔ جب یہ بل مختلف دفتروں سے ہوتا ہوا اے جی آفس پہنچا تو اس وقت کے اکاؤنٹنگ جزل بل دیکھ کر پریشان ہو گئے کیونکہ پیکر صاحب نے اپنا دانت دوالہ کے 28 ہزار روپے میں مرمت کرایا تھا۔ اے جی صاحب نے اعتراض لگا کر بل واپس بھجوادیا۔ پیکر آفس سے جواب آنے سے پہلے ہی نواب مرزا صاحب اپنی ذمہ داریوں سے سکدوش ہو گئے جس کے بعد بل کا معاملہ کھلائی ہیں جس کی وجہ سے نواب مرزا صاحب کی "ریاست" کے چار ماہ بعد اے جی صاحب کو "اوپر" سے بل ادا کرنے کا حکم مل گیا۔ فائل مکھوائی گئی، اعتراضات واپس لے لئے گئے اور مرزا صاحب کو دو لاکھ 28 ہزار روپے ادا کر دیئے گئے۔ اس واقعے کے چار ماہ بعد کسی روپرڑ کو بھلک پڑ گئی یوں اگست 99ء کے آخر میں یہ خبر کراچی کے ایک اخبار میں شائع ہو گئی۔ دو تجربہ کو پنجاب کے اخبارات نے اسے روپرٹ کر دیا اس طرح نواب مرزا صاحب اور ان کا دوالہ کے 28 ہزار روپے کا دانت پورے ملک میں موضوع بحث بن گیا۔

مجھے یہ تو یاد نہیں یہ دو تجربہ تھا، چار تجربہ یا پھر آٹھ تجربہ لیکن مجھے اتنا یاد ہے لاہور کے ایک سینئر وکیل کے گھر ڈنر تھا جس میں ہمارے آج کے وزیر قانون جناب خالد راجحہ بھی مدعو تھے وہاں اس خبر کا تذکرہ ہوا تو تمام شرکاء محفل نے نہ صرف کھل کر اس روپے کی نہ مدت کی بلکہ اس بدعتوانی میں ملوث افراد کو سزا دینے کا مطالبہ بھی کیا، وہیں کسی سینئر وکیل نے فرمایا تھا جب تک حکمران طبقہ کا روپیہ تبدیل نہیں ہوتا، حکمرانوں اور عوام کی مراعات برابر نہیں ہوتیں، انہیں بھی وہ مسائل برداشت نہیں کرنے پڑتے جو عام شہری کو درپیش ہیں یہ ملک نہیں ہو سکتا۔ مجھے یاد ہے جناب خالد راجحہ صاحب نے اس سینئر وکیل کی بھرپور تائید کی تھی۔ اب دلچسپ اتفاق دیکھنے اس کھانے کے نہیک ایک ماہ بعد نواز شریف کی حکومت فتحم ہو گئی۔ وزیر اعظم کی جگہ چیف ایگزیکٹو نے لے لی، وزیر اعلیٰ کے سارے اختیارات گورنر کو مل گئے اور جناب خالد راجحہ پنجاب کے وزیر قانون ہن گئے۔ وہ تقریباً ذیزدھ برس تک بغیر رکے، بغیر مجھے اپنی ہاتھی اور جسمانی صلاحیتوں کے مطابق

کار و بار سلطنت چلاتے رہے یہاں تک کہ 2001ء کا مارچ آگیا جناب خالد راجح حاج ادا کرنے کے لئے چاڑی مقدس روانہ ہو گئے وہاں انہیں سینے میں درد کی شکایت ہوئی، وہ ہسپتال داخل ہو گئے، ڈاکٹروں نے ان کا معائنہ کیا اور انہیں اسنجو پلاسٹی کا مشورہ دے دیا۔ ان کے شاف نے اسی وقت پنجاب گورنمنٹ سے رابطہ کیا۔ ایک نیکس موسول ہوئی اور حکومت پنجاب نے فوراً 2 لاکھ 51 ہزار روپے سعودی عرب بھجوادیے۔

اب چہال تک جناب خالد راجح کی علاالت کا معاملہ ہے مجھ سیت اس ملک کے چودہ پندرہ کروڑ لوگوں کو ان سے ہمدردی ہے اللہ تعالیٰ انہیں جلد صحت کامل عطا فرمائے لیکن اگر مساوات کی نظر سے دیکھا جائے۔ اگر انہی حقوق کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جائے تو یہ خبر پڑھ کر اس ملک کے چودہ پندرہ کروڑ لوگوں کو اپنے مقدر اپنے نصیب پر ماتم کرنا چاہیے۔ ذرا سوچئے جس ملک میں ذیہ لاکھ لوگ دل کی انجامی خطرناک بیماریوں کا شکار ہوں، جس ملک میں دل کے چار ہزار مریض فیسٹ ہونے کے باعث بالی پاس نہ کر سکتے ہوں اور ان میں سے جی ہاں ان چار ہزار لوگوں میں سے بھی سے تمیں مریض روزانہ ہسپتاوں سے میلوں دور مرجاتے ہوں۔ جس ملک میں گروہوں کے نو ہزار مریض رہتے ہوں، صرف راولپنڈی میں خون صاف کرنے والے چار ہزار چھوٹے سو مریضوں کو فنڈر زکی کی کا بہاءہ بنا کر حکومت نے حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہو اور ان میں سے بھی پچھیک تک مریض مر جاتے ہیں جی ہاں گردے کے دھرمیں جنہیں نوازا شریف نے نی زندگی دی تھی اور نی حکومت نے آ کر جن سے زندگی کی وہ ساری امیدیں چھین لی تھیں اور وہ مریض روزانہ اس حکومت کے دل میں رحم پیدا کرنے کی دعا کرتے ہیں لیکن اپنی دعا قبول ہونے سے پہلے ہی دم توڑ دیتے ہیں لیکن اسی حکومت کا ایک وزیر جب بیمار ہوتا ہے تو نیکس کے ایک گلڑے پر دو لاکھ 51 ہزار روپے سعودی عرب بھجوادیے جاتے ہیں کیا یہ مذاق نہیں؟

دنیا جانتی ہے خالد راجح صاحب ایک کھاتے پیتے خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ وہ ایک نامور قانون دان ہیں۔ پریکش کے دوران وہ ایک ایک کس کا لاکھوں روپے معاوضہ لیتے تھے، وہ بائی کورٹ کے نجی بھی رہے ہیں۔ دنیا یہ بھی جانتی ہے کسی شخص کو دل کا عارضہ اچانک لاقن نہیں ہوتا، ایک عرصہ پہلے اس کی علامات ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ راجح صاحب کو بھی اپنی بیماری کا لازماً علم ہو گا، وہ پاکستان میں اپنا علاج بھی کر رہے ہوں گے۔ دنیا یہ بھی جانتی ہے اگر کسی مریض کو اچانک بارٹ ایک ہو جائے تو اس کے لئے چوبیں گھنے مشکل ہوتے ہیں۔ اگر مریض وہ چوبیں گھننے گزار لے اگر اس کی دھرنیں معمول پر آ جائیں تو پھر اس کے لئے فوری آپریشن ضروری نہیں رہتا۔ میں ایسے اپنے مریضوں کو جانتا ہوں جنہوں نے تین سال بعد اپنے پلاسٹی کرائی تھی۔ لہذا اگر دیکھا جائے تو خالد راجح صاحب یہ علاج پاکستان واپس آ کر بھی کر سکتے تھے۔ وہ اتنے غریب بھی نہیں تھے کہ وہ اپنی جیب سے اپنے علاج کا خرچ برداشت نہ کر سکتے۔ اگر وہ اس وقت وزیر نہ ہوتے تو ایک دکیل کی حیثیت سے کیا وہ یہ دو لاکھ 51 ہزار روپے اپنی جیب سے ادا کرتے؟ یقیناً کرتے تو

پھر سوال پیدا ہو جاتا ہے جب ایک وکیل خالد راجحہ اپنا علاج اپنی جیب سے کر سکتا ہے تو ایک وزیر خالد راجحہ اپنی سفروں پر اسی کا بل کیوں ادا نہیں کر سکتا؟

جناب خالد راجحہ تو قانون داں ہیں، انہوں نے تو پوری زندگی قانون پڑھا اور پڑھایا ہے، اب بھی وہ قانون بناتے اور اس پر عملدرآمد کرتے ہیں لہذا اگر میں ایک قانون داں وزیر قانون سے یہ سوال پوچھ لوں تو میرا خیال ہے یہ گستاخی نہیں ہوگی۔ ”جناب غالی جو حکومت ایک عام مریض کو دو ہزار 51 روپے نہیں دیتی وہ حکومت اپنے ایک وزیر کے دل کا درود دوڑ کرنے کے لئے دولائہ اکیاون ہزار روپے بھجوادیتی ہے..... کیا وہ حکومت منصف ہے؟ کیا وہ حکومت انصاف پر قائم ہے؟ ایک بے قانون معاشرے کے بے زبان لوگ اپنے وزیر قانون سے جواب مانگ رہے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی جواب مانگ رہے ہیں کہ جہاں کوئی قانون نہیں ہوتا وہاں وزیر قانون جواب نہیں دیا کرتے۔“



اس ملک کو عدالتیں بچا سکتی ہیں

میرا مشورہ سن کر نوجوان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے میز پر بکھرے کاغذ جمع کئے، ترتیب سے فائل میں لگائے، گورنمنٹ کیا اور آنسو پوچھتے ہوئے بولا "میں عدالت نہیں جاسکتا، میرا خیال ہے مجھے وہاں بھی انصاف نہیں ملتے گا" میں اس کی بچگانہ تاویل پر نہیں پڑتا، وہ مجھے اس وقت ایک ایسا فریادی لگا جسے حالات کے بے رحم تھیز سے پوری طرح شکلی بنا چکے ہیں اور وہ اپنے ہی سامنے سے ڈر رہا ہے، میں نے لطف لینے کے لئے اس کے خدشے کی وجہ دریافت کی، اس نے رومال سے آنکھیں پوچھیں اور گلوکر آواز میں بولا "تجھے صاحب اس کے کاس فیلو ہیں" میں پھر نہیں پڑتا۔ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے، تم حق پر ہو، تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی، کاغذات اور ثبوت تمہارے پرہیز سے ہیں، پھر کوئی کسی کا کاس فیلو ہو، دوست، عزم یا لارشتے دار کیا فرق پڑتا ہے، تم اپنا کیل لے کر جاؤ، رٹ کرو اور انصاف لے کر گھر واپس آ جاؤ۔"

اس نے کمر کرسی کی پشت سے لگائی نائکیں سیدھی کیں اور اسی دلکھی لجھے میں بولا "فرق پڑتا ہے سر، میرے باس نے مجھے معطل کیا تو میں سیدھا ڈائریکٹر جزل کے پاس گیا، میں نے باس کے آرڈران کے سامنے رکھے اور ہڑے احترام سے عرض کیا۔ سر باس نے مجھے جو منذر پاس کرنے کا حکم دیا تھا وہ کمپنی اور اس کا مالک نادہنده تھے لہذا میں نے انکار کر دیا۔ باس نے مجھے معطل کر دیا۔ سر میرے ساتھ انصاف کریں، ذی بھی نے میری درخواست رکھی، میں دو مینے چکر لگاتا رہا لیکن مجھے انصاف نہ ملا، پڑھ کرایا تو معلوم ہوا ذی بھی میرے باس کا خالہ زاد بھائی ہے۔ میں جیزیر میں کے پاس چلا گیا، کیس ان کے سامنے رکھا۔ انہوں نے بھی تسلی دے کر بھجوادیا مگر کچھ نہ ہوا، معلوم کرایا پڑھا جیزیر میں میرے باس کے ہڑے بھائی کا کورس میٹ ہے۔ ہڑا بھائی اگلے ہی روز جیزیر میں کے پاس چلا گیا تھا جس کے ساتھ ہی میرا کیس فانکلوں کے قبرستان میں دفن ہو گیا۔ میں سیدھی کے پاس گیا، وہ باس کا دوست تھا، میں وزیر کے دربار میں حاضر ہوا، وزیر کا پر شف ثنا ف آفیسر باس کا ہمسایہ رہا تھا۔ میں نے گورنر کو درخواست دے دی۔ درخواست ان تک پہنچی ہی نہیں، دوسرا آفیسر باس کا ہمسایہ رہا تھا۔ میں نے بھی درخواست پہنچی، تیسرا درخواست بھیجی وہ بھی غائب ہو گئی، چوتھی درخواست میں نے ایک جلسے میں خود گورنر صاحب کے ہاتھ میں پکڑا۔ انہوں نے اپنے شاف کو تھما دی، وہاں سے بھی وہ غائب ہو گئی۔

میں نے پتہ کرایا، معلوم ہوا ذاک اور درخواستوں کی "سکرینچ" کرنے والا آفیسر میرے باس کا کزن ہے، اس کے بعد میں دوسرے اداروں کی طرف دوڑ پڑا۔ اخبار کے دفتروں میں گیا، رپورٹروں نے میرے باس کے خلاف خبریں چھاپنے سے انکار کر دیا۔ قوی احتساب یورو میں گیا۔ ان لوگوں نے یہ کہہ کر درخواست واپس کر دی "یہ کیس ہمارے دائرہ اختیار میں نہیں آتا"۔ مقتب اعلیٰ کے دفتر گیا، انہوں نے سرومنز بیوقل کا راستہ دکھا دیا۔ وہاں گیا، انہوں نے پہلے دفتر میں اپیل کریں "کا حکم دے کر واپس بھجوادیا۔ اب آپ کے پاس آیا ہوں تو آپ ہائی کورٹ میں جانے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہے آپ یہ مشورہ کیوں دے رہے ہیں؟"

وہ ذرا سی دیر کے لئے خاموش ہوا، مجھے اس کی آنکھوں میں ہزار خداوں کے درد دکھائی دیجے۔ "میں آپ کی نیت پر شک نہیں کر رہا۔" وہ دوبارہ گویا ہوا "لیکن میں جانتا ہوں میرا باس روزانہ آپ کے ساتھ واؤ کرتا ہے اور آپ میری مدد کر کے اسے ناراض نہیں کرنا چاہتے" میرے اوپر گھزوں پانی پڑ گیا، میں نے ڈبے سے ٹشوکھینچا اور ماتھے پر رگڑ کر بولا۔ "بندہ میں آپ کو تر خانہ نہیں رہا، میں تو بس اتنا چاہتا ہوں آپ کو انصاف ملے اور صرف کورٹ ہی ایک ایسا دروازہ ہے جہاں سے آپ کو آپ کا حق مل سکتا ہے۔" اس نے گردن لفی میں ہلا دی "مجھے نہیں یقین، میرے باس کے کمرے میں ایک تصویر لگی ہے، وہ کالج کی یونیفارم میں ایک نوجوان کے ساتھ ہے، دوتوں نے ایک دوسرے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے ہیں، میرا باس ہر ملاقاتی کو یہ تصویر دکھاتا ہے، دوسرے نوجوان پر انکی رکھتا ہے اور نہایت فاتحانہ انداز سے پوچھتا ہے اسے پچھا نہیں یہ کون ہے، ملاقاتی پر یہاں ہو کر تصویر پر نظریں گاڑھ دیتا ہے تو وہ مکار جادو گر نہیں کی طرح ہنتا ہے اور پھر ہی، ہی، ہا، ہا کی سروں میں بتاتا ہے۔" یہ پنجاب کے چیف جش ہیں، میرے کلاس فیلو ہیں، جوانی میں بہت غریب ہوتے تھے، یہ کوٹ بھی انہوں نے میرا ہی پہن رکھا ہے، میں نے کل رات انہیں کے ساتھ ڈنر کیا، بڑے یار پاش تم کے بندے ہیں، کہہ رہے تھے یار تم ملتے ہی نہیں، اب آپ خود بتائیں کام ہی اتنے زیادہ ہوتے ہیں بندہ روز روز کیے مل سکتا ہے۔ ہا، ہا، ہی، ہی، ہی۔"

نوجوان قائل اٹھا کر رخصت ہو گیا لیکن میں دیر تک، بیٹھا رہا، سورج غروب ہو گیا۔ اندھیرا سرک کر اندر داخل ہو گیا۔ میں بیٹھا رہا اور سوچتا رہا "اس ملک میں کوئی ایسا ادارہ ہے، جس پر لوگوں کا اعتماد باقی ہو، جس کے بارے میں لوگوں کو یقین ہو وہ وہاں جائیں گے تو ان کے ساتھ انصاف ہو گا، وہاں ان کی درخواستوں کے راستے میں کوئی بھائی، کوئی سالا، کوئی بہنوئی، کوئی کزن، کوئی کورس میت، کوئی کلاس فیلو، کوئی بھساپ، کوئی عزیز، کوئی رشتے دار اور کوئی دوست حائل نہیں ہو گا۔ وہاں فتحی مظلوم کی مظلومیت اور ظالم کے ظلم کے مطابق ہوں گے، وہاں ہر چھوٹے بڑے کے لئے دروازہ کھلا ہو گا۔ میں جوں جوں سوچتا گیا میرے کمرے میں اندھیرا بڑھتا گیا۔ مجھے محسوں ہوا بد بودار پانیوں کے اس سمندر میں ایک بھی ایسا جزیرہ نہیں جس

پر محنتی اور صاف ہوئیں چلتی ہوں، جس کے کناروں کی مٹی کا رنگ بدبو میں تحلیل نہ ہوا ہو، کوئی ایسا ادارہ کوئی ایسا عہدہ باقی نہیں جس کی توقیر، جس کی فیر جانبداری محفوظ ہو، جس پر لوگوں کا اعتماد، لوگوں کا یقین باقی ہو۔“

میں نے سوچا، ہم نے کسی ایک آدھے ادارے کو کزنوں، سالوں، بہتیوں، کورس میٹوں اور کلاس فیلوؤں سے آزاد نہ کیا، پاک نہ کیا تو اس ملک کا کیا بنے گا، ایک برف تھی جو میری ریڑھ کی ہڈی میں بہہ رہی تھی۔ آگ کا ایک شعلہ جو میرے دماغ کی طرف انہوں نے تھا۔ میں نے سوچا سیالاب اور آبادی کے درمیان صرف عدالت ہی ایک دیوار پیچی ہے اگر وہ بھی گر گئی تو کچھ نہیں پچے گا، میں انھا، میں نے بتی جلالی، کمرے میں روشنی بھر گئی، میں بلب کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ میں نے فیصلہ کیا میں چیف جنس آف پاکستان سے ملوں گا اور ان سے درخواست کروں گا ”سراب اس ملک کو صرف عدالتیں بجا سکتی ہیں، خدا کے لئے انصاف کو بھائیوں، کزنوں، دوستوں اور کلاس فیلوؤں سے بچالیں یہ ملک نجی جائے گا۔“



النصاف دکان، فیکٹری یا دفتر نہیں ہوتا

دونوں حضرات کھانے کے بعد خوش گپیوں میں مشغول تھے، تیر انھیں آیا۔ اس نے دونوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا اور ذرا سے تیز لبجے میں بولا۔ "خُنفیس میرا ملزم ہے، میں انصاف کے لئے دہائی دیتا ہوں۔" نسبتاً طویل القامت شخص کے چہرے پر بخت آگئی، اس نے جالی لبجے میں سامنے بیٹھے صاحب کو حکم دیا "اے ابو حسن کھڑے ہو جاؤ۔" ابو حسن کا چہرہ سرخ ہو گیا تاہم وہ خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ فریادی کو عرض کرنے کا حکم دیا گیا، فریادی نے مقدمے کی تفصیل بتائی، "لزم" کو جواب دعویٰ کی اجازت دی جئی، دعویٰ اور جواب دعویٰ کا سلسلہ چلا تو چند ہی لمحوں میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا۔ فریادی کی فریاد جھوٹی نکلی، ابو حسن سچا ثابت ہو گیا۔ مقدمہ خارج کروالا گیا۔ فریادی اپس چلا گیا اور ابو حسن بیٹھا گیا۔ خوش گپیوں کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ طویل القامت شخص نے ابو حسن سے پوچھا "حضرت میں نے جب آپ کو کھڑا ہونے کے لئے کہا تو آپ کو برالگا۔" ابو حسن نے قبض سے فرمایا اور طیم لبجے میں بولا "امیر المؤمنین عربوں میں کنیت عزت اور ادب کے لئے بولی جاتی ہے، جب میرے خلاف مقدمہ دائر ہوا تو آپ کو مجھے ملزم سمجھنا چاہیے تھا، آپ کو چاہیے تھا آپ مجھے علی کہہ کر پکارتے لیکن آپ نے مجھے ابو حسن کہا، مجھے تیک گزراء، میری کنیت بیانے سے آپ کا انصاف مشکوک ہو جائے گا۔ فریادی سمجھے گا، آپ نے رعایت سے کام لیا۔" جی ہاں یہ دونوں حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت علیؓ تھے۔

ذراغور سمجھے اسلام کا نظام عدل کتنا سادہ، کتنا شفاف اور کتنا فوری تھا۔ کوئی بھی فریادی، کسی بھی وقت، کسی کے خلاف کسی بھی عدالت میں پیش ہو سکتا تھا اور اس کا "لزم" خواہ حضرت علیؓ جیسا جلیل القدر صحابی اور رسول اللہ ﷺ کا چھاڑا اور داما دی کیوں نہ ہو اور وہ امیر المؤمنین کے دستِ خوان پر کیوں نہ بیٹھا ہو۔ وہ اسی وقت کنہرے میں کھڑا ہوتا تھا، اسی وقت پیشی ہوتی تھی، کیس دائر ہوتا تھا، ثبوت مانگے اور پیش کے جاتے تھے، گواہیاں ہوتی تھیں اور فیصلہ ہو جاتا تھا اور آخر میں ملزم اعتراض بھی کرتا تھا تو کیا خوب کرتا تھا۔" حضور جب ملزم تھا تو آپ نے میرا نام عزت سے لیا، یہ انصاف نہیں، یہ منصف کے شایان شان نہیں۔" واد، واد، واد، قربان جاؤں سو ہنے رب اور اس کے سو ہنے نبی ﷺ کی تربیت پر۔

اسلام دنیا کا پہلا مذہب تھا جس نے عدالت کا رواجی نظام توڑا، جس نے کہا عدالت کے لئے عمارت کی ضرورت نہیں، نجع کے پاس کاغذ، قلم اور دوامت کا ہوتا بھی ضروری نہیں۔ نجع کے لئے اوقات کا رجی بھی ضروری نہیں، منصف کے لئے کسی لبے چوڑے بیکھ کی بھی ضرورت نہیں، بس مدئی آئے، ملزم بلا یا جائے، دونوں کے بیان اور گواہیاں ہوں اور اللہ کے قانون کے مطابق فیصلہ دے دیا جائے اور ہاں ملزم کون ہے، دعویٰ کس نے دائر کیا۔ یہ سوچنے، یہ دیکھنے والا شخص نجع نہیں ہو سکتا، یہ ہے اسلام کا نظام عدل، جب اسلام اور اسلام کے خلماں چار براعظموں پر پھیل چکے تھے۔ اس وقت بھی فیصلے اسی قانون، اسی اصول کے مطابق ہوتے تھے۔ خداۓ راشدین کے بعد بھی یہیوں ایسے خلیفہ آئے جنہیں قاضی نے کہرے میں لا کھڑا کیا۔ ان کے خلاف فیصلے بھی دیئے لیکن دو دو تین تین براعظموں پر پھیلی سلطتوں کے "مطلق العنان" چیف اگزیکٹو کو چوں کرنے کی ہمت نہ ہوئی لیکن پھر وہی ہوا۔ یہ نظام عدل بھی اسلام کے دوسرے سہری اصولوں کی طرح اہل مغرب کے پاس چلا گیا اور ہمارے پاس صرف عدالتیں، نجع، ریڈر، ہر کارے، اہل مند، وکیل اور کتابیں رہ گئیں۔

مجھے چند روز پہلے پنجاب کے وزیر قانون رانا انجیاز الحمد کا انتزدیو پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ وزیر موصوف نے انتزدیو میں فرمایا، حکومت عدالتی اصلاحات پر دو ارب روپے خرچ کرے گی، اس خطیر رقم سے جوں کے حالات کا رہبتر بنائے جائیں گے۔ نئی کورس بیٹھیں گی، نئے بار روم بنائے جائیں گے، عدالتی ریکارڈ کپیوٹرائزڈ کیا جائے گا۔ جوں ہی آسامیاں بڑھائی جائیں گی، فیلی کورس میں اضافہ ہو گا اور ساریں کے لئے پیش کنز یور کورس بنائی جائیں گی۔ یہ ساری باتیں تھیک ہیں۔ کورس بھی بننی چاہیے، بار و مری میں بھی اضافہ ہونا چاہیے، جوں کی تعداد بھی بڑھنی چاہیے، کپیوٹر بھی آتا چاہیے اور جوں کے حالات کا رجی بھی بہتر ہونے چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انصاف بھی تو ہوتا چاہیے، عدل ہوتا بھی تو نظر آتا چاہیے۔ آپ عمارتیں تو بنادیں گے، ان میں کپیوٹر اور ایئر کنڈیشن بھی لگا دیں گے۔ ایک کی جگہ دو اور دو کی جگہ تین نجع بخادیں گے لیکن کیا اس نظام عدل کو انصاف کی قوت بھی فراہم کریں گے۔ اسے عدل کرنے، احتساب کرنے کی خوبی بھی عطا کریں گے، جو نظام عدل حکمران کو کرپٹ کہنے، رشتہ خور، اقرباً پرور، اختیار سے متجاوز اور مطلق العنان ثابت کرنے کے لئے اس کی معزولی کا انتظار کرتا ہو۔ اس کے اقتدار کے خاتمے کا منتظر ہو آپ اس نظام کو کہاں تک تھیک کر سکتے ہیں۔ وہ بینظیر جو اقتدار کے خاتمے پر کرپٹ ثابت ہوئی، وہ میاں منظور و نو، وہ عارف نکلی، وہ یوسف رضا گیلانی، وہ جاوید ہاشمی، وہ شہباز شریف اور وہ نواز شریف جواب کرپٹ ثابت ہو رہے ہیں انہیں اقتدار کے دراں عدالتوں میں طلب بھک نہیں کیا گیا، وہ اس وقت مجرم کیوں نہیں نہ کھڑائے گئے جب انہوں نے جرم کیا تھا، جس نظام میں سکت نہ ہو کہ وہ حکومت کے ایک معمولی کارندے کو کہرے میں کھڑا کر سکے، اسے سزا نہ سکے، جو نظام حکومت کے ایک بچوں سے ماچس کی ڈبی جتنے وزیر کو بلا کر سرزنش نہ کر سکے، آپ اس کوئی عمارتوں اور قسمی کپیوٹروں کے ذریعے تھیک کر لیں گے؟ جس ملک میں حکومت سے اختلاف پر

منتخب عوای نمائندے پر یہ کورٹ پر حملہ کر دیتے ہوں، چیف جسٹس فارغ ہو جاتے ہوں، ہائی کورٹ کے نجی نوکری سے نکال دیئے جاتے ہوں اور جگوں کے گھروں پر پولیس بھادی جاتی ہو اس ملک کے نظام عدل کوئی عمارتیں اور قائمی کپیوٹر نیٹس چاہیے۔ اسے آزادی چاہیے، اسے اختداد، جرأت اور فیصلے کی قوت چاہیے لیکن آپ اسے دو ارب روپے، خنی عمارتیں اور کپیوٹر دے رہے ہیں رانا صاحب ہماری عدالتوں اور ہمارے نظام عدل کے پاس جو نہیں آپ پہلے اسے وہ تو دیں۔ فٹ بال کے لکھاڑی گوجر اور جراہوں سے پہلے فٹ بال چاہیے ہوتا ہے۔

آپ نظام عدل کو حضرت عمرؓ جیسی جرأت اور حضرت علیؓ جیسی نظر نہیں دے سکتے، نہ دیں لیکن آپ کم از کم اسے امریکہ اور یورپ جتنی آزادی تو دے دیں۔ اس امریکہ، اس یورپ اور اس جاپان جتنی آزادی جس میں صدر ہو، وزیر اعظم ہو، بادشاہ ہو، ملکہ ہو یا وزیر عدالتیں انہیں طلب کرتے دری نہیں لگاتیں وہ پیش ہوتے ہیں۔ اپنے خلاف فیصلے سنتے ہیں اور پھر سزا بھینتے ہیں لیکن ہمارے ملک میں حکمران طبقے کو تو انصاف سے بالآخر قرار دیا جاتا ہے۔ انہیں جھوں، عدالتوں اور متدموں سے اشتہنی دے دیا جاتا ہے جبکہ باقی تمام تر لوہاروں، ترکھانوں کو پچھریوں میں بلا کرٹگی زمین پر بھاوا دیا جاتا ہے۔ رانا صاحب اس ملک میں ہر جرم کے ڈاٹے کسی نہ کسی شکل میں حکومت اور سلطنت سے مل جاتے ہیں لہذا آپ سلطنت اور حکومت کو عدالتی نظام سے الگ کر کے معاشرے میں انصاف قائم نہیں کر سکتے۔ انصاف ایک سوچ، فیصلے کی ایک آزادی کا نام ہوتا ہے۔ جس ملک میں یہ آزادی، یہ سوچ موجود ہو وہاں عمارتوں، کپیوٹر و کیلوں کے بغیر بھی انصاف قائم ہو جاتا ہے لیکن جہاں یہ سوچ اور آزادی نہ ہو وہاں آپ جگوں کی تعداد میں پانچ سو گنا اضافہ کر دیں، سارے ملک کی عمارتوں میں عدالتیں قائم کر دیں اور تمام منصبوں کو کپیوٹر کی فیکٹریاں لگا دیں تب بھی اس معاشرے میں انصاف قائم نہیں ہو گا کیونکہ انصاف، انصاف ہوتا ہے دکان، فیکٹری یا دفتر نہیں ہوتا۔



آخری پشتہ

نج، وہ بھی تھے جنس سر عبدالرشید، 15 اگست 1947ء کو گورنر جنرل کی تقریب حلف برداری تھی، قائد اعظم تشریف لائے اور سید ہے گورنر جنرل کی نشست پر جلوہ افروز ہو گئے۔ سر عبدالرشید نے پہلو بدلا، قائد کے سید ٹری کو اشارہ کیا، سید ٹری صاحب جنس کے قریب تشریف لائے اور سر عبدالرشید نے ان کے کان میں سرگوشی کی قائد اعظم گورنر جنرل کی نشست پر بینہ گئے ہیں۔ یہ پرونوکول کی خلاف ورزی ہے، ابھی انہوں نے حلف نہیں اٹھایا، وہ اس نشست کے حق دار صرف حلف اٹھانے کے بعد ہوں گے۔ سر عبدالرشید یہ کہہ سکتے ہیں، جو لوگ سر عبدالرشید کو جانتے تھے وہ یہ بھی جانتے تھے قانون کی خلاف ورزی ہو، آئین کی، شابطے کی یا روایت کی اگر جنس صاحب کے نوٹس میں آگئی تو پھر دنیا کی کوئی طاقت انہیں ریماند کس دینے سے نہیں روک سکتی، معافا۔ اگر روکنے کا ہوتا تو وہ روک دیتے، نوکرنے کا ہوتا تو نوک دیتے، ڈانٹنے کا ہوتا تو ڈانٹ دیتے اور سزا دینے کا ہوتا تو سزا دیتے یہ بخیر کہ مقاطب فرعون ہے یا موئی۔ پاکستان میں تھا کوئی جو قائد اعظم کی غلطی کی نشانہ ہی کر سکتا؟ ہاں اگر تھے تو سر عبدالرشید تھے، قائد ملت خان لیاقت علی خان نے چائے پر جایا، وزیر اعظم کا خصوصی اپٹیجی درخواست لے کر حاضر ہوا، چیف جنس آف پاکستان کو اطلاع دی گئی، سر عبدالرشید نے اسی اپٹیجی کے ہاتھ پیغام بھجوادیا۔ ”میں معافی چاہتا ہوں، اس نجح کو زیر اعظم کے ساتھ چائے نہیں پینی چاہیے جس کی عدالت میں حکومت کے مقدمات پیش ہوتے ہیں۔“ اپٹیجی چلا گیا تو اپنے شاف کو بلا کر حکم دیا۔ آئندہ اس قسم کی دعوت آئے تو میرے نوٹس میں لائے بخیر معدت کر لی جائے۔“

کاربنیکس بھی ایک نج ہی تھے، چیف جنس آف پاکستان اے، آر کاربنیکس پوری زندگی ہوئی کے ایک کرے میں گز ادی، اصول کا یہ عالم تھا، لا ہور بار کوئل نے سالانہ عشا تیار دیا۔ چیف جنس صاحب کو دعوت دی گئی، پوچھا وہاں کون کون ہو گا، بتایا قیلڈ مارشل محمد ایوب خان ہوں گے، پوچھا میں کہاں بیٹھوں گا، بتایا گیا آپ صدر صاحب کے ساتھ بیٹھیں گے، آپ نے انکار کر دیا۔ درخواست کی گئی پرونوکول کا تناقض ہے، اس میں رو و بدل خلاف قانون کبھی جائے گی۔ فرمایا تھیک میں صدر صاحب کے ساتھ بیٹھ جاؤں گا لیکن میری ان کے ساتھ تصوی شکھنچی جائے، پوچھا، اس میں کیا مصلحت ہے، فرمایا، عدالت میں فیڈریش کے

خلاف کیس آتے ہیں۔ اگر چیف جسٹس آف پاکستان کی صدر کے ساتھ تصور چھپ گئی تو عدالت کی غیر چانبداری پر حرف آئے گا، عوام کا عدالتون پر اعتقاد متحرزل ہو جائے گا۔

ہماری تاریخ میں صرف یہی دونوں نبی میں جن کے دام پر داغ تھا اور نہ ہی دستار پر کالک۔ یہ لوگ تھے جنہیں وقت اپنی چوکٹ پر جھکا رکا اور نہ ہی حالات سمجھوتے پر مجبور کر سکے۔ یہ لوگ تیرگی میں اصول، انصاف اور عدل کاشت کرتے رہے۔ خود فنا ہو گئے لیکن قانون اور عدل کو بقا دے گئے۔ یہ کارپلکس اور سر عبدالرشید جیسے لوگ تھے جن کے دم قدم سے پاکستان میں عدیلہ سراحتا کر چلتی رہی، کسی انقلاب میں اس کی طرف اٹھنے کی جرأت نہ ہوئی، کسی آنکھ نے ترچھا ہو کر اس کی طرف نہ دیکھا لیکن پھر تی ہاں دوسرے اداروں کی طرح پاکستان کے اس مقدس ادارے کی ایشیں بھی گرنا شروع ہو گئیں، اس پر بھی ترچھی نظریں پڑنے لگیں۔ اس کی طرف بھی الگیاں اٹھنے لگیں۔ سر عبدالرشید اور اے آر کارپلکس کے ماتحتون نے سرہاہان مملکت کے ساتھ تصوریں بھی کھنپوائیں، کھانے بھی کھائے اور دوسرے بھی کئے۔ نج و زیر اعظم کے شوہر سے بھی ملے اور اباجی سے بھی، جوں نے وزراء اعلیٰ سے درخواست کر کے اپنے بچوں کو ڈائریکٹ اے ڈی سی بھی لگوایا۔ باتحدوں میں چھپ کر وزیر اعظم کے نیلی فون بھی سنے اور پنجاب میں رہ کر جیوں کے لئے بلوچستان کے ڈویسائیں بھی بنوائے لہذا پھر وہ وقت آگیا جب دیکھوں نے بچوں کے خلاف مظاہرے کئے، کوئیں کا بایکاٹ کیا، پریم کورٹ پر عدالت ہوا اور اب جی ہاں اب یہ سورت حال ہو چکی ہے میں الاقوامی اخبارات سیف الرحمن اور جسٹس قیوم کی گفتگو کی میٹن ریلیز کر رہے ہیں اور پوری دنیا سن رہی ہے کہ احصاپ کا جیتر میں ہائی کورٹ کے ایک نج کو اپنی مرضی کا فیصلہ نانے کی درخواست کر رہا ہے اور پھر آخر جی ہاں آخر میں پریم کورٹ کا فلنج جسٹس قیوم کے فیصلے کو جانبدارانہ قرار دے دیتا ہے، نج بچوں کے خلاف ریمارکس دے دیتے ہیں، یہ ہم کس طرف جا رہے ہیں۔

پاکستان میں کوئی ایسا ادارہ ہے ہم جس کے لئے کیسی قسم کی کھاسیں، علماء کرام بد نام ہوئے، سیاستدان کر پٹ ثابت ہوئے، یوروگریٹ رسول ہوئے، پولیس بے اعتماد ہوئی، اساتذہ کرام سے یقین اٹھا اور اب آخر میں عدیلہ کے بیٹاروں سے بھی مٹی جھڑنا شروع ہو گئی۔ عدالتون سے عدالتون کے خلاف فیصلے آنے لگے، ہم کہاں جا رہے ہیں، ہمارا یہ سفر کہاں پہنچ کر ختم ہو گا۔ خدا کے لئے ہوش کے ناخن لیں، اداروں کی رگوں میں جز کوکڑتے کیسر کا علاج کریں ورنہ ناخن رہیں گے اور نہ ہی ہوش، دنیا میں کہاں ایسا ہوتا ہے؟ دنیا میں کوئی ملک ہے جہاں سیاستدانوں کے بچوں سے رابطہ ہوں، جہاں یوں سیاسی دباؤ میں فیصلے ہوتے ہوں، جہاں یوں کیمیشیں نکلتی ہوں، جہاں یوں پریم کورٹ ہائی کورٹ کے بچوں کے ہارے میں ریمارکس دینے پر مجبور ہو جاتی ہو؟ کہیں نہیں، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا! پھر یہ سب کچھ یہاں کیوں ہو رہا ہے؟ یقین ہی نہیں آتا یہ وہی ملک ہے جس میں کبھی سر عبدالرشید، اے آر کارپلکس اور جسٹس کیانی جیسے نج ہوتے تھے، جس میں ایسی

عدالتیں ہوتی تھیں جن کے قریب سے گزرتے ہوئے لوگ سروں پر ٹوپی رکھ لیا کرتے تھے اور جس میں خوف خدا رکھنے والے ایماندار لوگوں کو مجھ ساحب کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

یقین سمجھئے جب کسی ملک میں کرسی انصاف اور کمرہ عدالت کی طرف انگلی اٹھ جائے تو اس ملک میں کچھ نہیں بچتا کیونکہ عدالتیں سیلا بون کا آخری پش ہوتی ہیں اگر وہ بھی نوٹ جائیں تو پھر بستیوں کو کوئی نہیں بچا سکتا۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

ٹوٹے ہوئے جو تے

شاہ جی سے ایک عرصہ بعد ملاقات ہوئی۔ یہ اسلام آباد کی ایک بھیگ شام تھی۔ فضائیں ٹبر ایکورے لے رہا تھا۔ ہمارے مت، ہماری ناگ سے بھاپ نکل رہی تھی اور بھیلوں پر برف جم رہی تھی۔ ہم آہستہ آہستہ چل رہے تھے، شاہ جی اپنی سیاسی مجبوریاں بتا رہے تھے۔ وہ مجھے سمجھا رہے تھے، ایکشن کیا ہوتا ہے؟ میں سناجا رہا تھا، سردی اور بیزاری دونوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ رکے، درخت کے ساتھ ایک لگائی اور ناگ جھک کر بولے ”تم شاید مجھ سے اتفاق نہیں کرتے“ میں نے ہال میں سر ہلا دیا۔ مجھے واقعی ان سے اختلاف تھا، شاہ جی کی پوری زندگی ایک سیاسی جماعت میں گزری، انہوں نے پارٹی کے لئے ماریں کھائیں، جیلوں میں گئے، مقدمے بھیگتے، اقتدار بھی دیکھا اور نہیں بھی سنے۔ اس پارٹی نے بھروسے خالق کے ہاتھ نہیں ہمرا رکھ دیا۔ انہوں نے اس پارٹی کے نام پر لوگوں سے ووٹ لئے لیکن جب اسیلی میں پہنچ تو انہوں نے اپنی پارٹی اور اپنے ووڑوں سے بے وقاری کی، انہوں نے پیغماڑ گروپ بنایا، وزارتی اور اپنے نظریاتی مخالفین کی گود میں جائیئے۔

میں نے عرض کیا ”شاہ جی بات اصول کی ہے، آخر آپ نے لوگوں کو من دکھانا ہے؟“ شاہ جی نے قہقہہ لگایا، ان کے منہ سے ڈھیروں بھاپ نکلی اور دھنڈ کے وجود میں اتر کر جنگل میں گم ہوئی ”لوگ!“ شاہ جی تو والوں کے سائل میں گردن ہلاتے اور تھیک ہاتے رہے ”لوگ میری جان لوگ، وہ تو اصول پسند، وفادار اور با ضمیر سیاستدان کی بجائے ایک وزیر کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ وہ اپنے ایم این اے، ایم پی اے کو جلد سے چلد وزیر دیکھنا چاہتے ہیں۔ تم جانتے ہو میں نے پوری زندگی ایک سیاسی جماعت میں رہ کر گزار دی۔ میں اس پارٹی کا جنہدہ اخخار کر عوام کے دروازوں پر گیا۔ انہوں نے پارٹی کے نام پر مجھے ووٹ دیئے۔ میں نے اس پارٹی کے امیدوار کو شکست دی اس وقت میں جس کی حکومت کا حصہ ہوں۔ اب ہوتا تو یہ چاہیے تھا میرے ووڑ مجھے اسی پارٹی میں رہنے پر مجبور کرتے جس کے نکٹ پر میں کامیاب ہوا تھا لیکن دلچسپ سورجخال دیکھو، میرے پسپورٹر، میرے ووڑ روز میرے پاس آتے اور مجھے مشورہ دیتے ”شاہ جی زنانی کی قیادت چھوڑیں، چودہ ہر یوں کے ساتھ مل جائیں۔ تھڑی سی وزارت لیں، خود بھی موبیس کریں اور ہمیں بھی کرنے دیں۔“ اور

میں چودھریوں کے ساتھ شامل ہو گیا، حکومت بن گئی، مجھے وعدے کے مطابق وزارت مل گئی۔ پچھی بات ہے مجھے پریشانی تھی، میں اپنے آپ سے شرمند تھا، میرا خیال تھا، جلتے کے زیادہ تو لوگ میرے اس اقدام کو پسند نہیں کریں گے لیکن جب میں اپنے طبقے میں گیا تو لوگوں کا والہانہ پین دیکھ کر حیران رہ گیا۔ لوگ خوشی سے ناج رہے تھے، ڈھول نج رہے تھے، جھنڈیاں اور خوش آمدیدی بیز لگے تھے، لوگوں نے مجھے ہار پہنائے، میرے اوپر گل پاشی کی، گلے مل کر مجھے مبارک بادیں چیز کیں۔ تم یقین کرو ایک لاکھ دونوں کے اس جلتے میں مجھے ایک بھی ایسا شخص نہیں ملا جس نے مجھے لعن طعن کیا ہو، جس نے لوٹا بنتے پر میری مددت کی ہو۔ لوگ تو میرے اعزاز میں جلسے کر رہے ہیں، مجھے دعویں کھلارہ ہے ہیں۔"

شاہ جی رکے، انہوں نے ناگ کی اتنی وی بنائی۔ پاؤں درخت کے تنے پر جھایا اور سرد بجھے میں بو لے "وزریاستدانوں کا ضمیر ہوتے ہیں، سیاستدان دنیا کی ہر طاقت، کائنات کے ہر شخص کو ناراض کر سکتا ہے لیکن وزر کو کبھی خنا نہیں کرتا۔ لوٹوں کی فیکشہاں صرف عوام بند کر سکتے ہیں، عوام ہی وہ طاقت ہیں جو سیاستدانوں کو صراط مستقیم پر رکھ سکتے ہیں۔ آج کسی لوٹے یا سیاستدان کے وزر اس کا راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں، اسے گریبان سے پکڑ کر کہیں" جتاب ہم نے آپ کو اس لئے دوست نہیں دیئے تھے کہ آپ اسیلی میں پہنچ کر ہمارا سودا کریں۔ "تم بتاؤ کل کسی سیاستدان کو پارٹی بدلتے، فاروڈ گروپ بنانے اور وزارت کے عوض بننے کی جرأت ہو گی۔ شاہ جی رکے، بھاپ آگئی اور بنس لیا بو لے لگیں ہوئی، ہمارے وہر، ہمارے لوگ، ہمارے عوام بھی اتنے ہی لوٹے ہیں، اتنے یہ بے ایمان، اتنے ہی خود غرض اور اتنے یہ بے ضمیر ہیں جتنے ہم سیاستدان بے ضمیر، خود غرض، بے ایمان اور لوٹے ہیں، ذرا سوچو جب مائیں چور بیٹوں کے ماتھے چونے لگیں، بہن، بھائی، عزیز، رشتہ دار اور دوست احباب بے ضمیری اور بے ایمانی پر مبارک باد دینے لگیں گے اور وزریاستدانوں پر گل پاشی کرنے لگیں گے، انہیں ہار پہنائے اور دعویں دیئے لگیں گے تو پھر معاشرہ کیا شکل اختیار کرے گا۔" شاہ جی رکے، انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ٹھنڈی ہوئی نج آواز میں بو لے تم یہ باتیں نہیں سمجھ سکو گے، تم سیاستدان ہو اور نہ ہی کسی وزریاستدان کے سپورٹر، ان باتوں کو سمجھنے کے لئے سپورٹر بننا پڑتا ہے یا پھر سیاستدان، اس اندر چرگری کو غور سے دیکھنے کے لئے چکا ڈر کی طرح اندازنا پڑتا ہے پھر جا کر آسان زمین اور زمین آسان وکھائی دیتی ہے، یقین کرو لوٹے سازی کے عمل کو کوئی آئیں، کوئی قانون، کوئی ترمیم نہیں روک سکتی، اسے صرف اور صرف عوام روک سکتے ہیں صرف اور صرف وزر بند کر سکتے ہیں اور ہمارے وزر اور ہمارے عوام۔" شاہ جی نے ذرا سیور کو اشارہ کیا، وہ گاڑی آگے لے آیا، انہوں نے ہاتھ ملے اور پر جوش لجھے میں بو لے "افسوں چکا ڈر کے خار میں عوام بھی اتنے ہی چکا ڈر ہیں جتنے ان کے لیڈر، میرے دوست، نوٹے ہوئے جو تے پھٹی ایریوں کو ازالہ نہیں دے سکتے۔"



جمهور یے

عربوں کی عجیب روایت تھی، جب ان کا کوئی مشہور شخص جنگ میں مارا جاتا تو وہ اس کا بدل لینے تک رونے پر پابندی لگادیتے تھے۔ مثلاً غزوہ بدرا کو لیں، جنگ میں مشرکین کے 70 لوگ مارے گئے، ان میں ابو جہل سمیت قریش کے کئی نامور سردار شامل تھے جب یہ خبر مکہ پہنچی تو سرداران قریش نے رونے پر پابندی لگا دی۔ اعلان ہوا، ہم پہلے مقتولوں کا بدل لیں گے اور پھر رونے کی اجازت دی جائے گی، جس نے پابندی کی خلاف ورزی کی، اسے قبلہ سے نکال دیا گیا۔ یہ اعلان لاوھین کے لئے عزیزوں کی صوت سے زیادہ عجیب تھا۔ ان دنوں رات کے پہچھے پھر کسی عورت نے کسی دوسری عورت کی بیٹی کی آواز سنی، وہ انھی اور اس عورت کی تلاش میں تکل کھڑی ہوئی۔ رونے والی ایک بوڑھی خاتون تھی۔ عورت نے وہاں پہنچ کر وہ بات کہا "اماں کیا پابندی انھیں کیا۔" بوڑھی نے آنسو پوچھے اور تمہاری ہوئی آواز میں کہا "تم کیوں پوچھ رہی ہو۔" عورت نے جواب دیا "اماں بدر میں میرا بیٹا بھی مارا گیا تھا، میرا کیجھ غم سے پھتا جا رہا ہے، اگر پابندی اٹھ پھی ہے تو وہ دنوں مگل کر روتی ہوں، وہ مجھے کل سے دکھائی نہیں دیا، بنیت تو بس پرایا مال ہوتے ہیں، ہم انہیں پیدا ہی جنگلوں کے لئے کرتی ہیں۔" عورت نے سناتو وہ بھی سینے پر ہاتھ مار کر رونے لگی، بوڑھی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، عورت نے بھیکی آواز میں کہا "اماں تم رشتے میں میری پھوپھی لگتی ہو، میں نے جب سن تھا را عزیز ترین اونٹ کھو گیا تو میں جذبات پر قابو نہ رکھ سکی، آؤ میرے گلے گلو، میں تھا رے غم میں شریک ہوا چاہتی ہوں۔" یہ عربوں کی روایت تھی۔ ان کی عورتیں بیٹوں کا غم نلاٹ کرنے کے لئے اونٹوں اور بکریوں کا سہارا لیتی تھیں، پرانے گھروں، سیلا بیوں، طوفانوں اور آندھیوں کا ذکر کر کے جنگلوں میں مارے گئے بھائیوں اور بیٹوں کو روتنی تھیں، معلوم نہیں اس دور میں اس واردات کو کیا کہا جاتا تھا لیکن آج ہم اسے معاشرتی منافقت کہیں گے۔ اس قسم کی صورت حال کے لئے پنجابی میں بھی ایک محاورہ ہے جس کا اب باب کچھ یوں بتاہے۔ "بھائیوں کا نام لے کر اپنے بوانے فریڈر کو رو رہی ہے۔" میرا خیال تھا، یہ روایت شاید قدیم زمانوں تک محدود تھی، اب حالات بدل چکے ہیں، لوگ زیادہ بالغ انتہر، بکھردار اور بہادر ہو چکے ہیں لہذا انہیں

اب دکھ پینے کے لئے بکریوں اور اونتوں کا سہارا نہیں لینا پڑتا بلکن 10 اکتوبر کے بعد معلوم ہوا " اس عارضے " کا تعلق زمانے سے نہیں، یہ تو بنیادی طور پر منافق معاشرے کا مسئلہ ہے اور منافق معاشرہ چودہ سو سال پرانا ہو یا پھر 21 صدی کی جمکانی روشنیوں میں پروان چڑھا ہو لوگوں کے رد عمل، لوگوں کے روپے یکساں ہوتے ہیں۔

10 اکتوبر کے بعد کئی سیاسی تبدیلیاں آئیں، کئی فارود بگاں بنے، کئی لوگوں نے خفیہ مفادات کے لئے اپنی پارٹیوں سے خفیہ بے وفا بیان کیں، کئی لوگ مشوروں کے عہدوں پر بکے اور کئی لوگوں نے صرف " لا راوی " پر عمر بھر کی کمائی گئی میں پھینک دی لیکن یہ کوئی حرمت انگلیز بات نہیں تھی، ابتدائے آفرینش سے اہل ہوئے عہدوں پر بکتے اور اقتدار پر گرتے آ رہے ہیں۔ افسوسناک بات تو ان لوگوں کا موقف ہے۔ ان تمام لوگوں کا کہنا ہے " ہم نے یہ سب کچھ جمہوریت کی بھتکے لئے کیا " وہ یہ کہیے " جمہور یہے " یہی جو یہ تک نہیں جانتے جمہوریت اقتدار نہیں اپوزیشن کا نام ہوتا ہے۔ جس ملک میں جتنی بڑی اپوزیشن ہو وہ ملک اتنی ہی بڑی " جمہور یہ " ہوتا ہے اور جس ملک میں جتنی مختصر اپوزیشن ہو وہ ملک اتنا ہی " شہنشاہی " ہوتا ہے۔ جمہوریت کو اپوزیشن لیدر فیصل صالح حیات اور مسلم لیگی رہنمای خور شید زمان سے نہیں مشیر خور شید زمان اور وزیر فیصل صالح حیات سے خطرہ ہوتا ہے، چلنے یہ بھی مان لیتے ہیں، سیاست حصول اقتدار کا ذریعہ ہوتی ہے، وہ راست ہے جس پر چل کر لوگ سیالے اقتدار تک پہنچے ہیں۔ یہ تجھک ہے تو پھر آپ لوگ اس کا اعتراف کیوں نہیں کرتے؟ آپ لوگ یہ نہیں کہتے ہماں کوئی پارٹی، کوئی منشور اور کوئی سیاسی نظریہ نہیں، ہر وہ سیاسی نظریہ، ہر وہ منشور اور ہر وہ پارٹی، ہمارا منشور اور ہمارا نظریہ ہے جو ہمیں ایوان اقتدار تک لے جائے۔ آپ اپنی کارکردگی، اپنے فن کو جمہوریت کا نام کیوں دیتے ہیں۔ بھائیوں کا نام لے کر اپنے بوائے فرینڈز کو کیوں روٹے ہیں اور اونتوں اور بکریوں کو سامنے کھا کر اپنی خواہشوں، اپنی حرستوں اور اپنی تمناؤں کو آنسو کیوں پلاتے ہیں۔ آپ لوگ سامنے آ کر یہ اعتراف کیوں نہیں کرتے ہماری زندگی کا ایک ہی معتقد ہے " اقتدار "۔ آپ یہ کیوں نہیں کہتے چھپلی اور پاکستانی سیاست و ان اقتدار کے تالاب سے باہر نہیں رہ سکتے۔ یقین کچھ براہی کرنے والے اتنے برے نہیں ہوتے جتنے برے اس براہی کو اچھائی ثابت کرنے والے ہوتے ہیں۔



مینڈیٹ کو مینڈیٹ رہنے دیں

نومبر 2002ء کے انتخابات امریکہ کی تاریخ کے مشکل ترین ایکشن تھے۔ ڈیموکریٹس کی طرف سے الگور اور ریپبلکن سے بیش صد ارتنی امیدوار تھے۔ 7 نومبر کی رات اعلان ہوا، الگور نے فلوریڈا کا معزز کار لیا۔ لوگ خوش ہو گئے لیکن 8 نومبر کی صبح یہ خبر غلط نہیں۔ الگور کی جگہ بیش کی فتح کا اعلان ہو گیا۔ بیش کو فلوریڈا سے 1748 دونوں کی برتری حاصل تھی۔ الگور نے دوبارہ گنتی کی درخواست دے دی۔ 10 نومبر کو ایکسر گنتی ہوئی تو پہلے ہی ہے میں بیش کی برتری ایک ہزار 7 سو 48 سے 3 سو 27 رہ گئی۔ پوی دنیا کو محبوں ہونے لگا دوبارہ گنتی میں الگور جیت جائے گا۔ ڈیموکریٹس بھی اس بات سے پوری طرح آگاہ تھے۔ شاید اسی لئے انہوں نے فلوریڈا کی کاؤنٹیوں میں میاگی، بے ووارڈ، پام نچ اور والیا میں ہاتھوں سے گنتی کا مطالبہ کر دیا۔ 11 نومبر کو پام نچ میں گنتی شروع ہو دی، بیش نے یہ گنتی روپاً نے کے لئے فینڈرل کورٹ میں رشت دائر کر دی۔ ابھی کورٹ درخواست کا جائزہ لے رہی تھی۔ بیش پر یہ کورٹ چلا گیا۔ پر یہ کورٹ نے یہ کیم ویبر کو ساعت شروع کی اور 5 دسمبر کو جنس سائیلز نے الگور کے خلاف فیصلہ دے دیا۔ الگور دوبارہ فینڈرل کورٹ چلا گیا، پر یہ کورٹ نے فینڈرل کورٹ کے فیصلے معطل کر دیے اور 12 دسمبر کی رات وہ بجے حکم جاری کر دیا۔ "کسی ریاست میں دونوں کی دوبارہ گنتی نہیں ہو گی" یوں امریکہ کا بظاہر کامیاب صدر الگور ہار گیا اور ناکام دکھائی دیئے والا بیش جیت گیا۔

چارچ بیش اس وقت امریکہ کے صدر ہیں، انہیں قندار میں دوسال ہو چکے ہیں لیکن امریکی شہریوں کی اکثریت آج بھی الگور کو صدر سمجھتی ہے۔ لوگوں کا خیال ہے پر یہ کورٹ نظریہ ضرورت کے تحت فیصلہ نہ دیتی اور فلوریڈا کی صرف چار کاؤنٹیوں میں ہاتھوں سے گنتی ہو جاتی تو بیش ہار جاتا۔ امریکی شہریوں کی یہ بات درست دکھائی دیتی ہے کیونکہ بیش اور الگور دونوں کو ایتا لیں ایتا لیں دوٹ ملے تھے الگور کو 5 کروڑ 9 لاکھ 96 ہزار ایک سو 16 جبکہ بیش کو 5 کروڑ 45 لاکھ 6 ہزار ایک سو 69 دوٹ ملے۔ دونوں کے حساب سے الگور کو بیش پر 39 ہزار 9 سو 47 دونوں کی برتری حاصل تھی لیکن وہ ایکٹرول کالج میں مار کھا گیا وہاں بیش کو 271 جبکہ الگور کو 266 پاؤنٹس حاصل تھے۔ اب ذرا لوچپ صورتحال ملاحظہ کیجئے پر یہ کورٹ نے 12 دسمبر کو فیصلہ کر دیا اور 13 دسمبر کو الگور نے اس فیصلے پر رسالیم ختم کر دیا۔ اس نے بیش کے حق میں تقریر کی اور گوشہ گناہی

میں چلا گیا، الگور چاہتا تو پریم کورٹ پر چک یا بریف کیس کا الزم لگا سکتا تھا، وہ وفاق توڑنے کی دھمکی بھی دے سکتا تھا، وہ بھی کہہ سکتا تھا جس میں الگور نہیں ہو گا وہ حکومت نہیں چلے گی۔ لیکن الگور نے ایک محبت و ملن اور سچا سیاستدان ہونے کا شہوت دیا۔ اس نے اپنا کیریئرِ داؤ پر لگا مگر ملک، نظام اور پریم کورٹ کو زندگی بخش دی۔ اس کے مقابلے میں آپ اپنے سیاستدانوں کا روایہ ملاحظہ کیجئے، 18 اکتوبر کے تمام پاکستانی اخبارات میں مولانا فضل الرحمن کا بیان شائع ہوا، مولانا نے حافظ ریاض درانی کے گھر پر یہیں کافرنس میں فرمایا۔ جس حکومت میں متعدد مجلس عمل شامل نہیں ہو گی وہ زیادہ دیر نہیں چل سکے گی، ہم وزیر اعظم سے کم کسی عہد سے پرہذا کرات نہیں کریں گے، اگر ملک کو تقیم سے بچانا ہے تو ضروری ہو گا عوام کے مینڈیٹ کا احترام کیا جائے، متعدد مجلس عمل کی مخالفت کرنے والوں کو سوچنا ہو گا اگر ایم ایم اے کو دیوار سے لگایا گیا تو وفاق کو ناقابل حلانی نقصان پہنچے گا۔ اگر اس وقت اپنے فیصلے خود نہ کئے تو بگد دیش جیسے حالات پیدا ہو جائیں گے۔

ذریتھور کیجئے 2000ء میں 50 ریاستوں پر شمال امریکہ میں تو بگد دیش جیسے حالات پیدا نہیں ہوئے۔ اس امریکے جس کی ریاستوں میں روزانہ 26 ہزار فلمینس اتری اور اڑتی ہیں اس کے وفاق کو تو کسی حتم کا ناقابل حلانی نقصان نہیں پہنچا۔ بش سے 39 ہزار 9 سو 47 ووٹ زیادہ حاصل کرنے والے الگور نے تو دیوار سے لگائے جانے کا ٹکوہ نہیں کیا، دوبارہ گئی میں جنتے والے الگور نے تو بش حکومت کو "چند دنوں کی سہماں" ای ڈیکھی جائیں وہی، الگور نے تو عہد سے کم عہد سے پر بات چیت کا امکان رونہیں کیا۔ یہاں کیا سیاست ہے جس میں وزیر اعظم نہ بنائے جانے پر وفاق کو ناقابل حلانی نقصان پہنچ جاتا ہے۔ پارٹیاں دیوار کے ساتھ لگ جاتی ہیں، ملک تقیم ہو جاتا ہے اور بگد دیش جیسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ مجھے خطرہ محسوس ہوتا ہے اگر دس دس پندرہ پندرہ، پچاس پچاس سیٹوں والی تمام جماعتوں نے اس طرح سوچنا شروع کر دیا تو پھر سندھ میں بھی بگد دیش جیسے حالات پیدا ہو جائیں گے۔ پنجاب میں بھی کئی جماعتیں دیوار کے ساتھ لگ جائی گی۔ بلوچستان میں بھی قومی سوچ کو ناقابل حلانی نقصان پہنچے گا اور سرحد میں بھی تقیم کی لکھر پھر جائے گی۔ مولانا افتخار کوئی چیز نہیں، وزارت اعظمی بھی کسی تخت طاؤس یا سلطنت داؤ دی کا نام نہیں ہوتا۔ یہ سب بارش میں پڑے مٹی کے کھلونے ہیں۔ ذرا سی تیز بھوار آئی، تھوڑی سی ہوا چلی، معمولی سی دھوپ پڑی اور یہ ساری آن بان، شان خاک بن کر اڑ گئی۔ اصل بات، اصل چیز ملک ہوتے ہیں۔ مولانا ذرا سوچے جن لوگوں نے ملک میں بگد دیش جیسے حالات پیدا کئے تھے، جنہوں نے کبھی وفاق کو ناقابل حلانی نقصان پہنچایا تھا، وہ دونوں ہر اعظم بنتے ہیں کن پھر کیا ہوا، ایک بہر تاک انجام، ایک ناختم ہونے والا ہیں، یہ ہے وزارت اعظمی اور یہ ہیں وہ لوگ جو وزیر اعظم سے کم کسی عہد سے پر بات نہیں کرتے تھے۔

مولانا خدا کے لئے مینڈیٹ کو مینڈیٹ رہنے دیں اسے سزا نہ ہتا گیں۔



1988ء

وہ پیدائشی خدمت گار تھا، باشل میں اس کا کمرہ مسافرخانہ تھا۔ مہمان کسی کا ہوا، میزبان وہی ہوا۔ وہ لوگوں کی خدمت کرتا تھا، کھانا کھلاتا تھا، رہنے کی جگہ دیتا تھا، ان کے چھوٹے موٹے کام کرتا تھا۔ واپسی پر انہیں کرایہ بھی دیتا تھا۔ جب ہماری زندگی صرف کلاس روہڑا اور پچھر زمک محدود تھی وہ پورے کالج کا خادم تھا۔ ہمارے حقوق کے لئے بایکاٹ کرنا، اساتذہ کے ہتھوں رکوانے کے لئے ناز جلوانا، سیلیس تبدیل کرنا، پرچے منسون کرنا، یونیٹ کی بحالی کے لئے احتجاج کرنا اور پولیس کے ڈنڈے کھانا اس کی ذمہ داری تھی۔ اس ذمہ داری کی بجا آوری میں وہ جیل بھی گیا، کالج سے بھی نکلا گیا، ہم سب پڑھائی میں آگے نکل گئے، وہ یتکچے رہ گیا۔ 1985ء آیا تو اس نے ایکشن لڑنے کا فیصلہ کیا۔ نہیں بلکہ پولیس پر پہنچا، جلتے کے پچاس سانچھے ہزار لوگوں کے دروازے پر گیا، کسی کی شہوڑی پکڑی، کسی کے گھنٹوں کو ہاتھ لگایا اور کسی کے پاؤں میں نوپی رکھدی۔ اس کی محنت رنگ لائی اور لوگوں نے اسے دوڑ دے کر کامیاب کرایا۔ یہاں سے اس کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔ ایک ایسا دور جو پہلے سے مشکل، پہلے سے زیادہ سخت تھا، وہ لا ہور اور جلتے کے درمیان لٹک گیا، سچ وہ اسی پہنچتا، شام کو جلتے میں ہوتا، سینکڑوں ہزاروں لوگوں کی درخواستیں وصول کرتا اور سردارتوں کو گرم بستر سے نکل کر دوڑوں کے ساتھ تھانے جاتا، اس کا ذیرا چوبیں گھنٹے آباد رہتا، لنگر چلتا رہتا، بندہ کوئی ہو، کہیں سے بھی ہو، اسے بستر، کھانا اور چائے ملتی تھی۔ یہ تمام اخراجات وہ خود برداشت کرتا تھا، بے عزتی الگ ہوتی تھی، لوگ محلی پچھریوں میں اس کے کپڑے پھاڑ دیتے تھے، جس کا کام نہ ہوتا وہ اسے من پر لعن طعن کرتا، مخالف پارٹی سے اس کی دشمنی الگ شروع ہو گئی۔ دوبار قاتلانہ جملے میں بھی بال بال بچا۔ وہ جلتے کے ہر جنمازے اور ہر شادی پر بھی جاتا تھا۔ فتح بال کا سچ ہو یا رسم حقیقت اسکی موجودگی لازم ہوتی تھی، صلح صفائی کا معاملہ ہو یا میاں یوں کا جھکڑا اسے لوگوں کو وقت دینا پڑتا تھا۔ نیند، آرام اور تنفس اس کی زندگی سے خارج ہو گئی تھیں وہ ان تمام آلام، ان تمام مصیبتوں سے گزرتا رہا کیونکہ اس کا خیال تھا وہ اپنے لوگوں کی خدمت کر رہا ہے لیکن پھر 1988ء آگیا۔ اس بیان نو تھیں اور اسے کسی جرم کے بغیر گھر بخادیا گیا۔

وقت بدل گیا مگر اس نے خدمت چاری رکھی کیونکہ اس نے آئندہ ایکشن بھی لڑنا تھا۔ اس کا ذیرہ

آباد رہا۔ روئی، بستر، تھانہ، کچھری اور ٹاشی سب جاری رہا۔ ایکشن ہوئے وہ ہار گیا۔ اس نے سوچا اس کی خدمت میں کوئی کمی ہو گئی۔ وہ حلقے کو زیادہ وقت دینے لگا۔ بندہ آیا وہ بنیان میں تھا تو انھوں کے ساتھ چل پڑا، اندر چیری رات تھی، بارش تھی، دھوپ تھی یا سردی لوگوں نے جب بھی بلایا، وہ نگئے پاؤں ان کے ساتھ ہو گیا۔ یہ خدمت کام آئی، اگلی بار وہ منتخب ہو گیا لیکن ابھی وہ کامیابی کی خوشی ہی منا رہا تھا کہ اس بیان ٹوٹ گئی۔ اس نے سوچا، اس میں اس کا کیا قصور ہے۔ گزیز تو اور ہوتی ہے لیکن سزا اسے ملتی ہے بہر حال وہ دوبارہ خدمت میں جت گیا ایکشن ہوئے وہ ہار گیا لیکن اگلی بار پھر جیت گیا۔

یہ کہانی کسی ایک سیاستدان، کسی ایک عوامی خدمتگار کی نہیں اس ملک کی 129 سیاسی جماعتوں کے قریباً 17 ہزار 4 سو 12 سیاستدان انہی حالات، انہی مسائل کا شکار ہیں۔ یہ لوگ اقتدار سے باہر ہوں تو ووٹ کے لئے ایک ایک بندے کے پاؤں پڑتے ہیں۔ ایوان میں آجائیں تو پارٹی لیڈر شپ کے ہاتھوں ہریت اختاتے ہیں۔ ہیرو کریکی سے لڑتے ہیں، اپنا آپ بچانے کے لئے لوٹے بنتے ہیں۔ لوگوں سے بے عزتی کراتے ہیں، حکومت وقت سے ڈنڈے کھاتے ہیں، جیلیں بھجتے ہیں، احتساب کے بیٹھے میں بیٹھے جاتے ہیں لیکن اس سارے عذاب کے بدالے انہیں صرف دوازھائی سال ملتے ہیں اور پھر ان کے اوپر ”میرے ہم وطنو!“ کی پہان آگرتی ہے۔ یہ 58 نوبی کا شکار ہو جاتے ہیں، خدمت یہ کرتے رہتے ہیں، راتیں یہ جاگتے رہتے ہیں مگر اقتدار کے مزے وہ لوگ لوئے ہیں جن سے ویرے ہیں اور جونہ ہی ووڑوں کے سامنے جو ابده ہیں یوں اس ملک میں اگر کوئی طبقہ بے بس ہے، کوئی مظلوم ہے تو وہ سیاستدان ہیں، وہ یہ ایم پی اے، ایم این اے ہیں۔

ایسا کیوں ہوتا ہے، یہ لوگ اتنی بے عزتی کیوں کرتاتے ہیں۔ اس کی صرف ایک وجہ ہے، ان لوگوں میں ناقابلی ہے۔ یہ لوگ یہ نہیں جانتے اگر کلبازی کو لکڑی کا دستہ نہ ملے تو وہ فقط لوہے کا ایک لکڑا ہوتی ہے جس سے کوئی چیز کاٹنی جا سکتی۔ یہ لوگ ہمیشہ لوہے کو دستہ فراہم کر دیتے ہیں نیچتا یہ کلبازی درخت ہی پر برنسے لگتی ہے۔ یہ لوگ اگر بچنا چاہتے ہیں تو انہیں کچھ باتیں، کچھ چیزیں ملے کرنا ہوں گی بالکل یورپ، امریکہ اور مشرق بعید کے سیاستدانوں کی طرح جنہوں نے برسوں پہلے ملے کر لیا تھا۔ ہمارا تعلق کسی جماعت، کسی پارٹی سے ہو لیکن ہم اوپر سے نازل ہونے والی کسی طاقت کو قبول نہیں کریں گے۔ ہم حکومت سازی اور حکومت شکنی کے لئے صرف اور صرف جمہوری طریقہ اختیار کریں گے اور جب بھی ملک میں جمہوریت کے لئے خطرہ پیدا ہوا، ہم سب جمہوریت کی بقا کے لئے سیسے پلاںی دیوار ہیں جائیں گے۔ یقین کچھے صرف یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے جمہوریت بحال رہ سکتی ہے ورنہ یہ لوگ خود بھی اسی طرح خراب ہوتے رہیں گے اور یہ ملک بھی!

تاریخ نے ہمارے سیاستدانوں کو ایک اور موقع دے دیا، یہ لوگ اب بھی کوئی اجتماعی فیصلہ کر کے

اس ملک کو بیش کے لئے "میرے عزیز ہم وطن!" سے رہائی دلا سکتے ہیں۔ مثلاً یہ لوگ یہی فیصلہ کر لیں حکومت کوئی بھی بننے اسے پانچ سال پورے کرنے کا موقع یا جائے گا، ان پانچ سالوں کو ایک میں بدلتے والی ہر طاقت کا اجتماعی مقابلہ کیا جائے گا۔ مثلاً یہ لوگ یہی فیصلہ کر لیں 1973 کا آئین پرے کا پورا بحال ہو گا۔ مثلاً یہ لوگ یہی فیصلہ کریں آئندہ اس ملک کا ہر فیصلہ سیاستدان کریں گے صرف اور صرف سیاستدان! یقین کیجئے اگر اس بار بھی یہ فیصلے نہ ہو سکے تو 2004 کو 1988ء بننے دیں گے اگری، ہم ایف 16 کے عہد میں یونی سائکل بن کر زندگی گزارتے رہیں گے۔

(توٹ: یہ کالم 2002ء کے ایکشن کے بعد لکھا گیا)



حسِ حکمرانی

یو آن اور نگولیس بر طานوی وزیرِ اعظم نوئی بلیز کے بچے ہیں۔ یو آن 18 اور نگولیس 16 سال کا ہے۔ یہ دونوں برطانیہ کے سرکاری سکول ”لندن اور یورپی“ میں پڑھتے ہیں۔ نوئی بلیز اور ان کی الہیہ بچوں کی پڑھائی سے مطمئن نہیں تھے لہذا انہوں نے دیسٹرکٹ سکول کے اساتذہ کو ان کا نیوز مرکر کر دیا۔ یہ خبر جب اپوزیشن تک پہنچی تو اس نے آسان سر پر احتیاط کیا۔ اپوزیشن لیڈروں کا کہنا تھا وزیرِ اعظم کا یہ اقدام برطانیہ کے تعليمی نظام پر عدم اعتماد ہے۔ یہ سید ھی سادی منافقت ہے وزیرِ اعظم کے بچے تو نیوشن پر جیسیں لیکن عام بچوں کو سرکاری سکولوں تک محدود رہتا ہے۔ برطانوی اپوزیشن کا یہ اعتراض ایک زندہ، باخیر اور محبت وطن قوم کا روئی ہے۔ واقعی اگر وزیرِ اعظم کے بچوں کو نیوشن کی ضرورت پڑتی ہے تو اس کا مطلب ہے سرکاری نظام تعلیم اپنی خدمات پوری طرح انجام نہیں دے ہے۔ وزیرِ اعظم اپنے تعليمی نظام سے مکمل طور پر مطمئن نہیں ہیں لہذا انہیں یا تو فوری طور پر تعليمی نظام کی خاصیاں دور کرنی چاہیے یا پھر اپنی ناکامی تسلیم کر لئی چاہیے۔

اگر ہم برطانوی اپوزیشن کے اعتراض کو قوموں کی اخلاقیات کا فلسفہ تسلیم کر لیں تو یہاں سوال پیدا ہوتا ہے ”پھر ہم کیا ہیں؟“ کیونکہ پاکستان میں تو حکمران طبقے کا ہر دو عمل حکومتی کارکردگی پر عدم اعتماد ہوتا ہے مثلاً ہمارے ایک وزیر صحت امریکہ سے ڈپرین ملکوں کر کھاتے تھے۔ میں نے وجہ پوچھی تو افسوس سے بولے ”پاکستانی ڈپرین اڑنے پہنچیں کرتی۔“ میں نے عرض کیا ”حضور آپ اس سے اپنی منتشری کی کارکردگی کا اندازہ لگا لیجئے، لعنت ہو ایسے مجھے پر جو اپنے وزیر کو ڈپرین کی خالص گولی فراہم نہیں کر سکتا۔“ میں ایک دن بیٹھا اپنے وزراء تعلیم کے پروفیسر پڑھ رہا تھا۔ میں یہ دیکھ کر جہاں رہ گیا پچھلے 54 برس میں صرف دو وزیر تعلیم ایسے گزرے ہیں جن کے بچے پاکستان میں پڑھتے رہے۔ مجھے اس ملک کے سیاستدانوں میں سے صرف ایک شخص ملا جس نے اپنے بچے سرکاری سکول میں داخل کرائے باقی تمام بڑے سیاستدانوں کے بچے پر ایجوبہ سکولوں میں غیر ملکی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ مجھے پاکستان کی تاریخ میں ایک بھی وزیر، وزیر اعلیٰ، وزیرِ اعظم اور صدر تک نہیں ملا جس نے کسی سرکاری ہسپتال سے علاج کرایا ہو۔ زیادہ تر حکمران دانت تک صاف کرانے ملک سے باہر جاتے تھے، اگر انہیں بھی مجبوراً پاکستان میں علاج کرانا بھی پڑا تو وہ پرائیویٹ کلینیکس یا نجی ہسپتالوں میں داخل ہوئے، خاندانی منصوبہ بندی اور سماجی بہبود کے ایک وقاری وزیر کے ہاں چھٹے بچے کی

ولادت ہوئی تو اس وقت موصوف "بچے دو ہی اچھے" کے ایک سینما کی صدارت فرمائے تھے۔ میں نے اپنی ان آنکھوں سے وزراء قانون کو جوں کو نیلی فون کرتے دیکھا اور ایک وزیر داخلہ کو سائل کی رپٹ لکھانے کے لئے ایس ایس پی کو نیلی فون کرتے سن اور حد یہ ہے چند برس پہلے میں ایک دوست کے ساتھ لاہور کے اعلیٰ افسر کے دفتر میں داخل ہوا۔ ان دنوں صوبائی دار حکومت کی واڑ پالائی کا محلہ بھی انہیں کے پاس تھا۔ میں نے دیکھا موصوف منزل واٹر پی رہے تھے۔ جس ملک میں حالت یہ ہو، واڑ پالائی کے محلے کا سر براد نوئی کا پانی نہ پی سکتا ہو۔ آپ اس ملک کے مستقبل کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ میرا جھوٹی ہے آپ پاکستان کے کسی سابق یا موجودہ وزیر سے پوچھیں کیا آپ نے بھی پیک ٹرانسپورٹ میں سفر کیا۔ اگر وہ ہاں میں جواب دے دے تو بندہ اپنا سر پیش کر دے گا، بھیلی باہمیں چھوڑ دیں، آپ مواصلات کے موجودہ وزیر سے پوچھ لیں۔" کیا آپ ریل کے ذریعے سفر کرتے ہیں۔" آپ کو جواب سن کر دن میں تارے نظر آ جائیں گے، آپ چیزیں ماندہ کے گھر جا کر دیجئے لیں، آپ کو وہاں جزیز ملے گا، آپ وزیر ثقافت کے ڈرائیکٹر روم میں جھانک لیں آپ کو وہاں دور دور تک پاکستانی ثقافت نظر نہیں آئے گی۔ میں نے تو وزیر ثقافت کو جب بھی دیکھا پتلون، کوت اور ٹائی میں ملبوس دیکھا، تازہ ترین خبر بھی ملاحظہ کیجئے حکومت صدر، گورنر، وفاقی اور صوبائی وزراء کی سیکورٹی پولیس سے لے کر فون کے حوالے کر رہی ہے۔ ذرا غور کیجئے یہ سارے محمد بیار عوام کے خادم ہوتے ہیں لیکن عوامی اداروں پر ان کے اعتقاد کا یہ فالم ہے کہ یہ اس پولیس پر اختصار کرتے ہوئے ہیں جیسا کہ یہیں ہیں جس پر انہوں نے پورا ملک چھوڑ رکھا ہے۔ آپ بھی دیکھ لجھے وزیر خزانہ کا ذاتی اکاؤنٹ غیر ملکی بینک میں ہو گا۔

یہ ہے سرکاری اداروں پر سرکار کے اعتقاد کا عالم! جو لوگ 14 کروڑ کیلئے تعلیمی پالیسی بناتے ہیں وہ اپنے بچوں کو اس سے کوئوں دور رکھتے ہیں۔ جو ہسپتال بناتے ہیں خود اس میں بھی داخل نہیں ہوتے۔ عوام کے لئے جو ٹرانسپورٹ چلاتے ہیں اس میں خود سفر نہیں کرتے۔ جو ریلوے کی ترقی کے لئے دن رات کام کرتے ہیں، جو یہ اعلان فرماتے ہیں ہم نے ریل اور پیڑی کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا لیکن وہ خود ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہیں۔ جو ملک میں اس وامان کے دعوی کرتے ہیں وہ خود میانظموں کے بغیر باہر نہیں نکلتے اور جو عوام کو پاکستانی ہونے پر فخر کرنے کا درس دیتے ہیں وہ خود جرایہں تک اپورنڈ پہنچتے ہیں۔ کہاں ہوتا ہے دنیا میں ایسا! برطانیہ میں وزیر اعظم مریٹک میں بچس چائے تو وہ بھی گاڑی چھوڑ کر ترین میں دفتر چلا جاتا ہے، جس سکول میں معمولی پلبیر جارج کے بچے پڑھتے ہیں وزیر اعظم کے بچے بھی اسی سکول کے، اسی کلاس روم میں، اسی بیچر سے وہی کتابیں پڑھتے ہیں۔ جن بسوں پر باتھر روم صاف کرنے والے سوپر سفر کرتے ہیں وزیر ٹرانسپورٹ بھی انہیں بسوں میں دفتر آتے اور جاتے ہیں۔ عجیب بات نہیں ہم ان گوروں سے جمپوریت لینے کی کوشش تو کرتے ہیں۔ ان کے "ڈے ولشن" کی کاپی بھی کرتے ہیں۔ نام ڈک اور ہیری کے لجھے میں انگریزی بھی بولتے ہیں، پاپ بھی پیتے ہیں، سوٹ بھی پہنچتے ہیں، بکھی ملتان، بکھی بہاولپور اور بکھی راولپنڈی کو

ہر بنا نے کے نمرے بھی لگاتے ہیں لیکن ہم نے کبھی ان کی سوچ، ان کے روایوں اور نظام پر ان کے اعتقاد کو کاپی کرنے کی کوشش نہیں کی، ہم نے اچکن تو پہن لی، ہم نے شخصی آزادیوں، انسانی حقوق اور معاشرتی مساوات کے نمرے بھی لگائے لیکن ہمارے سینوں، ہمارے دلوں اور ہماری سوچوں پر زمانہ قدیم کے فرائیں کے سامنے اسی طرح قائم رہے۔ ہم اب عوام اور بادشاہ، آقا اور غلام کی تفہیم کا شکار ہیں۔ ہم آج بھی اسی دور میں زندہ ہیں جس میں حکمران اپنے اور اپنے خاندان کو دنیا کی بہترین اور عوام کو بدترین خلق سمجھتے تھے جس میں زمین کی ہر خوبی حکمران اور ہر خرابی رعایا کے لئے ہوتی تھی۔ جس میں حکمران خاکی ہو کر بھی اپنی فطرت میں "نوری" ہوتا تھا اور عوام "نوری" ہو کر بھی خاکی رہتے تھے۔ جس میں علم بادشاہ ہوں اور جہالت رعایا کے لئے ہوتی تھی۔

یقین کبھی مجھے اکثر محسوس ہوتا ہے ہم تو پیدا ہی اس لئے ہوتے ہیں کہ ہمیں دیکھ کر ہمارے حکمرانوں کی حس حکمرانی کی تسلیم ہو۔ انہیں اپنے حکمران ہونے کا احساس ہو، وہ اپنے عظیم ہونے، طاقتور ہونے اور بہترین ہونے کا لطف اٹھا سکس دنیا میں اس کے علاوہ ہماری کوئی ذمہ داری، ہمارا کوئی کام نہیں۔

کا بینہ

ہم سب پہلے امریکہ کا جائزہ لیتے ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ پچاس صوبوں پر مشتمل ہے جس کا جمیع رقبہ 96 لاکھ 31 ہزار 418 مربع کلومیٹر ہے۔ 2003ء کے اعداد و شمار کے مطابق امریکہ کی آبادی 29 کروڑ 30 لاکھ 27 ہزار 571 ہے۔ عالمی تجارت اور معیشت کے میں الاقوامی تنخیلے ثابت کرتے ہیں امریکہ کا نوٹل جی ڈی پی 11 کھرب ڈالر (10 اشاریہ 98) ہے۔ اس کا سالانہ بجٹ دنیا کا سب سے بڑا بجٹ ہوتا ہے، امریکی حکومت ہر سال ایک کھرب 196 ارب اور 60 ملین ڈالر کے لیکس متع کرتی ہے اور 2 کھرب 15 ارب 20 ملین اپنے شہریوں پر خرچ کرتی ہے لیکن آپ دلچسپ صورتحال ملاحظہ کیجئے پچاس صوبوں کے اتنے بہتے ملک، دنیا کی سب سے بڑی معیشت اور دنیا کی اولی نسبتی عسکری طاقت کی کا بینہ صرف 25 وزراء پر مشتمل ہے۔ اس ملک میں صرف پندرہ وزاریں ہیں اور یہ وزاریں اور یہ وزیر نہ صرف امریکہ کا نقام چلا رہے ہیں بلکہ واشنگٹن میں بینٹھ کر پوری دنیا پر اثر انداز بھی ہو رہے ہیں۔

امریکہ کے بعد آپ چین کی مثال لیجئے، چین آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے، اس کی آبادی ایک ارب 29 کروڑ 88 لاکھ 47 ہزار 1624 افراد ہے۔ رقبے کے لحاظ سے بھی یہ ایک بڑا ملک ہے، اس کا رقبہ 95 لاکھ 96 ہزار 960 مربع کلومیٹر ہے۔ اس کے 23 صوبے، 5 آزاد علاقوں اور 4 میوپل کار پوری شہر ہیں۔ معیشت کے لحاظ سے یہ امریکہ کے بعد دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔ 2003ء میں اس کا جی ڈی پی 6 کھرب 1449 ارب ڈالر تھا۔ اس کا سالانہ بجٹ 267 ملین ڈالر ہے لیکن اس ملک میں صرف 8 وزاریں اور 8 ہی وفاقی وزیر ہیں۔ چین میں صرف داخلہ، خارجہ، دفاع، فناں، تعلیم، انصاف، اکنامیں اور کمیشن آزاد ادارے ہیں، اگر ہم ان اداروں کے سربراہوں کو بھی وزیر تسلیم کر لیں تو بھی چین کی کا بینہ کی تعداد 34 بھتی ہے۔ برطانیہ ہمارا سابق آقا ہے، ہم آج تک اپنے نظام کی خرابی کا لازم برطانیہ کو دیتے آئے ہیں لیکن برطانیہ کے اپنے سیاسی نظام کی کیا پوزیشن ہے اس کا جائزہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں آبادی اور رقبے کے لحاظ سے برطانیہ ایک چھوٹا ملک ہے، اس کا رقبہ 2 لاکھ 44 ہزار 820 مربع کلومیٹر اور

آبادی 6 کروڑ 2 لاکھ 70 ہزار 17 فرود ہے تاہم اس کا جی ڈی پی ایک کمرب 664 ارب ڈالر ہے، اس کی حکومت ہر سال اپنے شہریوں پر 540 ارب ڈالر خرچ کرتی ہے لیکن اتنے بڑے بجٹ اور جی ڈی پی کے ملک کی کابینہ وزیر اعظم سمیت فقط 21 ارکان پر مشتمل ہے۔ جی ہاں برطانیہ کا پورا نظام 21 وزراء چلا رہے ہیں۔ بھارت ہمارا حریف اور پڑوی ملک ہے بھارت کا رقبہ 32 لاکھ 87 ہزار 590 مربع کلومیٹر ہے۔ اس کی آبادی ایک ارب 6 کروڑ 5 لاکھ 70 ہزار 607 فرود ہے۔ اس کے 28 صوبے اور 7 قبائلی علاقوں ہیں، اس کا جی ڈی پی 3 کمرب 2 ارب 20 ملین ڈالر ہے اور اس کا سالانہ بجٹ 148 ارب 30 ملین ڈالر ہے۔ اس بھارت کی کابینہ، 28 وفاقی وزراء اور 39 وزراء مملکت پر مشتمل ہے۔

ہم آتے ہیں اب پاکستان کی طرف پاکستان کا کل رقبہ (بری اور بحری سمیت) 8 لاکھ 3 ہزار 940 مربع کلومیٹر ہے۔ پاکستان رقبے میں بھارت سے چار گنا، چین سے 11 اشاریہ 19 امریکہ سے 12 گنا چھوٹا ملک ہے۔ پاکستان کی آبادی 15 کروڑ ہے۔ آبادی کے لحاظ سے پاکستان امریکہ سے 2 گنا، بھارت سے 7 گنا اور چین سے 18 اشاریہ 6 گنا چھوٹا ملک ہے۔ پاکستان کے چار صوبے ہیں۔ صوبوں کے لحاظ سے بھارت پاکستان سے 7 گنا، چین 6 گنا اور امریکہ 13 گنا بڑے ملک ہیں۔ پاکستان کا جی ڈی پی 317 اشاریہ 7 بلین ڈالر ہے، جی ڈی پی کے لحاظ سے بھارت پاکستان سے 10 گنا، چین 20 گنا، امریکہ 35 گنا اور برطانیہ ساڑھے پانچ گنا بڑا ملک ہے۔ ان تمام شعبوں میں ہم چین، امریکہ اور بھارت سے بہت پیچھے ہیں، اگر ہم کسی شبے، کسی فن میں بھارت، چین، امریکہ اور برطانیہ سے آگے ہیں تو وہ ہماری وفاقی کابینہ ہے، الحمد للہ ہمارے پاس 64 وفاقی وزراء، وزراء مملکت اور مشیر موجود ہیں۔ اگر ہم وزراء کے برابر رعایات پانے والے 26 پارلیمانی سکریٹریوں اور شینڈنگ کمیٹیوں کے 30 چیزیں میں کوئی ان میں شامل کر لیں تو یہ تعداد 120 ہو جاتی ہے۔ یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ وہ بھارت جو ہم سے آبادی کے لحاظ سے 7 گنا، رقبے کے لحاظ سے 4 گنا اور جی ڈی پی کے لحاظ سے 10 گنا بڑا ملک ہے اس بھارت کو 67 وزراء چلا رہے ہیں جبکہ ہمارے پاس اس سے کئی گنا چھوٹا اور محدود وسائل کا ملک ہے لیکن ہماری وفاقی کابینہ 64 وزراء پر مشتمل ہے۔ امریکہ میں 15 وزیر ہیں، چین میں 18 اور برطانیہ میں 21 ہیں لیکن ہم الحمد للہ 64 وفاقی وزراء اور وزراء مملکت کے مالک ہیں۔

میں چھپلے تین دنوں سے مختلف وزراء سے ایک سوال پوچھ رہا ہوں "آپ کو کتنے وزراء کے نام یاد ہیں" اب تک صرف ایک وفاقی وزیر ایسے نکلے ہیں جنہیں 17 وزراء کے نام یاد تھے باقی حضرات بخششل بارہ تیرہ وزراء تک پہنچ پائے۔ مجھے یقین ہے جناب شوکت عزیز اور صدر پرویز شرف بھی آج کل اسی مسئلے سے دور چار ہوں گے، انہیں اگر وزیر کا نام یاد ہوگا تو وہ وزارت بھول جاتے ہوں گے اور اگر وزارت یاد ہوگی تو وہ وزیر کی شکل و صورت کے بارے میں مٹھوک ہو جاتے ہوں گے۔ اسلام آباد میں حال یہ ہو چکی ہے وزیر

ہے تو اس کے لئے گاڑی، گاڑی ہے تو جنڈا نہیں، اگر جنڈا، گاڑی اور وزیر یعنیوں دستیاب ہیں تو ان کے لئے دفتر نہیں ہے، حکومت کو یہ تک معلوم نہیں کس وزیر کی وزارت کہاں ختم ہوتی ہے اور کہاں سے دوسرے وزیر کی حد شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کا بینہ میں چار پانچ ایسے وزیر بھی شامل ہیں جو آج تک اپنے دفتر نہیں گئے ان کی وزارت صرف اخبارات تک محدود ہے۔ وہ روز ایک تصویر کھینچاتے ہیں اور پھر تصویر کو اخبارات تک پہنچاتے پہنچاتے دن گزار دیتے ہیں، کچھ وزراء اپنے نام کے مبارکبادی پوستر اور بیزٹر لگوانے میں مصروف ہیں لیکن اس تمام وزارتی ہر بونگ کے باوجود یہ بات خوش آئند ہے، ہم نے 57 برس بعد ہی کسی ایک شبے، کسی ڈسپارٹمنٹ میں ترقی تو کی۔ ہم نے کسی ایک صنعت میں تو خوشحالی اور پیداواری صلاحیت پالی، مگر افسوس دنیا اس ترقی، اس کمال کے باوجود ہمیں پسمند ہیں، ہمیں غیر ترقی یافتہ کہہ رہی ہے۔



بہاولپوری کھسے

ہمارے بزرگ بتاتے ہیں یہاں راولپنڈی میں ایک مجرم ہوتا ہوا کرتے تھے، ایماندار تھے، شریف تھے اور وضع دار تھے، طبیعت میں عجیب طرح کا انسان اور مجرم تھا، کتنے کو بھی سُتھی کہتے تھے، کسی روز کسی ملزم کی سفارش آ جاتی تو مجرم صاحب کی عدالت کا رنگ ہی بدلتا جاتا، ہر بڑے پیار سے ملزم کی طرف دیکھتے اور مسکرا کر کہتے "چور پتہ، ویسے تو میں نے تمہیں دو سال قید دیتی تھی لیکن اب تمہاری سفارش آچکی ہے لہذا پتہ میں تمہارے لئے تین سال قید پامختقت لکھ رہا ہوں۔" ساتھ ہی جیب سے قلم نکالتے، ملزم کو دکھاتے اور ہر بڑے پیار سے کہتے "دیکھو چور پتہ یہ بڑا قیمتی قلم ہے، میں نے لندن سے دوسو پاؤند میں خریدا تھا، میں دوسرے ملزموں کی فائلوں پر چار آنے کی جیصل سے سزا لکھتا ہوں لیکن کیونکہ میرا سال تہارا سفارشی ہے لہذا پتہ دیکھو میں دو پاؤند کے قلم سے تمہاری فائل پر دھخنٹ کر رہا ہوں، اب تو خوش ہو ہاں۔" وہ فائل پر دھخنٹ فرماتے اور سپاہی کو مخاطب کر کے کہتے "پتہ سپاہی، یہ چور میرا پتہ ہے، اس کی سفارش بڑی تکڑی ہے، اسے چھاؤں چھاؤں میں جیل لے کر جانا اسے دھوپ نہیں لگتی چاہیے۔" یہ فرمایا کہی کری سے ائمۃ مجرموں کے کنہرے میں آتے، چور پتہ کو سینے سے لگا کر تھکی دیتے اور جیل کی طرف رخصت کر دیتے۔

یہ ماضی کا قصہ ہے، وہ مجرم صاحب بھی یقیناً ماضی کے دھنڈکوں میں گم ہو چکے ہیں لیکن ان کا "طریقہ واردات" ابھی تک موجود تھا، یہ طریقہ پہلے صرف راولپنڈی تک محدود تھا لیکن اب یہ تکنیک امریکہ تک پہنچ چکی ہے۔ امریکہ میں 13 جنوری سے پاکستان سمیت 25 ممالک کے شہریوں کی رجسٹریشن ہو رہی ہے، روز آئی این ایس کے دفتر میں سیکھزوں لوگوں کی قطار میں لگتی ہیں، امریکی الہاکار "مخلوک" لوگوں کی تصاویر اور فنگر پرنس لیتے ہیں، جن کے ہاتھوں اور چہروں پر دہشت گردی کے آثار نظر آتے ہیں۔ انہیں واپسی کا راستہ دکھا دیا جاتا ہے، پاکستان کا خیال تھا کیونکہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں جنگ مشرف نے امریکہ سے بڑھ کر امریکہ کا ساتھ دیا تھا لہذا امریکی حکام اب پاکستانیوں سے رعایت برتنیں گے لیکن جب امریکہ تمام گھوڑوں گھوڑوں کو ایک ہی چاکب سے باٹکنے لگا تو پہلے عوام اور پھر حکومت نے شدید احتجاج کیا۔ پاکستانیوں کی یہ سفارش امریکہ پہنچی تو امریکی حکومت نے آئی این ایس کے دفتر میں "پاکستانی پتروں" کے لئے

الگ کا ذخیرہ بنایا۔ ہمارے سفارتخانے کی نظر میں یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ ہمارے سفیر اور ان کے ساتھیوں کا کہتا ہے ”25 ممالک میں سے پاکستان واحد ملک ہے جس کے شہریوں کو الگ کا ذخیرہ کی سہولت فراہم کی گئی“ پاکستانی سفارتخانے اس کا ذخیرہ کوتاری ساز سفارتی کامیابی قرار رہتا ہے یقیناً یہ تاریخ ساز کامیابی ہو گی لیکن سوال یہ ہے کیا خصوصی ذیک کے بعد پاکستان کی ذات میں کی آج گئی؟ کیا امریکہ، میں پریشان پاکستانیوں کے سائل کم ہو گئے، جیسی ہرگز نہیں۔ پاکستانیوں کے خلاف ہونے والا سلوک تو اسی طرح جاری ہے پاکستان امریکہ سے یہ مطالبہ تو نہیں کر رہا تھا ”حضور آپ ہمارے لئے کسی دوسرے چاک کا بندوبست کریں، یہ ہماری تو ہیں ہے آپ جس چاک سے بندگوی شیوں، مصریوں اور کویتیوں کو ماریں وہی چھانٹا آپ ہماری پشت مبارک پر بھی برسا دیں۔ آخر ہم فرشت لائیں ہیں، ہم نے آپ کو افغانوں تک پہنچنے کا راست دیا تھا، طالبان اور عرب پکڑ پکڑ کر آپ کے حوالے کئے تھے۔ یہ ہماری بے عزتی ہے آپ ہمیں بھی اسی قطار میں کھڑا کر دیں جس میں ان ممالک کے شہری کھڑے ہیں جو دہشت گردی کے خلاف جنگ میں غیر جانبدار ہے تھے۔“ ہمارا مطالبہ یقیناً یہ نہیں تھا پھر معلوم نہیں امریکہ ہمارے ساتھ ”چور پتھر“ جیسا سلوک کیوں کر رہا ہے؟ شاید امریکی حکام اس مجرمیت سے واقف ہیں۔ شاید وہ ریاضت کے بعد واٹکن آباد ہو گئے تھے اور شاید انہوں نے پاکستانی طریقہ انصاف کی مجرمی فرمادی تھی، شاید اس لئے امریکہ ہمارے ساتھ چور پتھر فارمول استعمال کر رہا ہے۔ خدا کے بندوں کو اس سے کیا غرض اس کی کہدن پر میں یہیں کی پھری پھری پھری ہے یا پہلی کی، چھری جاپانی ہے یا فرانسیسی، دس روپے مالیت کی ہے یا سو پاؤڈر کی۔ اس بے چارے کی تو جان جا رہی ہے، وہ تو ذہن ہو رہا ہے۔ اگر کوئی اس بکرے سے کہے ”لو بھی بکرے ہم تمہارے لئے پیش چھری بنو اگر لائے ہیں۔ یہ صرف تمہاری گردن پر پھرے گی۔“ ذرا بتائیے اس بکرے کا کیا جواب ہو گا۔

ہم پہلے کی بات ہے ہمارے گاؤں میں مصلیوں کے لئے کئے گئے چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ کھیت کے مالک نے سب کو لارک جو تے مارے، جو تے کھانے والوں میں سے ایک لڑکا نمبردار کا کمی تھا، نمبردار دوسرے روز کھیت کے مالک سے آنکھ لایا، اس نے اسے لکا رکھ کر کہا ”اوے جب تمہیں معلوم تھا یہ میرا کی ہے تو پھر تم نے اس کے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا“ مالک نے ماٹھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ”چودھری صاحب میں نے تو جو تے مارتے ہوئے بھی آپ کے مرتبے اور مقام کا خیال رکھا تھا، میں نے باقی تمام مصلیوں کو چھتر مارے تھے لیکن اسے ڈھانی ہزار کا بھاؤ پوری کھسے مارا تھا اور وہ بھی صاف کر کے۔“



خوش نصیبی

کوئی ماتحت افسر بس سے بے عزتی کرنا کہر ہاں کلا، دفتر میں اس کا دوسرا کوئیگ بیٹھا تھا۔ ماتحت نے آتے ہی فائل پرے چھکلی، میز کو منہڈ مارا اور کرسی پر ڈھیر ہو کر بولا "میں اعانت بھیجا ہوں ایسی نوکری پر" کو لیگ نے گھبرا کر وجہ دریافت فرمائی، پریشان افسر غصے سے بولا "میں فائل لے کر مجھے کے کمرے میں گیا، فائل دکھائیں اس نے مجھے شٹ اپ کہہ کر دفتر سے نکال دیا، میں اعانت بھیجا ہوں ایسے افسروں اور ایسے دفتروں پر" کوئیگ نے قبچہ لگایا، فائل اٹھائی، جھاڑی اور میز پر رکھ کر بولا "تم بہت خوش نصیب ہو، بھیجا تمہاری بہت عزت کرتا ہے، وہ تمہیں صرف شٹ اپ کہتا ہے، میری طرف دیکھو، میں صحیح فائل لے کر اس کے کمرے میں گیا تو اس نے مجھے شٹ اپ بھی کہا تھا اور ایڈیٹ بھی۔" ہو سکتا ہے کوئیگ کی بات واقعی درست ہو، حقیقتاً "شٹ اپ" کا تمنہ و مول کرکے والا افسروں خوش نصیب ہے لیکن اس کا قیصلہ ہم تھوڑی دیر بعد کریں گے پہلے ہم صدر پرویز مشرف کے ساتھ امریکہ چانے والے وفد اور اس وفد کے ساتھ ایئر پورٹ پر ہونے والے واقعے کا جائزہ لے لیں۔

صدر پرویز مشرف کے ساتھ پاکستان سے مختلف لوگ امریکہ کے سرکاری دورے پر واشنگٹن گئے، جب یہ لوگ نیویارک سے واشنگٹن روانہ ہونے لگے تو ایئر پورٹ پر ان کی جامد تلاشی لی گئی۔ ان کے جو تے تک اتار کر دیکھے گئے۔ یہ سیدھی سادی زیادتی تھی۔ یہ لوگ سرکاری دورے پر تھے۔ امریکہ کے معزز مہمان تھے، خصوصی ویزے لے کر وہاں گئے تھے وفاقی وزیر تجارت جانب رزاق داؤ اور صدر کے پریس سکریٹری، حکومت پاکستان کے ترجمان اور آئی ایکس پی آر کے ڈائریکٹر جنرل مجرم جنرل راشد قریشی بھی ان میں شامل تھے۔ حکومت کے ان دو اہم نمائندوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا، امریکی ایجنسیوں کا یہ رو یہ اس قدر تاروا تھا کہ وفد میں موجود صحافیوں نے شدید احتیاج کیا۔ ایک ایڈیٹر نے حکومت کو تجویز دی آئندہ پاکستان سے جو بھی سرکاری وفد آئے اسے سلوک گرین پاسپورٹ کی وجہ سے ہوا۔ یہ واقعہ اس قدر تگھیں تھا کہ یہ پیسی لندن نے اپنی شرکت میں نہ صرف اس کا ذکر کیا بلکہ اسے پاکستانی قوم کی تو ہیں بھی قرار دیا۔ خود وفد میں موجود سرکاری افسر اس سلوک پر بڑی طرح ناخوش تھے۔ ابتدائی پریس کانفرنس میں مجرم جنرل راشد قریشی نے بھی اسے تو ہیں ہی

گردانا تھا لیکن صد تے جائیں امریکہ میں ہمارے سفارت خانے اور اس کے شاندار عملے کی شاندار ذہانت پر، جب وفد کے ارکان نے امریکی دفتر خارجہ میں اس سلوک کے خلاف سرکاری احتجاج کا مطالبہ کیا تو ہمارے سفارتی عملے نے جواب دیا "امریکہ کے تمام ہوائی اڈے پر مسافروں کو اس قسم کی تلاشی سے گزرنا پڑتا ہے اس لئے یہ کوئی اہم واقعہ نہیں۔" اس جواب پر وہاں موجود ایک صحافی نے عرض کیا "خسوا اگر پاکستان کے کسی ایئر پورٹ پر سرکاری دورے کے دوران کسی امریکی وزیر کی تلاشی ہو تو اس پر امریکہ کا کیا عمل ہو گا؟" ہمارے سفارتی عملے نے اس احتفاظہ سوال کو درخواستہ سمجھا اور کان پیٹ کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

ہو سکتا ہے میرے وہ تمام دوست اور بزرگ جو ایئر پورٹ پر تلاشی کے اس تجھیک شاک ٹول سے گزرے ہیں، جن کے جو توں میں امریکی سیکورٹی ایجنسیاں بم حلاش کرتی رہی ہیں اور اس عمل کے دوران جن کی "فلیش مس" ہو سکیں وہ مجھ سے اتفاق نہ کریں لیکن جہاں تک میری فہم و فراست کا معاملہ ہے میں اپنے سفارتی عملے سے پوری طرح متفق ہوں، واقعی امریکی ایئر پورٹوں پر غیر ملکی مسافروں کی اسی طرح تلاشی لی جاتی ہے۔ انہیں ٹول ٹول کر دیکھا جاتا ہے، ان کے جوتے اور جرایں تک اتر وائی جاتی ہیں لہذا اس قسم کی تلاشی کوئی غیر معمولی واقعہ ہے اور نہ ہی تو ہیں۔ رہے جناب رزاق داؤد اور جزل راشد قریشی تو انہوں نے زندگی میں ایک آدھ بار جو تھا اتنا کہ امریکی الیکاروں کو دکھا دیا تو کون سی قیامت آگئی یہ لوگ دیسے بھی رات کو جوتے اتنا ہے جیس ایک روز ان کو بھی ہی لیکن اصل بات جو ہمارے سفارتی عملہ ہمارے وہندے کے ارکان کو نہ تا سکا وہ زیادہ غور طلب ہے۔ ہمارے سفارتی عملے کو ہمارے وہندے کے تاریخ اور کان کو بتانا چاہیے تھا آپ لوگ بہت خوش نصیب ہیں کہ امریکی ایجنسیوں نے امریکہ اور پاکستان کے برادرانہ تعلقات کی وجہ سے آپ کے صرف جوتے اتر وائے ورن پچھلے بیٹھے جب روائنا کا مویشیوں کا وفاقي وزیر واشنگٹن کے سرکاری دورے پر آیا تھا تو امریکی ایجنسیوں نے نہ صرف اس کے کپڑے اتنا لئے تھے بلکہ ایئر پورٹ پر اسے احتیاطاً ٹسل بھی دیا تھا، جبکہ کوئی میر کو تو ابھی چند ہی روز ہوئے ہیں وہ دیسٹ ہاؤس کی دعوت پر واشنگٹن آیا تھا۔ ایئر پورٹ پر اس کا سوت اتنا کہا سے باندھنے کے لئے بینڈ شیٹ دی گئی تھی، اس بے چارے نے اس لباس میں آفیشل ڈرکھایا اور عزت و آبرو کے ساتھ واپس لوٹ گیا۔ ابھی کل کی بات ہے زائر کا ڈپنی پر ائم منیر امریکہ کے ہاں بصدوری دعوت پر واشنگٹن آیا، سیکورٹی ایجنسیوں نے اس کے کتوں کو جانے دیا لیکن اسے روک لیا لہذا اسے میرے وہن کے نا بھجھ لوگو! تم لوگ امریکہ سرکار کے دل میں اپنی محبت، اپنی عزت کا اندازہ لگاو، ان لوگوں نے تمہیں ذرا سامنول کر دیکھا، بس ایک آدھ بار جوتے اتر وائے اور تھوڑی دیر کے لئے ہاتھ اوپر اٹھوا کر بغلیں گدگداہیں۔ رہا دو تین گھنٹے تک تلاشی کی قطار میں کھڑا رہتا تو اتنی بڑی بڑی خوش نصیبوں اور اتنی بڑی دوستیوں میں تھوڑے بہت دکھ تو برداشت کرنے ہی پڑتے ہیں۔

اوٹوں کے ساتھ دوستی میں ظرف کے دروازے تو اونچے ہی رکھنا پڑتے ہیں۔

وہ تو مجھے مانتا ہی نہیں

برما کے کسی گاؤں میں دو بھائی رہتے تھے۔ ان کے گھر میں ایک بُت تھا، چھوٹا بھائی اس بُت کی پوچھ کرتا تھا جبکہ بڑا بھائی ذرا با غلیان خیالات کا مالک تھا۔ وہ صحیح باہر جانے سے پہلے بُت کو دو جو تے مارتا اور دو واپسی پر رسید کرتا تھا، یہ کام برسوں تک باری رہا۔ ایک روز بڑا بھائی اپنی "کارروائی" سے فارغ ہوا تو چھوٹے نے شدید احتجاج کیا۔ دونوں کا جھکڑا ہو گیا، بڑے بھائی کو غصہ آگیا اور اس نے اعلان کیا "میں صحیح اس بُت کو قیش سے توڑ دوں گا، تم اور تمہارا دیوتا جو کر سکتا ہے، کرو۔" اس رات بُت کا دیوتا چھوٹے بھائی کو خواب میں آیا اور اسے تکوار دکھا کر بولا "صحیح تمہارا بڑا بھائی میرا بُت توڑنے کی کوشش کرے گا، اگر یہ بُت نوٹ گیا تو میں اس تکوار سے تمہارا قیہ کر دوں گا۔" چھوٹا بھائی پریشان ہو گیا، اس نے دیوتا کے قدم چھوٹے اور گزر گزرا کر عرض کی "حضور آپ نے قیسہ کرنا ہے تو اس کا کریں جو روز صح شام آپ کی شان میں گستاخی کرتا ہے، میں تو آپ کا پیچاری ہوں۔" دیوتا نے تکوار پیچی کی اور مسکین لجھے میں بولا "میں اس کو سزا کیسے دے سکتا ہوں، وہ تو مجھے مانتا ہی نہیں۔"

امریکہ اور پاکستان کا تعلق بھی چھوٹے اور دیوتا جیسا ہے جب بھی اس "پرستش" اس محبت اور اس وفاداری کا نقصان اٹھایا وہ ہم ہی نے اٹھایا، اس کے بر عکس بھارت نے امریکہ کے ساتھ ہمیشہ وہ سلوک کیا جو بڑا بھائی بُت سے روا رکھتا تھا لیکن اسے ہمیشہ اس گستاخی کا فائدہ پہنچا۔ ابھی کل ہی کی بات ہے امریکی بیٹھ کے ایک اہم رکن اور خارجہ پالیسی کی کمیٹی کے سرگرم رہنماء برٹ نوری سیلی نے میری لینڈ میں ایک معاصر کو انتہ دیو دیا۔ اس انتہ دیو کے دوران جب نامہ نگار نے نوری سیلی سے کہا "بھارت جنوبی ایشیا کو ایئری جنگ میں دھکیل رہا ہے، امریکہ اثر و رسوخ استعمال کر کے مسئلہ کشمیر حل کیوں نہیں کر رہا تھا۔" تو نوری سیلی نے اس سوال کا بڑا ہی مزیدار جواب دیا۔ اس نے کہا "ہم بھارت کو مسئلہ کشمیر حل کرنے پر مجبوب نہیں کر سکتے کیونکہ امریکہ اور بھارت کے مابین تجارتی اور دفاعی سطح پر کسی قسم کا معابدہ نہیں۔ ہاں البتہ پاکستان کے ساتھ ہمارا دفاعی اور معاشری تعاون چاری ہے لہذا ہم پاکستان کو ہر بات ماننے پر مجبور کر سکتے ہیں۔" یہ ہے برعی دیوتاؤں کی وہ سوچ جو بعد ازاں امریکی دیوتاؤں کی قارن پالیسی تھی یعنی ہر اس ملک کو جو ہر چھوٹے بڑے بھرمان میں امریکہ کے ساتھ دے اسے اس دوستی، اس وفاداری اور اس تعاون کی پوری پوری سزا دی جائے اور ہر وہ ملک جو امریکہ کے ساتھ دے دے سلوک

کرے جو ہر ایجادی صحیح و شام بست کے ساتھ کرتا تھا اسے اس گستاخی، اس نافرمانی کا پورا پورا "اجڑ" دیا جائے۔ آپ پاکستان اور بھارت کی موجودہ سکھیش ہی دیکھ لیں۔ کارگل کا مسئلہ ہوا تو کنشن کے مشیر برائے جنوبی ایشیاء بروس ریڈل کے مطابق، کنشن نے با قاعدہ خط لکھ کر نواز شریف کو فوجیں واپس بلانے کا حکم دیا جبکہ واجپائی سے صرف بینظی و خل کی درخواست کی گئی۔ جب نواز شریف نے امریکہ آنے کا عندیہ دیا تو اس وقت بھی انہیں یہ حکم دیا گیا "اگر آپ فوجیں ہٹانے پر رضا مند ہیں تو آئیں ورنہ زحمت نہ کریں" اس دورے کے دوران کنشن نے واجپائی کو فون کیا، واجپائی نے کسی قسم کی گرم جوشی نہ دکھائی۔ اس عدم تعاون کا بھارت نے فائدہ اور پاکستان نے نقصان اٹھایا۔ سرحدوں پر فوجوں کے حالیہ اجتماع کا بھی بھارت ہی کو فائدہ پہنچا۔ وہ بمحاذ جو ہمیشہ امریکہ کا مخالف رہا۔ جس نے کولڈ وار کے دوران بروس کا ساتھ دیا۔ امریکہ نے چھٹے آئندھیوں کے دوران اس بھارت پر نوازشات کی بارش کر دی۔ ان آئندھیوں میں امریکہ کے 154 اعلیٰ عہدیداروں نے بھارت کا دورہ کیا۔ امریکہ نے پہلے الاسکا اور پھر آگرہ میں بھارت کے ساتھ جنگی مشقیں کیں۔ امریکہ نے بھارت کے ساتھ "مشترکہ ڈیپنس پالیسی گروپ" بنایا۔ دو روز پہلے امریکہ نے بھارت کو اندریں میں دیکھنے والے آلات، تحریل ایچنک اور پاکٹ کے بغیر اڑنے والے طیارے دینے کا اعلان بھی کیا۔ امریکہ کی منتظری سے برطانیہ نے ائمہ ممکرانے والے ہیارے بھی بھارت کے حوالے کر دیے۔ ان انتظامات کے ساتھ ساتھ امریکہ کو اس وقت پاکستان دہشت گرد اور واجپائی صبر اور استقامت کا پہاڑ دکھائی دے رہا ہے کیوں؟ کبھی کسی نے سوچا! صرف اس لئے کہ پاکستان چھٹے پچھاں برس سے امریکہ کا غیر مشرف دوست چلا آ رہا ہے۔ پاکستان نے امریکہ کو خوش رکھنے کے لئے ہمیشہ بروس سے فاصلہ رکھا۔ امریکہ نے کہا، بروس سے لڑاؤ، پاکستان افغانستان کے گرم مجاز میں کو دپڑا۔ امریکہ نے کہا افغانستان میں لڑنے والوں کو مجاہد اور بروس افغان جنگ کو جہاد کہو، پاکستان نے فوراً کہہ دیا۔ پھر حکم دیا اب ان مجاہدین کو دہشت گرد سمجھو، پاکستان نے نہ صرف سمجھنا شروع کر دیا بلکہ ان "دہشت گزدوں" کی بیخ کنی بھی فرمادی اور فرمایا تمہارے قریبے معاف نہیں ہوں گے، عرض کیا بالکل نہیں ہے ہم "سب سے پہلے پاکستان" کے نزدے پر ہی آپ کا ساتھ دے لیں گے لہذا پھر اس وفا شعاری، اس یکطرفہ دوستی اور اس غیر مشرف طبقت کا وہی نتیجہ لٹکا جو نکنا چاہیے تھا۔ دیوتا اب تکوار سونت کر ہمارے سر پر کھڑا ہے اور ہمیں حکم دے رہا ہے، اگر بھارت نے غالی سرحد عبور کی، اگر اس کی فوجیں پاکستان میں داخل ہوئیں۔ اگر ان نے تمہارے معصوم عوام کے گلے کانے تو پھر تمہاری خیر نہیں۔ میں تمہارا قیصر کر دوں گا، جواب میں ہم عرض کرتے ہیں۔ "حضور ہم تو آپ کے داس ہیں، آپ کے ماننے والے ہیں۔ آپ مہربانی فرمائے اسے سبق سکھائیں جو آپ کو تسلیم نہیں کرتا۔" دیوتا جلالی بجھ میں کہتا ہے "بے فتو! ہم بھارت کو کیسے منع کر سکتے ہیں، وہ تو ہماری طاقت کو مانتا ہی نہیں۔ ہم تو صرف اسے حکم دے سکتے ہیں جو ہمارا خادم، ہمارا وفادار ہے۔"

دودھ کا کٹورا

اٹل بھاری واچائی کی آنکھوں میں چمک آگئی، وہ مکرانے اور ذرا سا آگے جمک کر بولے "کانٹا چھے جائے تو اسے نکلنے کے لئے دوسرے کانٹے کی ضرورت پڑتی ہے، جب کانٹا نکل جاتا ہے تو دونوں کانٹے پھینک دیئے جاتے ہیں۔" واچائی کے یہ الفاظ بظاہر دو فقرے ہیں لیکن ان دونوں کے باطن میں جماں کر دیکھا جائے تو یہ بھارت کی اصل سوچ ہے، یہ لمحہ موجود میں بھارت کی قارن پالیسی ہے، بھارت یہ محسوس کرتا ہے افغانستان امریکہ کے پاؤں میں چھپا ہوا کانٹا تھا جسے نکلنے کے لئے ایک دوسرے کانٹے یعنی پاکستان کی ضرورت تھی، ضرورت کے اس دور میں امریکہ کے لئے پاکستان سے بڑھ کر کوئی ڈارلنگ نہیں تھا لیکن اب افغانستان کا کانٹا نکل پکالے اور وہ وقت آگیا ہے جب دونوں کانٹے پھینک دیئے جائیں گے لہذا اس "سہرے وقت" میں بھارت کو بھی اپنے کانٹے نکال لینے چاہیے۔

اگر ہم واچائی کے اس فلمے کی عینک سے دنیا کے حالات کا جائزہ لیں، غالباً بساط پر رکھے مہروں کی حرکات و سکنات پر غور کریں تو ہمیں محسوس ہو گا اس خطے میں امریکہ کے لئے دو کانٹے تھے ایک افغانستان اور دوسرا پاکستان، افغانستان کا کانٹا نکلنے کے لئے پاکستان ناگزیر تھا کیونکہ امریکہ کو افغانستان میں آپریشن کے لئے اتنی جنس سپورٹ درکار تھی اور یہ سپورٹ اسے صرف پاکستان فراہم کر سکتا تھا، امریکہ کو افغانستان کی سرحد پر ہوائی اڈے چاہیے تھے اور پاکستان کے پاس یہ اڈے موجود تھے، امریکہ القاعدہ کے کارکنوں کے فرار کے راستے بند کرنا چاہتا تھا اور پاکستان ہی وہ راستہ تھا جس کے ذریعے اسماء بن لاون اور ان کے ساتھ افغانستان سے نکل سکتے تھے لہذا امریکہ کے پاس پاکستان کو "ڈارلنگ" کہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا چنانچہ اس نے دو تین ماہ کے لئے ہمارے اشتبہ پروگرام کو فرماوش کر دیا، امریکہ کے اشارے پر دنیا جہان کے سربراہان مملکت، وزراء اعظم اور وزراء خارجہ نے پاکستان کے دورے شروع کر دیئے، ان دو ماہ میں پاکستان میں اتنی عالمی شخصیات آئیں کہ ان سے ہاتھ ملا ملا کر ہمارے وزیر خارجہ جناب عبدالستار کے ہاتھ دکھ گئے اور مکرا مکرا کر ہمارے دفتر خارجہ کے اہلکاروں کے جبڑے کھمک گئے۔ ڈارلنگ ڈارلنگ کے اس شور میں ہم اس خوش فہمی کا شکار ہو گئے کہ امریکہ اس وفاداری، اس تابعداری کے صلے میں ہمارے قریبے معاف کر دے گا۔ یہ غلط فہمی اس حد تک مضبوط تھی کہ صدر جناب جنرل یو بیز مشرف نے اٹلی دہران سرکر، دہران اتحادی پاکستان کو وہ

گیارہ ارب ڈالر معاف کر دیں گے جو ہم نے مختلف ملکوں سے براہ راست لئے تھے۔“ لیکن جب نوبر کے آخر میں افغانستان کا کانٹا نکل گیا، سربراہان مملکت کی آمد میں کمی واقع ہو گئی، ڈارلنگ کی صدائیں مدھم پر گھسیں اور امریکہ نے دوسرے کاٹے پر توجہ دنایا شروع کر دی تو قرضوں کی معافی کا غبارہ بھی پھٹ گیا۔ ہماری ساری خلائق فہمیاں بھی دور ہو گئیں۔

اگر ہم پچھلے دو ماہ کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں، امریکی دفتر خارجہ کے ہیاتات کا جائزہ لیں، امریکی مزاج میں آنے والی تبدیلیوں کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا ڈارلنگ کہنے والے دسمبر شروع ہوتے ہیں جیسیں ٹنک کی نظر وہ سے دیکھ رہے تھے۔ اب انہیں اسامہ بن لاون بھی مولانا فضل الرحمن کے مجرے میں نظر آتا ہے، کبھی سچی الحق کے کندھے سے کندھا ملائے دکھائی دیتا ہے، کبھی چمن میں، کبھی طور ختم میں اور کبھی ہوری ناؤں میں نظر آتا ہے اور انہیں کبھی لشکر طیبہ مستقبل کی القاعدہ دکھائی دیتی ہے اور کبھی مولانا مسعود اظہر آنے والے کل کے ملاعِر۔ انہیں کبھی مدرسوں کے ننگے فرش پر لیئے یتیم بچوں سے بغاوت کی بوآتی ہے اور کبھی انہیں قربانی کی کھالیں جمع کرتے نوجوان صلاح الدین ایوبی دکھائی دیتے ہیں۔ انہیں کبھی ہمارے سائنس و ادب ملکوں نظر آتے ہیں اور کبھی انہیں ہمارے ائمہ اعلیٰ غیر محفوظ دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی وہ فلاں تنظیم پر پابندی کی ”درخواست“ کرتے ہیں اور کبھی فلاں جماعت، فلاں تحریک کے اکاؤنٹ مخدود کرنے کا مطالبه کر دیتے ہیں اور حد تو یہ ہے دو ماہ پہلے تک انہیں ڈارلنگ کہنے اور امریکہ پاکستان بھائی بھائی کے لئے نکانے والوں کو اب ہمارا کشیر بھی دہشت گروں کا یہ پ دکھائی دے رہا ہے۔ اب انہیں کشمیریوں کی آزادی کی تحریک بھی دہشت گردی محسوس ہو رہی ہے اب ظاہر ہے بھارت ان حالات اور ان حالات میں آنے والی تبدیلیوں کا گہرائی سے جائزہ لے رہا تھا۔ لہذا اس نے جوں ہی دیکھا افغانستان کا کانٹا نکل چکا ہے اور اب امریکہ دوسری کانٹا پھینکنے کے لئے مناسب موقع اور مناسب بہاش تلاش کر رہا ہے تو اس نے پارلیمنٹ پر فدائی حملے کو جواز بنا کر اپنی فوجیں پاکستانی سرحدوں پر جمع کر دیں۔ اب ڈراسوچنے اگر امریکہ حقیقتاً ہمارا دوست ہے تو پھر صدر بیش نئی دیش پر آ کر بھارت کو کیوں نہیں کہتا۔“ پاکستان ہمارا دوست ہے اس پر حملہ امریکہ پر حملہ سمجھا جائے گا۔“ امریکہ داچائی کو فوجیں واپس لے جانے کا حکم کیوں نہیں دیتا، امریکی صدر بھارتی وزیر اعظم کو نئی فون پر یہ کیوں نہیں کہتا۔“ آپ کے پاس دو آپشن ہیں ہمارے دوستوں کو اپنا دوست سمجھیں یا پھر امریکی میزانوں کا انتقام کریں۔“ امریکہ یہ نہیں کر رہا، امریکہ یہ کرے گا بھی نہیں کیونکہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ عالمی ڈیزائن کا حصہ ہے، وہ نہیں ॥ اقوایی خطرنگ کی چال ہے۔

امریکی محاورہ ہے ”اگر آپ چوہے کو مٹھائی کا گلزار کھائیں گے تو وہ دودھ کا کٹورا مانگے۔“ ہم نے پہلے امریکہ کو مٹھائی کھائی لہذا اب اسے دودھ کے کٹورے مجرم برک پیش کر رہے ہیں، اب ہم لشکر طیبہ جیش محمد کے اکاؤنٹس مخدود کر کے، بھارت کے حکم پر 50 ”انہما پسندوں“ کی گرفتاری کا پروانہ جاری کر کے بھارت کو مٹھائی کھلارہے ہیں کل ہم اسے بھی دودھ کے کٹورے پیش کریں گے۔ یہ سے ہماری فارمان پا یسی ہو رہے ہمارا مستقبل

وُنی

کھاڑی مدراس کا ایک غیر معروف گاؤں تھا، گاؤں ہندو پروتھوں کے زیر اثر تھا الہدایتی کی رسم انتہا پر تھی۔ شاہ جہاں کے دور میں حکومت نے یہ رسم ختم کرنے کی کوشش کی۔ بادشاہ نے مقامی آبادی کو سمجھانے کے لئے اپنے وزراء کھاڑی بھیجے، عدالتیں لگا کر سی کرنے والوں کو سزا میں دیں لیکن لوگ بازن آئے وہ ہر روز کسی نہ کسی بیوہ کو آگ میں جبوک دیتے۔ اور نگزیرب کا دور آیا تو شہنشاہ ہند نے کھاڑی میں کوتولی قائم کر دی۔ کوتولی کا عمل شمشان گھانوں کی گھرانی کرتا تھا، جو جنی کوئی شخص سی کے لئے کوئی عورت وہاں لاتا کوتولی اسے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیتا بعد ازاں اس مجرم کو شاہ ہند کے حکم پر ڈارے مارے جاتے تھے۔ اس سزا کے خوف نے کھاڑی میں اتنی صورتحال پیدا کر دی۔ ہندوؤں نے بیواؤں کو حربوں میں جانا شروع کر دیا۔ وہ لوگ گھر کی چار دیواری میں عوت کوئی کرتے اور بعد ازاں اس کی راکھ شمشان گھاث میں جلتے مردے پر بکھیر دیتے۔ انگریز آئے اور پورے ہندوستان پر ان کا راج ہو گیا۔ لارڈ گرزن کے دور میں لندن کے اخبار تو میں نے کھاڑی کا دورہ کیا اور لندن جا کر سی کی رسم پر ایک تمثیلہ خیز مضمون لکھ دیا، یہ رسم اہل لندن کے لئے اکٹھاف تھا، بات ملکہ تک پہنچی تو اس نے واسرائے کو یہ غیر انسانی رسم ختم کرنے کا حکم دے دیا۔ گرزن نے یہ حکم آگے "پاس آن" کر دیا یوں 1901ء میں کیپن فیشر فوجی وست لے کر کھاڑی میں داخل ہوا۔ فیشر نے صورت حال کا جائزہ لیا تو اسے محسوس ہوا جو رسم شاہ جہاں سے بجا در شاہ ظفر تک ہندوستان کے مضبوط ترین حکمران ختم نہیں کر سکے انگریزوں کے لئے دہلی میں بینہ کر اس کا مقابلہ آسان نہیں ہو گا۔ فیشر نے واسرائے کو ساری صورتحال لکھ بھیجی۔ جواب میں واسرائے نے ایک عجیب و غریب حکم چاری کیا، اس وقت جس نے بھی یہ حکم ساقیہ لگایا اور گرزن کی ڈھنی حالت پر بھی کسی لیکن آنے والے دن گرزن کی داشتندی کے گواہ ہو گئے۔ واسرائے نے فیشر کو حکم دیا، کھاڑی میں سکول کھولو، مفت تعلیم کا اعلان کرو اور پانچ سال تک کے تمام بچوں کو زبردستی سکول میں داخل کر دو۔ کھاڑی میں ایک بہت بڑی منڈی بناؤ، لوگوں کو کاشت کاری سے تجارت پر لگاؤ، جب منڈی میں روفق ہو جائے تو یہ قانون بنادو جس دن گاؤں میں عورت مرے گی اس دن منڈی ہند رہے گی۔ واسرائے کے حکم پر عمل کیا گیا۔ 1920ء میں کھاڑی کا سروے ہوا تو معلوم ہوا

گاؤں میں عورتوں کی اوسط عمر مردوں سے دُنی ہے جبکہ گزشتہ دو سال میں ستی کا ایک بھی واقعہ پیش نہیں آیا۔ ”عورت لکشمی ہے“ یہ فقرہ بھی کھاڑی ہی کے کھڑیوں نے ایجاد کیا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے جس دن گاؤں میں عورت مراجاتی ہے اس دن منڈی بند رہتی ہے، لکشمی دیوبی اس دن ان سے روپی رہتی ہے۔

ابا خلیل کا واقعہ اس وقت پاکستان میں ”ہاث کیک“ کی طرح بک رہا ہے۔ یہ بات یقیناً افسوسناک ہے۔ کوئی مذہب، کوئی قانون اور کوئی معاشرہ اجازت نہیں دیتا کہ آپ خون بخشنے کے لئے آٹھ بچیاں دُشمن کے حوالے کر دیں اور بچیاں بھی ڈیڑھ سال، چار سال اور پانچ سال کی نابالغ لڑکیاں لیکن یہ آج کی رسم نہیں چار سو سال پہلے والٹی ناگ نے دو پنچان قبیلوں میں صلح کرنے کے لئے اس رسم کی بنیاد رکھی تھی۔ اس نے قاتل کی بچیاں متحول خاندان میں بیاہ کر ان رشتتوں کو ”شرم“ کا نام دیا تھا۔ اس کا خیال تھا شرم کے یہ رشتے خاندانوں کی عداوت بجھاؤں گے۔ عداوت محنڈی ہوئی یا نہ ہوئی لیکن یہ فیصلہ رسم کی شکل اختیار کر گیا۔ آج آپ میانوالی کے کسی گاؤں میں چلے جائیں آپ کو وہاں ”شرم“ کا ایک آدھ رشتہ مل جائے گا۔ وہ لڑکیاں جب دُشمن خاندان میں آتی ہیں تو انہیں ”ونی“ کہا جاتا ہے اگر زوں کے دور میں اس رسم کے خلاف کیا کارروائی ہوئی تاہم اس کے بارے میں خاموش ہے البتہ پاکستان بننے کے بعد ایوب خان پہلے سربراہ تھے جنہوں نے ونی کے خلاف قانون بنانے کی کوشش کی۔ ان کے دور میں ”ونی“ کے جرم میں پکوڑ ہکڑ بھی ہوئی۔ ایوب خان کے بعد جزل ضایاء کے دور میں ونی، شرم اور کارروکاری کے خلاف قانون سازی کی سمجھیدہ کوششیں ہوئیں لیکن ان کا بھی کوئی مظہر نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اب مشرف حکومت قانون سازی کر رہی ہے پنجاب کے وزیر قانون رانا اعیاز ”ونی“ کے جرم میں سات سال قید کا عندر یہ بھی دے چکے ہیں لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے صرف پابندی لگادینے یا سزا دے دینے سے چار سو سال پرانی رسم ختم ہو جائے گی؟ نہیں ہرگز نہیں، آپ ابا خلیل کے لوگوں پر غور کیجئے لڑکیاں دینے اور لینے والے دونوں باریش، تمازی اور پرہیز کارتھے ذرا سوچیں ایک شخص قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کے واضح احکامات کے باوجود اپنی ڈیڑھ سال کی پنچی ”قصاص“ میں دُشمن کے حوالے کر رہا ہے اور دوسرا باریش تمازی شخص وہ پنجی قبول کر رہا ہے، کوئی رانا صاحب سے پوچھ جی کیا یہ لوگ سات سال قید اور معمولی جرمانے سے ڈر کر یہ جرم ترک کر دیں گے؟ کیا یہ قرین قیاس محسوس ہوتا ہے، ہر گز نہیں، آنے والے دنوں میں یہ رسم کوئی نہ کوئی چدید شکل اختیار کر لے گی۔ یہ رسم نہجانے والے لوگ قانون کو دھوکہ دینے کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیں گے۔ شکل اور نام بدل جائے گا لیکن کام جاری رہے گا۔

بات سیدھی اور صاف ہے ونی ہو، شرم ہو، بچپن کی شادی ہو، کارروکاری ہو یا قرآن سے نکاح کی رسم۔ اس کے ڈاٹے جہالت اور غربت سے ملتے ہیں۔ ذرا سوچنے جہاں علم ہو گا وہاں کوئی ڈیڑھ سال کی پنجی کا رشتہ دے گا اور کوئی یہ رشتہ قبول کرے گا۔ جہاں معاشری خوشحالی ہو گی وہاں کوئی شخص اپنے باپ کا خون میں تیس لاکھ روپے میں بیٹھے گا۔ ایک ہزار سال پہلے لاہور شہر میں عورتیں جوتے نہیں پہن سکتی تھیں۔ لکھنؤ شہر

میں جس عورت پر ناجائز تعلقات کا الزام لگ جاتا تھا اس کا سرموذ دیا جاتا تھا۔ سندھ کے اکثر علاقوں میں بیوہ دوسری شادی نہیں کر سکتی تھی لیکن آج ان رسموں کا دور دوڑک نشان نہیں۔ ان کے خلاف کس نے قاتون بنا�ا، کس نے سزا بھی وضع کیں، کسی نے نہیں، بس جوں علم کا نور پھیلا، جوں جوں معاشی خوشحالی آئی۔ یہ فرسودہ رسمیں دم توڑ گئیں، جب تی جیسی رسمیں سکولوں اور منڈیوں کے سامنے نہ پھر سکیں تو ورنی اور شرم جیسی کمزور روایتوں کی کیا حیثیت ہے۔ یقین کچھ میانوالی اور باخیل کو قاتون اور سزاوں کی نہیں سکواں، کالجوں، منڈیوں اور کارخانوں کی ضرورت ہے۔ آپ آج وہاں دو، تین چار پانچ سکول کھول دیں۔ آنے والے وقتوں میں جب اس ڈیزائن سالہ بچی کے ہاں بچی پیدا ہوگی تو اس بچی کو ”ورنی“ سے بچانے کے لئے راتا ایجاز کولا ہو رہ سے باخیل نہیں آتا پڑے گا۔ اگر ہم نے لارڈ کزن کی طرح نہ سوچا تو پھر ہم ورنی کی سزا موت ہی کیوں نہ مٹے کریں۔ یہ رسم ختم نہیں ہوگی۔ ذرا سوچئے جب چھانسی کی سزا قتل نہیں روک سکی تو سات سال کی قید ورنی کو کیسے روکے گی۔



امریکہ اور امریکی

جبکہ تک اخلاقیات کا معاملہ ہے امریکی قوم دنیا سے بہت آگے ہے، یہ لوگ ناک کی سیدھے چلتے ہیں ان کے قریب کون بیٹھا ہے، اس نے کیا پہن رکھا ہے، وہ نگاہ ہے یا سوت میں ملبوس ہے کوئی کسی کا نوٹس نہیں لیتا۔ گھومنا، کسی دوسرے کا جائزہ لینا یا زیادہ توجہ سے کسی دوسرے کو دیکھنا امریکہ میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ امریکہ میں آنکھ کا حیا بھی بڑی حد تک موجود ہے۔ بوس و کنار اور باہم "دست و گریبان" کے جو مظاہرے یورپ میں دکھائی دیتے ہیں، وہ امریکہ میں ناپید ہیں۔ اگر کوئی جزو اشدت جذبات میں سرک، فٹ پاٹھ یا کسی پیک مقام پر کوئی جذباتی حرکت کر بیٹھے تو قریب سے گزرنے والے برآمنا جاتے ہیں۔ کبھی بکھار یہ حرکت طوالت اختیار کر جائے تو رائیبرک کر ان لوگوں کو "گو جوم" کا مشورہ بھی دے دیتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں یورپ بھر میں یہ حرکات عام ہیں اور کوئی ان کا نوٹس نہیں لیتا۔ امریکی خواتین بھی یورپی عورتوں کی نسبت زیادہ وفادار ہیں۔ گویہاں بھی شادیوں کا رجحان نہیں لیکن امریکی عورت اگر کسی مرد کی "دوسٹ" ہے تو وہ جب تک اس کی دوسٹ ہے اس سے وفاداری نہ جائے گی۔ خواتین کا پورے امریکی معاشرے میں بہت احترام ہے، اگر کوئی عورت کسی مرد پر ہر اسال کرنے کا الزام لگادے تو پولیس مخالف فریق کا موقف نے بغیر اسے گرفتار کر لیتی ہے، خواتین پر آواز کتنا، چھیڑنا، راست روک لینا اور انہیں دیکھ کر "کھنگھورے" ماننے کے حرбے امریکہ میں نہیں چلتے۔ چار جو لاٹی کو امریکہ کا یوم آزادی تھا، اس روز تمام شہروں میں فائر و رکس ہوا، ہر فائر و رک پر لاکھوں لوگ جمع ہوئے، واپسی پر بھی بجوم تھا لیکن کسی بھی شہر میں چھیڑ چھاڑ کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

امریکیوں کی عمومی عادات بھی قابل تقلید ہیں۔ پورے امریکہ میں صحت مندرجہ کا جنون پایا جاتا ہے۔ لوگ بسوں، بیکسیوں اور ٹرینوں کی بجائے پیدل چنان پسند کرتے ہیں۔ دوپہر کے وقت بھی آپ کو لوگ جوگکرتے نظر آئیں گے، میں نے پورے امریکہ میں بوڑھوں کو جوانوں کی طرح کام کرتے دیکھا۔ یہ لوگ پیدل چلتے ہیں، بوجھ اٹھاتے ہیں۔ سٹوروں پر کام کرتے ہیں۔ زیادہ بوڑھے ہو جائیں تو گھر بیٹھنے کی بجائے خدمت غسل کے کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں، کوئی صحیح جواب گھر جا کر بلا معاوضہ گائیڈ کا کام کرتا ہے تو کوئی لا بھری یہی کی کتابیں درست کرنے لگتا ہے، اس حرکت سے برکت بھی ہوتی ہے اور ان کا وقت بھی کث جاتا ہے۔ قطار امریکہ کا ناقابل تردید اصول ہے۔ امریکیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے وہ اسکے ہوں تو

بھی قطار ناکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آپ کسی کو روک کر بات کریں تو وہ ہمیشہ مسکرا کر جواب دے گا، یا توں کے دوران امریکی جان بوجھ کر کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور کرتے ہیں جس پر وہ خود تپتہ لگائیں اور دوسرا بھی، اگر چلتے چلتے دو اجنبیوں کا سامنا ہو جائے تو دونوں مسکرا کر ایک دوسرے کا سواگت کرتے ہیں۔ کوتاہی اور غلطی پر یہ دیکھے بغیر کہ غلطی کس کی ہے دونوں یہک وقت مغدرت کر لیتے ہیں۔ امریکیوں کی ایک اور چیز نے مجھے بہت متاثر کیا۔ جب کوئی امریکی شخص کسی دفتر یا اسی عمارت میں داخل ہوتا ہے تو وہ دروازہ کھول کر پہچھے ضرور دیکھتا ہے، اگر اس کے پہچھے کوئی شخص ہے تو وہ دروازہ بند کرنے کی بجائے اس وقت تک کھڑا رہے گا جب تک دوسرے شخص کا ہاتھ دروازے کے پینڈل تک نہیں پہنچ جاتا۔

امریکی خوش دل بھی بہت ہیں، یہ باہمی تعلقات میں منافقت سے پرہیز کرتے ہیں۔ جس کی تعریف کرتے ہیں کھل کر کرتے ہیں اور جس سے ناراض ہوتے ہیں اسے منہ پر کہہ دیتے ہیں۔ یہاں اگر کوئی شخص اپنی یا اپنے بچوں کی کسی کامیابی کا ذکر کرے تو وہاں موجود تمام لوگ اس طرح خوشی کا انعام کریں گے جیسے یہ ان کی اپنی کامیابی ہو۔ اگر آپ برتریکاف ہی کسی کی تعریف کر دیں تو وہ اس قدر خوش ہو جاتا ہے کہ کہنا والا شرمدہ ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے کو تخدیدینے کی روایت بھی امریکہ میں عام ہے۔ یہ لوگ اگر کسی کے گرد ہوتے ہیں تو کوئی نہ کوئی چیز ضرور لے کر جاتے ہیں۔ میزانِ محہمان کی دی ہوئی چیز کا بڑے والہان طریقے سے شکریہ ادا کرتا ہے۔ بعد ازاں وہ بڑے غرے سے تک اس تھنے کا اپنے دوستوں سے ڈاکر کرتا رہتا ہے۔

امریکہ میں حرکت بھی بہت ہے آپ مرکز پر کھڑے ہو جائیں، آپ کو محسوس ہو گا سارا امریکہ مرک پر نکل آیا ہے، گاڑیاں ہی گاڑیاں ہوں گی۔ بپر سے بپر ملے ہوں گے، آپ شاپنگ مالز میں چلے جائیں یوں لگے سارا امریکہ خریداری کے لئے گھر سے نکل آیا ہے، پارکوں میں چلے جائیں محسوس ہو گا سارا امریکہ جا گلگ کر رہا ہے جہلِ قدی کر رہا ہے، لا بھری یوں میں چلے جائیں یوں لگے گا جیسے پوری قوم کو پڑھنے کے سوا کوئی شوق نہیں۔ آپ یا اب گھروں، بیماروں اور تھیزوں میں چلے جائیں آپ کو یقین ہو جائے گا یہ قوم صرف کھیل کوڈ کے لئے پیدا ہوئی ہے اور اگر آپ ان کے کلبوں، رقص گاہوں اور جوانخانوں میں جائیں تو آپ کو محسوس ہو گا یہ لوگ عیاشی کے سوا کچھ نہیں کرتے۔ یہ ہے ان کا نظام، کام کے وقت کام، آرام کے وقت آرام اور تفریح کے وقت تفریح۔ امریکہ میں کوئی شعبد ایسا نہیں جس میں حرکت نہ ہو، جس میں رونق نہ ہو۔

میں ایک ماہ امریکہ رہا، اس ایک ماہ کے دوران میں مسلسل سوچتا رہا۔ یہ سب کچھ ہمارے ملک میں کیوں نہیں ہوتا۔ نہ کہ بات کرنے، سیر کرنے اور ایک دوسرے کی تعریف کرنے کے لئے تو پیسے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے لئے قوتی یافت ہونے کی شرط نہیں ہوتی۔ پھر ہم اخلاقیات اور روایات میں بھی ترقی پذیر کیوں ہیں؟ مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ ہو سکتا ہے آپ کے پاس کوئی جواب ہو؟ اگر ہے تو مہربانی فرمائیں اس بھائے کو ضرور بتا دیں جو ہمیشہ بلا وجہ پیزارہ تا ہے!

جم، جمال، جمیل

نیو یارک سنتر ناڈن کے یہ صاحب اگر واحد مثال ہوتے تو ان کا اصل نام بتانے میں کوئی حرج نہیں تھا لیکن اس وقت امریکہ کی پچاس ریاستوں کے پانچ سو شہروں میں ایسے سینکڑوں ہزاروں پاکستانی موجود ہیں جن کی بھی کہانی ہے، جن کے سینوں پر یہی داشت ہیں۔ میرے یہ دوست آج سے بارہ برس پہلے ایک ایجنت کو پانچ لاکھ روپے دے کر امریکہ پہنچنے تھے۔ یہ جب پاکستان سے لٹکتے تھے تو ان کا نام جمیل تھا، راستے میں ان کی تصویر کسی دوسرے صاحب کے پاسپورٹ پر چھپائی گئی تو یہ جمال بن گئے، امریکہ پہنچنے تو حالات نے انہیں جم ہنا دیا۔ اب وہ امریکیوں کی نظر میں جم ہیں۔ دوست انہیں جمال کہتے ہیں اور جب ہفتے دل بعد پاکستان سے فون آتا ہے تو جمیل بن جاتے ہیں۔ میرے اس دوست جم، جمال، جمیل کی کہانی جیخون سے لکھی جانی چاہیے۔ اسے آہوں پر رقم کرتا چاہیے اور اسے پاکستان کی ہر دیوار پر سرخ سیاہی سے تحریر کر دینا چاہیے کہ اس میں نوئے بھی ہیں، سکیاں بھی اور چینیں بھی۔

میرا یہ دوست جم، جمال، جمیل جب پاکستان سے لگا تو اس کی بیوی کے سارے بال سیاہ تھے۔ اس کی بُنی میں ندیوں کا ترجم اور دریاؤں کا ظلم تھا، اس کی چوکھت پر اس کی دو بینیاں کھڑی تھیں، چھوٹی کے ہاتھ میں کپڑے کی گزیا تھی اور بڑی کے کندھے پر بستے، اس کے دو بیٹے تھے، سعادت مند، فرمائیں اور پڑھا گو۔ دنوں نے اس کا سامان اٹھا رکھا تھا۔ اس کی نیماری کی دکان بھی تھی جس کی وجہ سے پنج کراس نے ایجنت کے لئے چیزوں کا بندوبست کیا تھا اور اس کے بوڑھے ماں باپ بھی تھے جن کی وہ اکلوتی اولاد تھا۔ میرے اس دوست جم، جمال، جمیل کا پاکستان میں گزارہ نہیں ہوتا تھا۔ نیادی کی دکان سے آمدن کم تھی، کھانے والے زیادہ تھے، بچیاں بڑی ہو رہی تھیں، لڑکے جوانی کی دہنیز سے ایک دو قدم دور کھڑے تھے لہذا جم، جمال، جمیل کو ان کے مستقبل کی بڑی فکر تھی۔ میرے دوست نے دہنیز پار کی، وہ جمیل سے جمال بنا اور پھر آنکھ میںے کی ذلت کے بعد امریکہ پہنچا تو جم بن گیا۔

میرا یہ دوست پچھلے بارہ سال سے امریکہ ہے۔ ان بارہ سالوں میں اس نے زندگی کے جو جو بھی انک رہ پ دیکھے، وہ یہ جانتا ہے یا پھر اس کا رب، اس نے نواں صاف کئے، کچرا اٹھایا، چوکیداری کی،

کے نہ لائے، بھری بچھائی، بوجھ ڈھویا، پاگل خانے میں پاگلوں کے غایظ پوٹے تبدیل کئے، ریستورانوں میں برتن دھوئے اور اب آخر میں یہ پچھلے چار سال سے تیکسی چلا رہا ہے۔ ان پارہ سالوں میں پاکستان سے اس کا ٹیکل فون اور ہندزی کا رشتہ رہا۔ یہ دن رات محنت کر کے پیسے کھاتا رہا۔ ان میں اپنے کھانے پینے کا خرچ نکال کر باقی رقم پاکستان بھجواتا رہا۔ دس دس بندوں کے ساتھ فرش پر سوتا رہا اور ایک ایک جیز میں دو دو سال گزارتا رہا۔ یہ اس کی زندگی تھی اور تبکی اس کا معمول۔

میرا یہ دوست نیویاک جیسی جنت میں دوزخ جیسی زندگی گزارتا رہا لیکن یہ پچھے امریکہ سے ہزاروں لاکھوں میل دور نوپر عیک شگھ میں اس کے گھر میں روپے پیسے کی ریل ہیل ہو گئی، گھر بیان گیا، پھر ان نے گازیاں لے لیں، یہوی ڈامنڈ کے زیورات پہننے لگی اور ماں باپ کو ج کی سعادت نصیب ہو گئی۔ دولت کی اس فراوانی نے اثر دکھایا تو اس کے دونوں بیٹوں نے پڑھائی چھوڑ دی۔ بلاہری صحبت کا شکار ہو گیا۔ سگریٹ سے ابتدا ہوئی تو ہیر و ڈن پر اختتام، چھوٹا بد معاشوں میں بینختے رہا، جھکڑا ہوا، اس نے طیش میں آکر گولی چلا دی، دو بندے مر گئے، وہ پکڑا گیا۔ سزا یہ موت ہو گئی، وہ آج کل کوئھری میں اجیل کی منظوری کا منتظر ہے۔ بڑی بیٹی ڈرامہور کے ساتھ بھاگ گئی، ماں منا کرو اپس لے آکی، آج کل اس کی "شادی" کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ چھوٹی نے بھی خود سوزی کی دھمکی دے کر مرضی کی شدی کر لی، ربے بوز میں ماں باپ تو وہ دونوں آگے پچھے انتقال کر گئے اور ماں ہم نے اس کی یہوی سکے ہارے میں تو اپ کو تباہی لیں، خوش خواہ اگنے اس کو مدت پہلے گوشت کا پہاڑ بنادیا تھا اور خاوند کی جدائی نفیا تی مریض۔

میرے اس دوست نے ان پارہ سالوں میں لاکھوں ڈال رکھا، یہ خود کو خوش نصیب بھی کہتا ہے لیکن پہنچیں کیوں میں اس شخص کو جی ہاں اسی جم، جمال اور جیل کو خوش نصیب سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہوں ذرا سوچنے جو شخص پارہ سال اپنے ملک، اپنے گھر سے دور رہا ہوا سے خوش نصیب، خوش بخت کیسے کہا جا سکتا ہے، جو شخص آخری وقت اپنی ماں کے سرہانے کھڑا رہا، جو اپنے باپ کے جنازے کو کندھانہ دے سکا، جس کی بینیاں آوارہ ہو گئیں، جس کا ایک جیٹا ہیر و ڈن پی کر نالیوں میں پڑا رہتا ہے، جس کا دوسرا جیٹا کال کوئھری میں بینچ کر موت کی چاپ سن رہا ہے اسے خوش بخت، خوش نصیب کیسے کہا جا سکتا ہے اور جو شخص پارہ سال اپنی یہوی سے دور رہا ہو، اس شخص کو بھی کیسے خوش نصیب، خوش بخت کہا جا سکتا ہے۔ میں نے جم سے پوچھا "تم اتنے سال ملک سے باہر کیوں رہے؟" جم نے سگریٹ کا کش لکایا "میں امریکہ میں غیر قانونی تھا، پاکستان چلا جاتا تو کبھی واپس نہ آ سکتا، کاغذ محکم ہوئے تو بیٹے پر مقدم، بن گیا، وکیلوں کی فیسیں پوری کرنے کے لئے مجھے یہاں رہتا پڑا، اب پیسے بھی ہیں اور گرین کارڈ بھی، واپس بھی جانا چاہتا ہوں لیکن پھر سوچتا ہوں اب وہاں کس لئے جاؤں، ابا جی نہیں رہے، ماں جی کی قبر مرت گئی، بینے زندہ ہیں لیکن مردوں سے بدتر ہیں۔ نالیوں سے رابطہ بے غیرتی ہے، رہی یہوی تو اس کے سامنے جانے کا میرے اندر حوصلہ نہیں لپڑا اب جو کھیلتا ہوں،

شراب پیتا ہوں اور سوت کا انتظار کرتا ہوں۔"

میں نے پہلے بھی عرض کیا، نیو یارک سنٹر ناؤن کے یہ صاحب اگر واحد مثال ہوتے تو ان کا اصل نام بتانے میں کوئی حرج نہیں تھا لیکن اس وقت امریکہ کی پچاس ریاستوں کے پانچ سو شہروں میں ایسے سینکڑوں، ہزاروں پاکستانی موجود ہیں جن کی بھی کہانی ہے۔ جن کے سینوں پر بھی داغ ہیں۔ ان لوگوں نے پکے گھروں، مخندی گازیوں، چمکتے زیوروں اور اس پش کرتی زندگی کی بہت قیمت ادا کی۔ مجھے معلوم ہے اس قت میرے تاریخ میں بھی ایسے سینکڑوں، ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگ ہوں گے امریکہ آنا جن کی زندگی کا سب سے بڑا خواب ہوگا۔ جو اس آرزو، اس خواہش کی روشنی میں زندہ ہیں، میں ان سے اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آپ لوگ ضرور امریکہ آئیں لیکن یہ سوچ لیں آپ کو بھی میرے دوست جم، جمال، جمیل کی طرح بھاری قیمت ادا کرنا پڑے گی آپ کے والدین بھی جمیل، جمال، جم کے ماں باپ کی طرح مریں گے چتوکی، سمسہ شا یا جلال پور میں اور ان گورونے کے لئے آپ کو بھی ان کی قبریں نیو یارک کے کسی بدبودار فلیٹ میں بنانا ہوں گی۔ یاد رکھیں رزق کے عوض سمجھوٹ کرنے والے لوگ دنیا میں ڈیل ہو جاتے ہیں۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

اے پروردگار تم نے مجھے فلپائن کیوں نہیں بنایا

ائیگلو دے لا کروز فلپائن کا ترک ڈرائیور تھا، ایگلو کی کمپنی عراق میں کام کر رہی تھی، جولائی 2004ء کے آخر میں عراق کے ایک جنگ جو گروپ نے ایگلو کو اغوا کر لیا۔ یہ خبر فلپائن پہنچی تو فلپائن حکومت نے ایرجنسی کا اعلان کر دیا، فلپائن کا نائب وزیر خارجہ سفارت کارروں کے ایک دستے کے ساتھ بغداد پہنچ گیا۔ نیلی ویژن چیناؤ نے ایگلو کے اغوا پر لائیج پر گرام شروع کئے۔ جنگ جو گروپ کا پہلا مطالبہ تھا ”فلپائن عراق سے اپنی فوج واپس بلائے“، فلپائن کی صدر گلوریا آریو نے اسی وقت اپنی فوج واپس بلائے کا اعلان کر دیا، امریکی اور دوسرے اتحادیوں نے گلوریا کے اس اقدام پر شدید احتجاج کیا، گلوریا نے بُش کو جواب دیا ”بُش میں فلپائن کا مفاد پوری دنیا سے زیادہ عزیز ہے“، گلوریا کے حکم کے بعد فلپائنی فوج کے 53 جوانوں نے 72 گھنٹوں کے اندر عراق چھوڑ دیا۔ اغوا کارروں نے دوسرا مطالبہ کیا آج کے بعد فلپائن کا کوئی باشندہ عراق میں کام نہیں کرے گا، فلپائن حکومت نے فوراً سر تسلیم تم کر دیا، اغوا کارروں نے ایگلو دے لا کروز کو رہا کر دیا۔ نائب وزیر خارجہ اور اس کی ٹیم ایگلو کو لے کر فلپائن واپس پہنچی تو 10 لاکھ لوگ استقبال کے لئے ایئر پورٹ کے باہر کھڑے تھے۔ فلپائن میڈیا کے مطابق یہ فلپائن کی تاریخ کا سب سے بڑا استقبال تھا، پورے ملک میں ”ویکلم ہوم ایگلو“ کے بیز لگے تھے، ملک میں قومی تعظیل تھی اور لوگ ڈھول بجا کر خوشی منا رہے تھے۔ ایک طرف تو یہ عالم تھا اور دوسری طرف امریکہ فلپائن سے خطا تھا، امریکی سفیر نی ہدایات کے لئے واپس واشنگٹن جا چکا تھا، فلپائن میں موجود امریکی اداروں اور کمپنیوں نے کام روک دیا تھا لیکن فلپائنی حکومت مطمئن تھی۔ حکومت کا کہنا تھا فلپائن کو امریکہ نہیں بلکہ وہ 170 لاکھ تارکین وطن چلا رہے ہیں جو ایگلو دے لا کروز کے مختلف ممالک میں کام کرتے ہیں اور زر مبادلہ کا کرائپنے ملک بھجواتے ہیں۔ فلپائن کا کہنا ہے ایگلو ایک فرد نہیں تھا وہ 70 لاکھ تارکین وطن فلپائنیوں کا نمائندہ تھا، اگر ہم ایگلو کو فراموش کر دیتے تو یہ 170 لاکھ تارکین وطن فلپائن کو بھلا دیتے، ہم نے ایگلو کو بچا کر ان لوگوں کو یہ اعتماد دیا کہ آپ کی حکومت، آپ کی قوم آپ کے ساتھ ہے الہذا اب 31 جولائی 2004ء کے بعد فلپائن کا ہر شہری دنیا کے ہر ملک میں سینہ تان کر چلے گا۔

یہ سوچ یہ رد عمل صرف فلپائن تک محدود نہیں، اس وقت عراق کے جنگ جوؤں نے 22 ممالک کے 60 باشندے اغوا کر رکھے ہیں۔ ان تمام ممالک میں ایرجنسی کی صورت حال ہے۔ معمول کے کام بند ہیں اور پوری قوم اپنے باشندوں کی واپسی کے لئے فلپائن کی طرح ہاتھ پاؤں مار رہی ہے، بلیک فلپائن نامی عراقی

عُظیم نے پچھلے دنوں 7 غیر ملکی اخوا کے۔ ان میں 3 بھارتی، 3 کینیا کی اور ایک مصری باشندہ شامل تھا۔ عُظیم نے اعلان کیا ہم 72 گھنٹے میں ایک باشندے کا سر قلم کر دیں گے۔ تینوں ممالک فوراً ادا کرات میں کوڈ پڑے، مصر نے اس وقت اعلان کر دیا "ہم عراق میں فوج نہیں بھیجن گے" بھارت نے عمان میں موجود اپنے سفارت کو بغداد بھیج دیا۔ سفارت نے وہاں پہنچتے ہی عراق کے ایک قبائلی سردار شیخ حسن الدلبامی سے رابطہ کیا، سردار نے اخوا کاروں کو قریب لائے بڑھانے پر رضا مند کر دیا۔ ولی میں کر اس میمنشہ گروپ بن گیا جس نے بھارتی باشندوں کو عراق سے نکل آنے کی درخواست کر دی۔ بھارتی حکومت نے پوری قوم سے اپیل کی بھارت میں موجود مسلمانوں کو تکمیل نہ دی جائے کیونکہ اس کے رد عمل میں بغداد میں ان کے بھائیوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ بھارتی حکومت مفویوں کے معاملے میں نہ صرف مصر، کینیا، عراق اور امریکہ کی حکومتوں سے رابطہ میں ہے بلکہ وہ کے جی ایل نامی اس کمپنی پر بھی مسلسل دباؤ ڈال رہی ہے جس میں بھارت کے یہ تینوں باشندے کام کرتے تھے۔ اٹلی کے ساتھ بھی بھی ہوا اس کے 3 باشندوں میں سے ایک قتل کر دیا گیا جبکہ باقی 2 کی واپسی کے لئے اطالوی حکومت نے زمین آسمان ایک کر دیا ان دونوں باشندوں کے لئے اٹلی نے اپنے دفتر خارج، فوج، امریکہ اور غیر سرکاری وسائل استعمال کئے۔

یہ ہے دنیا کا رد عمل! اس کے برکس ہمارے دو باشندے راجہ آزاد اور ساجد نعیم اخوا ہوئے لیکن ہم نے ان کے لئے یا وہی بھی یہ سوچ کر اپنے پاکستانی ہوئے پر شرم آتی ہے، اخوا کا صرف اتنا چاہتے تھے حکومت پاکستان یہ اعلان کر دے ہم اپنی فوج عراق نہیں بھیجن گے اور وہ ہمارے دونوں باشندے رہا کر دیں گے لیکن اس کے جواب میں ہم اعلان کرتے رہے "ہم نے ابھی فوج بھجوانے کا فیصلہ نہیں کیا" کیا یہ اخوا کاروں کے مطالبے کا صحیح جواب تھا، کیا ہمارا یہ بیان سفارت کاری کے معیار پر پورا اترتا ہے، افسوس صد افسوس۔ ہمارے دو باشندے عراق میں ذبح ہو رہے تھے اور ہماری پوری حکومت ایک میں مستقبل کے وزیر اعظم جناب شوکت عزیز کے جلوسوں کی کریاں سیدھی کر رہی تھی، ایک اور ستم ملا جلد سمجھے جب تک راجہ آزاد اور ساجد نعیم زندہ رہے ہماری حکومت یہ کہتی رہی ہم نے ابھی فوج بھجوانے کا فیصلہ نہیں کیا لیکن جب ان معصوم لوگوں کی آنکھوں کا پالی ختم ہو گیا تو ہماری حکومت نے اعلان فرمادیا "ہم اپنی فوج عراق نہیں بھجوائیں گے۔" وہ آپ ذرا ایغی ٹھکسی تو ملا جلد سمجھے، آپ قوت فیصلہ تو دیکھئے۔

کل میرا ایک دوست اللہ تعالیٰ سے شکوہ کر رہا تھا "اے میرے پروردگار تم نے مجھے فلپائنی کیوں نہیں بنایا۔" میں نے اسے گھوڑ کر دیکھا تو وہ آنسو پوچھ کر بولا "دیکھو سے پہلے پاکستان کا نفرہ ہم لگاتے ہیں لیکن اس نفرے کو ثابت فلپائن کی حکومت نے کیا۔" میں خاموش رہا، میرا دوست اسی دلکشی لمحے میں بولا "یا تو تم مجھے اس پاکستان تک لے جاؤ جو واقعی سب سے پہلے ہے یا پھر....." اس نے آنکھوں پر ردمال رکھ لیا "یا پھر مجھے اللہ سے یہ شکوہ کرنے دو، اے میرے پروردگار تم نے مجھے فلپائنی کیوں نہیں بنایا۔"

آرٹی

چند برس پہلے بھارت کے کسی اخبار میں سونیا گاندھی کا ایک انٹرویو چھپا تھا۔ اس انٹرویو میں راجیو گاندھی کی بیوہ نے دعویٰ کیا تھا بھارت میڈیا کمپنیں کے ذریعے پاکستان کی ثقافت مسخ کر چکا ہے اور اب بھارت کو پاکستان فتح کرنے کے لئے کسی فوجی مہم کی ضرورت نہیں کیونکہ بھارت پاکستان کو ثقافتی تکشیدے چکا ہے۔ جب سونیا گاندھی کا یہ بیان ترجمہ ہو کر پاکستانی اخبارات میں شائع ہوا تو ملک میں ہنگامہ برپا ہو گیا، لیکن روں نے سونیا گاندھی کے خلاف مذمتی بیانات جاری فرمائے، علماء کرام نے مساجد میں سونیا گاندھی کے خلاف قراردادیں منظور کرائیں اور لکھاریوں نے سونیا گاندھی کے خلاف کالم لکھے۔ ان سب دانشوروں کا خیال تھا سونیا کا دعویٰ سیدھی سادی مبالغہ آرائی ہے جب تک پاکستان میں ایک بھی پاکستانی موجود ہے بھارت کے خلاف نفرت زندہ رہے گی، پاکستانی سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن بھارت سے محنت نہیں کر سکتے، اسے دوست نہیں بنا سکتے، اس کی ثقافت، اس کا پتھر نہیں اپنا سکتے۔ مجھے بھی اس وقت اپنے دوسرے پاکستانی دانشوروں سے اتفاق تھا۔ میرا بھی یہی خیال تھا ابھی پاکستانیوں میں پاکستانیت زندہ ہے لیکن آج، جیسا ہاں آج جب انہما پسند ہندو بال مخاکرے کا بیان اخبار میں چھپا وردہ بیان ترجمہ ہو کر پاکستانی اخبارات تک پہنچا اور ان پاکستانی اخبارات سے ہوتا ہوا یہ دعویٰ پاکستانیوں کے سامنے آیا تو یہ نہ چاہتے ہوئے بھی دل یہ ماننے پر مجبور ہو گیا کہ پاکستان واقعی بھارت کے رنگ میں رنگ چکا ہے۔ ہم ان چند برسوں میں بہت کچھ کھو چکے ہیں۔

بال مخاکرے کا دعویٰ ہے پاکستان میں بستہ ہندو تہذیب کی فتح ہے، دو قوی نظریہ ہار چکا ہے، بستہ کے دوران مرنے والے لوگ ان کے شہید ہیں اور اگر مسلمان ہندوؤں کی تہذیب پچاس سال سے برس پہلے قبول کر لیتے تو لاکھوں افراد کی جانیں ضائع نہ ہوتیں وغیرہ وغیرہ، ہو سکتا ہے اس وقت بھی پاکستان میں ایسے لوگ موجود ہوں جو بال مخاکرے کے دعویٰ کو مبالغہ آرائی قرار دیں۔ جو اسے جھوٹ، لغو اور فریب کہیں یقین کریجئے اب ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہو گی۔ یہی ہے ہم کھنکھنے کھنکھنے بھارتی تہذیب میں حصہ چکے ہیں۔

پاکستان کا پچھہ بھارتی شہریوں سے پہلے ہندو فلمیں دیکھتا ہے۔ اسے لالی وڈ کے ایک ایکٹر اور ایکٹریں کا پتھرہ حظظ ہے۔ لوگوں کو قائد اعظم اور علامہ اقبال کے بارے میں اتنا معلوم نہیں جتنا وہ گاندھی اور شہزادگانے ہیں۔ ہماری تعلیم کوٹ ادو اور ملتان کا فاصلہ نہیں جانتی، اے جیوانی اور سیماڑی کا علم نہیں لیکن وہ پہنچ سے ٹھیکی کا فاصلہ بتا سکتی ہے، اسے یہ معلوم ہے ہماچل پردیش کہا ہے اور اس میں کون سی زبان بولی

جاتی ہے اب ہمارے پچھے بھارتی بچوں کی طرح کشمیری مجاہدین کو "آئنک وادی" کہتے ہیں۔ وہ بھی اب قسم کی جگہ سو گند کھاتے ہیں۔ انہیں بھی ساری کی ساری مہماں بھارت از بر ہے وہ وشنو کے بارے میں بھی جانتے ہیں۔ انہیں رام، کرشن، ارجمن، راون، ہنومان، سیتا، لکشی اور کالی مال، کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ یقین تکچھے ہمارے اندر ایک طبقہ جنم لے چکا ہے جس کا بھارت دشمن نہیں ہے جو مدراس، دہلی، منھر اور گھبی کو خود سے دور محسوس نہیں کرتا۔ جوان لوگوں کی زبان بولتا ہے جن سے ہم زبان کی بنیاد پر علیحدہ ہوئے تھے، کالج کی لڑکوں کو ماتھے پر بندیا لگائے تو میں نے بھی دیکھا ہے جبکہ شادی یا ہبہ کی تقریبات پر تواب زیادہ تر دوہی راجستھانی گزیاں باندھے دکھائی دیتے ہیں۔

یہ تبدیلی کیسے آئی۔ یہ تبدیلی نئی دنیا سکرین کے ذریعے آئی۔ پہلے اس ملک میں بھارتی فلمیں آئیں، یہ فلمیں ہماری فلموں سے زیادہ مضبوط اور پراز تھیں۔ لہذا ہماری فلموں کے ناظرین ہندی فلموں کی طرف منتقل ہوئے لوگوں نے سینماوں کی بجائے وڈیو منصروں کا رخ کیا اور واپسی بھول گئے۔ پھر دشمن آئی اور پورا بھارتی ٹکپر پاکستانی میڈریوز میں داخل ہوا اور اب کیبل آچکی ہے پاکستان کا کوئی بھی شہری دوستیں سورہ پے دے کر پچھیں تمیں چینیں گھر لاسکتا ہے جو ایک مینے میں گھر بھر کی نفیات بدلتے ہیں۔ بھی پیٹی وی اس یلغار کے سامنے چٹان کی طرح کھڑا تھا، اس نے اس کا پھر پور مقابیہ کیا تھا لیکن پھر ہمارے اس میڈیم کو کسی کی نظر کھا کی، یہ بھی اس رنگ میں رنگ گیا جو ہمارے دشمن نے اڑایا تھا۔ یہ بھی اس دام میں پھنس گیا جو ہمارے دشمن نے پھیلایا تھا لہذا یقین تکچھے آج ہم اُن دی کے چینیں بدلتے ہیں تو ہمیں پتہ نہیں چلتا کہ سکرین پر پیٹی وی ظاہر ہوا اور کب زمیٹی نے اس کی جگہ لے لی۔ ہم دیکھتے ہیں سونی یا شارپس پر لڑکوں جیسا ایک لڑکا میک اپ کر کے گلے میں رنگ دار چادر لکائے اچھل کو درہ رہا ہے اور جب ہم اس بے ہنگام ناج سے اکتا کر پیٹی وی لگاتے ہیں تو وہاں بھی اسی قسم کی کوئی "چیز" دکھائی دیتی ہے! یہ کیا ہے؟ اس سے نہیں تو پاکستانی فلمیں دیکھیں ریشم، میرا اور ترمکے کپڑوں اور کرشمہ پکور، ارمیا اور کا جوہل کے لباس میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ موتیقی ہے تو بھارتی فلموں کی ساری دنیں، بول اور طرز میں ہمارے گلوکار گا رہے ہیں، سچ ڈرامے ہیں تو ان میں بھارتی گانوں پر رقص ہو رہا ہے۔ یہ کیا ہے، ہم کہاں جا رہے ہیں بلکہ ہم کہاں جا پچکے ہیں۔

یقین تکچھے اگر ہم نے اب بھی توجہ دی، اگر ہم نے اب بھی اس خطرے کی بونے سوکھی تو اندیشہ ہے شاید آنے والے برسوں میں اس ملک میں بست کے ساتھ ساتھ دیوالی اور ہولی کا تہوار بھی شروع ہو جائے۔ لوگ شادیوں میں اشلوک پڑھنے اور آنکی کے گرد سات پھیرے لینے لگیں۔ یقین تکچھے جو قومیں اپنی ثافت، اپنی تہذیب اور اپنے نظریے کی حفاظت نہیں کر سکتیں وہ قومیں اپنی سرحدیں بھی زیادہ دیرینگ محفوظ نہیں رکھ سکتیں۔ جاؤ جائیے خدا کے لئے جاؤ جائیے ورنہ بالٹا کرے جیسے لوگ لاہور میں بیٹھے ہوں گے اور قوم ان کی آرٹی ایواری ہو گی۔

یہ ایک گانی

سرور سے میری پہلی ملاقات جیل میں ہوئی تھی اور آخری بھی جیل میں۔

یہ 92ء کی ایک گرم دوپہر تھی، میں پنجاب کی ایک بڑی جیل کے ڈپی پرنسنڈنٹ کے دفتر میں بیٹھا تھا، وہ میرا کلاس فیلو تھا، میں بے روزگاری کی طویل سرگز سے گزر رہا تھا۔ میرے دوست نے ترس کھا کر مجھے اپنے کوارٹر میں چکدے رکھی تھی۔ وہاں میرے دو کام ہوتے تھے، لوگوں کی تلاش اور اپنے دوست کے دفتر میں بیٹھ کر عادی مجرموں کی نفیات کا مطالعہ، اس روز ہم دونوں کے پاس کرنے کے لئے کچھ نہیں تھا، میرا دوست سر جھکا کر میز پر شکست کا پیپر ویٹ گھما رہا تھا اور میں بوٹ کی ایڑیوں سے فرش پر طبلہ بجا رہا تھا۔ طبلہ بجاتے بجاتے میں نے سر انجیا اور اپنے دوست سے وہ ٹیکب مطالبہ کر دیا۔ میرے دوست نے لٹوگی طرح گھومتے ہی پہلے دو تھالے روکا اور مجھے ٹیکب کی نظر میں سے گھوڑا گروپاڑا زرا پھر منہ کھینچا۔ میں نے طبلہ بجانا بند کیا اور نہایت سمجھیدگی سے اپنا مطالبہ دہرا دیا "شیخ صاحب آج کسی ولپپ قیدی سے نہ ملیں۔" شیخ نے سمجھنی بھائی، جیل کی وردی میں ملبوس گردنیل ہر کارہ سامنے آ کھڑا ہوا "ذرا سرور کو تو نکال لاو۔" ہر کارہ واپس چلا گیا اور میرا دوست دوبارہ پیپر ویٹ گھمانے میں مصروف ہو گیا۔

یہ سرور سے میری پہلی ملاقات تھی، سرور کال کوٹھری کا قیدی تھا، کال کوٹھری میں بند تھا، اس کی ساری اپلیں مسٹر دھوچکی تھیں، اب وہ بڑی شدت سے ڈسٹھنگوارنٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ آ کر ہمارے سامنے زمین پر بیٹھ گیا، اس نے دیوار سے نیک لگائی، کان سے کے نو فلمز کا اونہ بجا سگریٹ اتنا را، سلگایا اور نہایت اطمینان سے سوٹے مارنے لگا، مجھے وہ دوسرے قیدیوں سے مختلف لگا، اس کا چہرہ مہرہ مجرمانہ نہیں تھا، اس کی صورت پر ایک وقار، ایک تمکنت تھی، گفتگو سے بھی وہ پڑھا لکھا، تجربہ کار اور ذہن لگتا تھا۔ آنے والی ملاقاتوں میں اس کے بارے میں میرے اندازے درست نہ لگے، وہ ایک ڈیرے دار چودھری تھا۔ پانچ سات دیہات میں اس کی اچھی خاصی محترم تھی، یونین کولیں کا چیزیں میں بھی رہا تھا، اس کے ڈیرے پر ہر وقت بیس تھیں بندے موجود رہتے تھے۔ زمین جائیداد بھی اچھی خاصی تھی، تعلیم بھی دیہات کے لحاظ سے بہت اچھی تھی۔ پھر سرور بلکہ چودھری سرور کال کوٹھری تک کیسے پہنچا۔ ایک باعزت، ڈیرے دار چودھری اپنے سے کہیں چھوٹے برخورداروں کے سامنے زمین پر کیسے آ بیٹھا، یہ سوال میرے ذہن میں کملانا لگے، میرا خیال ہے بھی

دو سوال اس وقت آپ کے دماغ میں بھی کانے کی طرح چھپ رہے ہوں گے لیکن ان سوالوں کے جواب پانے کے لئے آپ کو بھی میری طرح سرور کی کہانی سننا ہوگی۔ مجھے یقین ہے یہ کہانی آپ کا قیمتی وقت شائع نہیں کرے گی کیونکہ اس کہانی نے مجھے زندگی میں بڑے بڑے بچانوں سے بچایا، یہ کہانی ہر اس وقت میرے سامنے آ کھڑی ہوئی جب میں انسانیت کے دائرے سے نکل کر حیوانیت کے فار میں گرنے لگا۔ چودھری سرور نے کہا:

”چودھری میں ایک نحیک خاک چودھری تھا، مجھے اپنے اختیار، اپنی رسائی، اپنی عزت اور اپنی طاقت پر بڑا مان تھا، مجھے محسوس ہوتا تھا اللہ نے مجھے کسی خصوصی منی سے بنایا ہے، دنیا میں بچپن سے بننے کسی انسان میں اتنی جرأت نہیں دو، میرے سامنے آنکھ اٹھا کے، میرے لفظ، میرے حرف کاٹ سکے، میرے بات کو بات نہ سمجھے۔ میں زمین پر اکڑ کر چلتا تھا، میری گروں جھکنا بھول چکی تھی اور میرے کان میری اصل آواز کے لئے ترس گئے تھے۔ میں دن میں دو بار کپڑے بدلتا تھا اور لوگوں کے سامنے سے روپی اٹھا کر کتوں کے آگے ڈال دیتا تھا، میں نافرمانوں کو درختوں سے اٹاٹکا دیتا تھا اور خوشامدیوں کے گھر داؤں سے بھروسہ دیتا تھا، میں خدا کو بھول چکا تھا، میرا طیش، میرا غصہ اور میرا تکبیر میرا خدا ہیں چکا تھا۔ میں اپنے غصے ہی کو اپنا خدا سمجھتا تھا، پھر ایک دن عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک مصلی میرے گاؤں کی ایک لاکی بھگا لے گیا، مجھے اطلاع می تو غصے سے میرے منہ سے عج�گ نکلنے لگی، میں نے کھڑا تھاں کیا۔ ایک بُخت کے تعاقب کے بعد وہ دلوں مل گئے۔ میں نے لڑکی وارثوں کے ہوائے گردی لیکن مصلی و درخت سے باندھ دیا۔ میں لری بچھا کر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور اسے ماں بہن کی گالیاں دینے لگا۔ مصلی کچھ دری تک تو متarrہا لیکن پھر اس کا پیانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا ”چودھری قصور میرا ہے تم مجھے گالی دو، میری بہن اور ماں کو نہ ابھلانہ کہو۔“ اس کے الفاظ سن کر میرے تن میں آگ لگ گئی، مجھے یوں محسوس ہوا اس کم ذات نے میرے منہ پر تحوک دیا ہے، میں کری سے اٹھا، اسے بالوں سے پکڑ کر جھنکا دیا اور چلا کر کہا ”میں تیری ماں کو بھی گالی دوں گا اور بہن کو بھی، تو میرا کیا بگاڑ لے گا۔“ مصلی نے جھنکا مار کر بال چھڑائے اور جنگ کر بولا ”چودھری اگر تم نے اب گالی دی تو میں بھی تمہاری ماں بہن کو گالی دوں گا۔“ میرا غصہ ساتویں آسمان تک جا پہنچا۔ میں نے اس کے سارے خاندان کی ماں بہن ایک کر دی۔ جب میں چپ ہوا تو مصلی نے قبته لگایا اور مجھے ماں کی گالی دے دی، بس چودھری اتنا سننا تھا، میں نے پسول نکالا اور ساتوں کی ساتوں گولیاں اس کے سینے میں اتا رہیں اور پھر اس کے بعد وہ غش میرے گلے پڑ گئی، میرے خلاف کیس سیدھا اور واضح تھا الہذا مجھے سزاۓ موت ہو گئی۔ میرے واہیں، پس بیم کو رٹ تک گئے، صدر کو بھی اپیل کر کے دیکھ لی لیکن میری کوھری نہیں توئی، اب میں وہ وارثت کا انتظار کر رہا ہوں۔“

سرور نے سگریٹ کے ٹوٹے کا آخری سوٹا لگایا، فلٹر تک جلا سگریٹ فرش پر رگڑا اور آنسو پوچھ کر بولا ”چودھری میں وہ شخص ہوں جو ایک گالی برداشت نہ کر سکا لیکن جب میں بیل پہنچا تو مجھے روزانہ دو دو سو

گالیاں سننا پڑیں اور میرے پاس یہ گالیاں برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا، کاش میں اس وقت ایک گالی سہہ جاتا تو آج میرے سینے پر ہزاروں گالیوں کا بوجھنہ ہوتا۔ میں آج آپ کے سامنے یوں فرش پر نیشا ہوتا، آپ یقین کرو، جیل کی اس دس سالہ زندگی میں ایسے ایسے گھٹیا لوگوں نے مجھے ماں بہن کی گالیاں دیں جو بھی اچھے و قتوں میں مجھے دعا بھی دیتے تو شاید میں ان کے ساتھ ہاتھ طالتا پسند نہ کرتا۔"

میں چودھری سرور سے جدا ہو گیا، میرا وہ دوست بھی جیل کی نوکری چھوڑ کر باہر چلا گیا، میں بھی مختلف نوکریاں کرتا ہو ایک شہر سے دوسرے شہر اور دوسرے سے تیسرے شہر جا پہنچا لیکن ان آئندھوں سالوں میں مجھے جب بھی خصہ آیا، جب بھی کسی نے میری توہین کی، مجھے کسی سے اچھار سپانس نہ ملا اور اس کے جواب میں خون کھول اٹھا، میرا جی چاہا میں مخاطب کا من توز دوں، بد تمیزی کا جواب بد تمیزی اور توہین کا جواب نحیک شماک توہین سے دوں تو سامنے والی دیوار سے سرور اٹھ کر میرے سامنے آگیا، اس نے سگریٹ کا نوتا ساگا یا اور نہ کریوا "پی جاؤ چودھری پی جاؤ، یہ ایک گالی تھیں ہزار گالیوں سے بچائے گی۔"



جورب کی ماننے ہیں

اوناں کس یوتانی تا جر تھا۔ دنیا کی سب سے بڑی جہاز رانی کمپنی کا مالک تھا، زیتون کا کارروبا کرتا تھا، اسے دنیا کے امیر ترین شخص کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ امریکہ کی خاتون اول جنکو لیں کیندی سے شادی کی۔ زوال کا شکار ہوا اور مر گیا۔ اس کے انتقال پر ایک میں الاقوامی نیلی ویژن چینل نے اس کی زندگی پر دستاویزی فلم دکھائی۔ فلم میں اکشاف ہوا، اوناں کس ایک عجیب غریب مرغ کا شکار تھا۔ اس کے پوتوں کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔ وہ اپنی پلکیں نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ڈاکٹروں نے اس کے پوتوں پر "سلوشن شیپ" لگا دی تھی۔ جس کے باعث دن بھر اس کی آنکھیں کھلی رہتی تھیں۔ رات سونے کے وقت وہ سلوشن شیپ اتار دیتا۔ اس کے پوچھئے، اس کی پلکیں آنکھوں پر گر جاتیں، انہیں ہو جاتا اور وہ سوچاتا۔ صبح آنکھ کروہ دوبارہ شیپ لگوایتا۔ فلم میں جب اس سے وہی کی سب سے بڑی خواہش پوچھی گئی تو اوناں کچھ دیر سوچتا ہا اور پھر دیکھی لجئے میں بولا "کاش میں ایک بار، صرف ایک بار اپنی پلکیں خود اٹھا سکوں۔" پوچھنے والا پوچھتا ہے "اس خواہش کے عوض تم کیا دے سکتے ہو؟" اوناں نو رأجواب دتا ہے "اپنی ساری دولت اپنا سب کچھ۔"

ہمارے رب کا کرم دیکھئے، ہم اپنی پلکیں خود اٹھا سکتے ہیں۔ ہماری پلکوں کی یہ حرکات اوناں کی پوری دولت سے قیمتی ہے۔ پلکیں ہی کیا، ہمارے رب نے ہمارے جسم کو ایسی ایسی تعیین بخشی ہیں جن کا دنیا میں کوئی بدل نہیں۔ ان نعمتوں سے کوئی ایک کم ہو جائے تو ہم دنیا بھر کے خزانے اٹا کروہ نعمت دوبارہ حاصل نہیں کر سکتے۔ دل ہے ایک خود کار شین کی طرح دن میں ایک لاکھ تین ہزار چھ سو اسی مرتبہ دھڑکتا ہے۔ یہ دھڑکنیں کم یا زیادہ ہو جائیں تو ہماری زندگی کا رابطہ نوٹ جائے۔ یہ درست ہے ہم اب مصنوعی دل لگوایتے ہیں لیکن اس دل کے بعد زندگی کس قدر خوفناک ہو جاتی ہے ہم اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ ہماری آنکھیں ایک کروڑ دس لاکھ رنگ دیکھ سکتی ہیں، آنکھیں رنگوں کی شاخت کی یہ صلاحیت کھو دیں تو دنیا کا سارا سونا انسان کو اس کے رنگ نہیں لوٹا سکتا۔ ہماری زبان جیسی کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں ہوئی جو ذائقہ بتا سکے جو مولی کی ترشی اور سیب کی مٹھاس میں فرق کر سکے۔ قوت گویا ہی سائنس نے ابھی تک ایسا آلہ ایجاد نہیں بنایا جو گونے کے منہ سے لفظ نکال سکے، ہونٹ نہ ہوں تو ہم کھا سکتے ہیں، پی سکتے ہیں اور نہ ہی پوری طرح بول سکتے ہیں۔ 35 یہ صند لفظ اداگی کے لئے ہونٹوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ انسانی چہرے کی ستر نیحمد خوبصورتی کا انعام

گالوں پر ہوتا ہے اگر ہماری داڑھیں نکل جائیں، جبزے گل سڑ جائیں تو گال اندر ہوش جاتے ہیں۔ حسن ماند پڑ جاتا ہے، جبزے کی ایسی نیسیوں بیماریاں ہیں جن کا کوئی علاج نہیں۔ دنیا میں ابھی تک ایسا کمیکل ایجاد نہیں ہوا جو منہ میں لعاب پیدا کر سکتے، جن کا لعاب ختم ہو جاتا ہے وہ ہاتھ میں ہر وقت پانی کی بوتل رکھتے ہیں اُنہیں ہر دو منٹ بعد اپنی زبان گلی کرنا پڑتی ہے۔ انسانی ناک تین ہزار خوبصوریں سوگھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ خوبصوری کی یہ حس کھو جائے تو دوبارہ نہیں ملتی۔ انسان گلب اور چبڑے کی بوٹیں تیز نہیں کر سکتا۔ ہم ایک وقت میں سو لاکھ آوازیں سننے ہیں۔ آواز سننے کی یہ صلاحیت جواب دے جائے تو دنیا کی کوئی طاقت انسان کو اس کی آوازیں نہیں لو سکتی، انسان کے چہرے پر ایسے تین سو پاؤں کث ہوتے ہیں جن کی مدد سے وہ مسکراتا ہے، یہ پاؤں کث ہو جائیں تو چہرے سے مسکرات اڑ جاتی ہے۔ دنیا میں ابھی تک ایسی تکنیک ایجاد نہیں ہوئی جو مسکرانے کی صلاحیت سے عاری شخص کو ہشادے۔ انکو ٹھانہ ہو تو انسان اور بندر میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ ناخن نہ ہوں تو انسان کی کارکردگی 69 فیصد کم ہو جاتی ہے۔ پاؤں میں تنفس آجائے یا خدا نخواست پاؤں جواب دے جائیں تو بیخ اور انسان کی بھاگ دوزیر ابر ہو جاتی ہے۔ ریڑھ کی بڈی نے انسان کو چوپائے سے انسان بنایا، یہ بڈی نوٹ جائے تو چدید انسان ڈاروں کا قدیم انسان بن جاتا ہے۔ پھیپھڑے دن میں پندرہ ہزار مرتبہ سانس لیتے ہیں، سانسوں کی یہ تعداد کم یا زیادہ ہو جائے تو انسان، انسان نہیں رہتا۔ انسان کا پیشاب روکنے (وقت مانگ) کا نظام جواب دے جائے تو اچھا پھلا ہنسا گلًا جوان شخص انکوٹ پہن کر پھرتا ہے۔ جگر ختم ہو جائے تو انسان تیس چالیس لاکھ روپے میں جگر ٹرائس پلانٹ کرتا ہے لیکن یہ جگر صرف چھ ماہ اس کا ساتھ دیتا ہے۔ انسان کی نیند اڑ جائے تو اس کے لئے دن رات ایک ہو جاتے ہیں اور تو اور اللہ نے ہمیں بے ہوشی کی جوانیت عطا کی ہے انسان زندگی بھراں کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔ یہ دلعت ہے جو دکھ کو، جو تکلیف کو ایک حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتی۔ انسان کو بے ہوش کر کے دکھ اور تکلیف سے آزاد کر دیتی ہے قدرت جن لوگوں سے یہ نعمت چھین لیتی ہے ان کے لئے زندگی سے بڑا کوئی عذاب نہیں ہوتا۔

یقین کیجئے ہماری ایک ایک سانس، ہمارے بدن کا ایک ایک لحد اس کے کرم اسکے رحم اور اس کی عنایت کا اعلان ہے جس پر اس عنایت، اس رحم اور کرم کے سلسلے بند ہو جاتے ہیں وہ اوناں س ہو یا شاہ ایران۔ اس کی زندگی جر مسلسل ہو جاتی ہے۔ انسان گڑگڑا کر موت طلب کرتا ہے لیکن اللہ اس سے یہ نعمت بھی چھن لیتا ہے۔ اللہ حشر کے روز گنہگاروں کا حساب لے گا لیکن جو لوگ اس کی عنایت، اس کے رحم اور اس کے کرم کی فہرست سے خارج ہو جاتے ہیں دنیا اور آخرت دونوں اس کے لئے حساب گاہ، بن جاتی ہیں۔ عذاب گاہ ہو جاتی ہیں۔ بات اگر عذاب کی طرف آنکھی ہے تو ایک اور طرح کا عذاب بھی ہوتا ہے جس میں انسان کی آنکھیں تو کام کرتی ہیں وہ رنگوں میں تمیز تو کر سکتا ہے لیکن اس کی شناخت کی حس گم ہو جاتی ہے۔ اس کی زبان بولتی ہے لیکن لفظوں سے معنی اڑ جاتے ہیں۔ اس کے قدم اختنے ہیں لیکن منزلیں گم ہو جاتی ہیں۔ وہ سن سکتا ہے، پچکھ سکتا ہے، چھو سکتا ہے لیکن اس کا احساس

جواب دے جاتا ہے یہ عذاب صرف انسانوں پر نازل نہیں ہوتے یہ قوموں پر بھی اتنا کرتے ہیں۔ پوری پوری قوموں کی عقل پر پئی چیز جاتی ہے۔ وہ اپنے رب کی یاد سے غافل ہو جاتی ہیں اور اس سے ہذا عذاب بھی کوئی نہیں کہ انسان ایک رب کی بارگاہ سے نکل کر ہزاروں لاکھوں خداوں کی چوکھوں پر بجدہ رین ہو لیکن اسے کہیں پناہ نہ ملے، اسے کہیں امان نہ ملے۔ برناڑ شاہ نے کہا تھا ”انسان بھی عجیب چیز ہے ایک پتا، ایک مکھی نہیں بنا سکتا لیکن سینکڑوں ہزاروں خدا بنا سکتا ہے۔“ اللہ جب قوموں پر عذاب نازل کرتا ہے تو وہ تو میں ”خدا سازی“ میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ ہر نیا خوف انہیں ایک نئے خدا کی طرف لے جاتا ہے اور ہر خدا انہیں ایک نیا خوف تحفے میں دے جاتا ہے۔ ہم لوگ بھی میں جیث القوم انہی چھوٹے چھوٹے خداوں اور انہی خوفوں کا شکار ہیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ جو رب ہماری پتیوں میں ایک کروڑ دس لاکھ رنگ اتنا سکتا ہے وہ اگر چاہے تو ہمیں واحد چالی کے خوف سے رہائی بھی دے سکتا ہے لیکن کیا سمجھے میرا رب صرف ان کی ماننا ہے جو میرے رب کی ماننے ہیں۔



چوہے اور مائیں

ہم لوگ ابھی کالج میں تھے تو باؤ فیاض جرمی چلا گیا، باؤ کا خیال تھا اگر ہم نے پڑھ لکھ کر بھی نوکری ہی کرنی ہے تو پھر یہ کام ابھی سے کیوں نہ کیا جائے۔ اس نے کسی اجنبی کو پچاس سانچھے ہزار روپے دیئے اور فری نکفرت چلا گیا۔ جرمی میں اس نے باتحدر و مذہنے سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ باؤ ہوشیار آدمی تھا چنانچہ اس نے جلد ہی پاکستانیوں کا گروپ بنایا اور پوری پوری عمارت کے ٹولکش اور باتحدر و مزک کا تھیک لینے لگا۔ تحوزہ مدت بعد نے اس چند ڈیپرزر بھی اپنے گروپ میں شامل کر لئے۔ اب وہ باتحدر و مزک کی نوئیاں اور شادر بھی تھیک کر دیتا تھا۔ اس کا کام چل لگا۔ ڈیپرزر کے بعد لکڑی کے کارگیر آئے اور ان کے بعد راج مسٹری۔ باؤ فیاض آہست آہست اپنی خاصی قیمتی کا مالک بن گیا۔ پہنچ آگیا، گھر لے لیا، کاشتی خریپی لی، جب یہ ساری تخلیقات آگئیں تو اب لحر والی بھی چاہیے تھی۔ باؤ کے والدین چاہتے تھے وہ سرگودھا کے چک ہی سے کوئی دہن پسند کر لے لیکن باؤ جرمی پہنچ چکا تھا اور وہاں بھی اس کی پوزیشن تھیک تھا کہ تھی چنانچہ باؤ کسی خوبصورت گوری چھپی جرمن خاتون کے چکر میں تھا۔ یہ ٹولکش دو برس تک جاری رہی یہاں تک کہ ایک روز باؤ کے والدین کو جرمی سے خط موصول ہوا۔ میں نے شادی کر لی ہے آپ میرے لئے دعا کریں۔ ”باؤ کی ماں نے روتا پہنچنا شروع کر دیا۔

میری باؤ کے ساتھ دوستی تھی، وہ مجھے مسلسل خط لکھتا رہتا تھا، وہ اپنی ازدواجی زندگی سے خوش تھا۔ میں یونیورسٹی سے فارغ ہوا تو ایک روز مجھے باؤ کا خط موصول ہوا ”یار میری یہوی گھر چھوڑ کر چل گئی ہے، تینوں بچے میرے پاس ہیں۔ میں انہیں سنجاں نہیں سکتا، تم کسی طرح مان جی کو میرے پاس بیجھ دو۔“ میں اسی روز باؤ کے چک چلا گیا۔ مان جی جرمی جانے کے لئے تیار نہیں تھیں، وہ زندگی میں بھی سرگودھا تک نہیں چھیس اور یہ تو جرمی تھا۔ سات سمندر دور، میں نے مان جی کو کیسے متایا۔ انہیں دھوپی کرتے کی جگہ شلوار قیص پہننے پر کیسے مجبور کیا، ان کا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ کیسے ہوا یا اور آخر میں انہیں جہاز میں کیسے بخایا یہ ایک الگ داستان، ایک الگ کہانی ہے۔ بہر حال قصہ مختصر مان جی جرمی چل گئیں۔ دو تین میتھے آرام سے گزر چکے۔ میں روزگار کے چکر میں شہر شہر پھرتا رہا۔ ایک روز میں واپس لاہ موسی گیا تو باؤ فیاض کا خط میرا منتظر تھا۔

باؤ بہت خوش تھا۔ باؤ کا کہنا تھا۔ ماں جی نے آتے ہی گھر کا سارا نظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا، بچوں کی دلکشی بھال شروع کر دی، پھر مجھ سے میری بیوی کا ایڈریس لیا، میری کمپنی میں کام کرنے والے ایک لڑکے کو ساتھ لیا، میری بیوی کے پاس گئیں، اس پر پتہ نہیں کیا پڑھ کر پھونکا وہ شام کو اپنی کیس انداھا کرو اپس آگئی، ہم سب نمیک ہیں۔ میں، میری بیوی اور میرے بچے سب ایک چھت تلے مزے سے زندگی گزار رہے ہیں۔ ماں جی واپس آ رہی ہیں۔

میں یہ خط پڑھ کر حیران رہ گیا، ماں جی واپس آئیں تو میں ان سے ملنے چک گیا، ماں جی اولپوں کی آگ پر دودھ کی چنوری رکھ رہی تھیں۔ میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ بڑی خوش دلی سے جرمی کے قصے سنانے لگیں۔ دہاں کے لوگ کیسے تھے، عمارتیں، سڑکیں اور گاڑیاں کیسی تھیں۔ جب وہ سناتے سناتے تھک گئیں تو میں نے باؤ فیاض کی بات چھیڑ دی۔ نہ کہ بولیں، جرمی چنپتے ہی میں نے دھوتی پاندھی، میں شلووار میں بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ میں فیاض کے باور پی خانے میں گئی میں نے دیکھا وہاں چولہا بھی ہے برتن بھی لیکن کھانا پکانے کے کوئی آثار نہیں۔ میں نے فیاض سے پوچھا تو اس نے کہا "ماں ہم جب سے اس گھر آئے ہیں ہم نے ایک بار بھی چولہا نہیں جلایا۔ ہم پیکٹ میں بند ناشتے لے آتے تھے۔ بچے بھی وہ کھایتے تھے اور ہم دونوں بھی، دوپہر کو فتر سے کھانا کھاتے ہیں اور شام کو سب باہر سے لبذا کبھی چولہا جلانے کی نوبت نہیں آئی" ماں جی مسکرا کیں اور صریح اولپوں کو بچے لے کر یہ نہ لکھیں۔ چوبیس میں چنگاریاں ہی اونٹے الیں۔ "میں نے فیاض سے کہا، مورکھ جس گھر میں چولہا نہ جلے وہ گھر بھی آباد نہیں رہ سکتا۔ تم لوگوں نے سات سال تک چولہا جلایا اور نہ ہی ہانڈی پکائی پھر تم لوگ سکھی کیسے رہ سکتے تھے، فیاض نے کہا، اماں کیا جھالت کی باتیں کرتی ہو چو لہے کا گھر سے کیا تعلق، میں نے اس سے کہا اچھا دیکھو تم نے چولہا بجھا کر دیکھ لیا، اب مجھے جلا کر دیکھنے دو، تم جیت گئے تو تمہاری ساری سانس، ساری ترقی اور سارا علم جیت گیا۔ میں جیت گئی تو ہماری ریت، رسم کی سچائی ثابت ہو جائے گی۔ فیاض چپ چاپ باہر نکل گیا۔ میں نے سو دا منگوایا اور اس شام بسم اللہ کر کے گھر میں چولہا جلا دیا۔ بچے دروازے لے گکر جیرت سے بکھتے رہے۔ میں نے ہانڈی پکائی، روٹیاں لگائیں، بچے چادر بچھائی اور پھر بچوں کو بھٹکا کر ہاتھ سے کھانا کھلانے لگی۔ شروع شروع میں بچے لقر لینے سے پہلے منہ بناتے تھے لیکن پھر مزے لے لے کر کھانے لگ۔ اس رات فیاض نے بھی کھانا گھر ہی کھایا۔ چند دنوں بعد گھر کی حالت ہی بدل گئی۔ میں کھانا پکاتی اور بچے خود ہی چادر بچھا کر بیٹھ جاتے، فیاض اور اس کے دوست بھی کھانے کے وقت گھر آ جاتے یوں وہ گھر جس میں بھی ہو کا عالم ہوتا تھا اس میں زندگی آگئی۔ چھل پکل ہو گئی قیفیتے لکنے لگے۔ پھر ایک روز میں اپنی بہو کے گھر چل گئی۔ اسے سمجھایا اور ساتھ لے آئی یوں میرے فیاض کا گھر دوبارہ آباد ہو گیا۔"

ماں جی کے آخری فقرے پر میں نے جیرت سے ان کی طرف دیکھا، وہ مسکرا کیں "تم سوچ رہے

ہو، وہ اماں جو پنجابی کے سوا کوئی لفظ نہیں جانتی اس نے جمن لڑکی کو کیسے سمجھا لیا۔ ”میں شرمند ہو گیا۔ مان جی نے تھہہ لگایا“ بے دوقوف اماں کے پاس ایک ایسی زبان ہوتی ہے جسے صرف بیٹی سمجھ سکتی ہے بیٹی دنیا کے کسی کو نہیں میں ہو، اس کا تعلق کسی رنگ، نسل اور زبان سے ہو مان جو نہیں اس کے پاس پہنچتی ہے وہ بغیر بات سے اس کی بات سمجھ جاتی ہے، میں نے اس کے گھر میں داخل ہو کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، اس کے ماتھے پر بوسا دیا اور وہ میرے گلے لگ کر رونے لگی۔ وہ بھی روئی رہی اور میں بھی۔ جب آنسو رکھ کر تو میں نے اس سے پنجابی میں کہا ”پتر خاوند کا گھر ہی اپنا ہوتا ہے، میں تمہیں لینے آئی ہوں۔“ مان جی رکیں اور آہستہ سے بولیں ”تم مرد بے دوقوف ہوتے ہو، تم نہیں جانتے، ماں میں اور چوبے کتنے قیمتی ہوتے ہیں۔ جن گھروں میں ماں نہ ہوان میں سکون نہیں ہوتا اور جن گھروں میں چوبے نہ جیں وہ گھر بھی آباد نہیں ہوتے۔“



اون کا گولا

گیندی آئی اور سیدھی میرے سر پر آگئی، میں نے خوفزدہ ہو کر اوپر دیکھا، بالکلوں میں یو پلے من والی بڑھیا بیٹھی تھی اور اس کے ساتھ اس کا ایک ہم ایک عمر بڑھا جیوں میں ہاتھ دیئے کھڑا تھا۔ دونوں کے چہروں پر کریلے کے خول جیتی جھریاں تھیں اور گرد نیس پرانی روئی گھریوں کے پنڈوں کی طرح مل رہی تھیں، بڑھیا نے تھیف ساق تھبہ لگایا اور تھوڑا سا شرم کر بولی "میرا اون کا گولا....." میں نے نیچے جھک کر دیکھا، میرے قدموں میں سخید اون کا گولا پڑا تھا جس میں سے ایک تار نکل کر اوپر بالکلوں کی طرف جا رہی تھی، میں ہنس پڑا، میں نے گول انھیا اور اوپر بالکلوں کی طرف اچھال دیا۔

یہ ایس اور فریڈرک سے میری کلی ملاقات تھی، ایس کی مر 78 ماں تھی اور فریڈرک 82 برس گزار چکا تھا، دونوں کو پنائیکن کے ملاقات کے ایک فلیٹ میں رہنا رُزندگی گزار رہے تھے، اس فلیٹ سے پہلے وہ بڑھوں کے سرکاری ہائل میں رہتے تھے، وہاں ان کا دم گھنٹا تھا لہذا وہ خصوصی اجازت لے کر اس فلیٹ میں اٹھا آئے، یہاں روز نرک اور ڈاکٹر آتے، ان کا معافانہ کرتے، انہیں خصوصی آئے دیئے گئے تھے جن کے الارم قریبی ہسپتال میں تھے، یہ دونوں چوبیس گھنٹے ہسپتال اور ڈاکٹر کی گلری میں رہتے تھے لیکن اس کے باوجود دن ان کے لئے دن اور رات گزارنا مشکل تھا، یہ دونوں میاں یہوی صبح اٹھ کر بالکلوں میں آبیستھے اور پھر شام گئے تک میٹھے رہتے، میں اس بلاک کے ایک فلیٹ میں "بوپی" کے پاس پھررا ہوا تھا۔ میرا دوست بوپی بھی یہم رہنا رُزندگی گزار رہا تھا۔ چند دن کے آمنے سامنے ایس اور فریڈرک میرے دوست بن گئے، میں دن میں ایک آدھ بار ان کے فلیٹ کا چکر لگایتا، مجھے اپنے گھر میں دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتے، اس آمد و رفت کے بعد مجھے معلوم ہوا ایس اور فریڈرک کے تین بچے ہیں، دو بیٹے، ایک بیٹی، یہ تینوں بچے کو پنائیکن ہی میں رہتے ہیں لیکن انہیں اپنے بچوں سے ملے دو دو سال گزر جاتے ہیں۔ ان کا اپنے بچوں سے بس کارڈز کا رابط تھا اس کے لئے بھی ان کے بچوں نے ایک گوریز سرہی کو دس سال کے لئے یکشتم رقم جمع کرادی تھی۔ گوریز سرہی اس کے پیش ایونٹ پر کارڈ اور پچوں کی طرف بے انہیں پہنچا دیتی تھی۔ مجھے معلوم ہوا بڑھی ایس پچھلے دو سال سے اپنے پوتے کے لئے سویٹر بن رہی ہے لیکن ابھی تک سویٹر کا ایک بھی بازو مکمل نہیں ہوا

کیونکہ وہ ایک ہفتہ بنائی کرتی ہے اور دوسرا سے بھتے اسے ادھیڑ دیتی ہے، سو یہر کی بنائی نے ان دونوں کو ایک عجیب سکھیل دے دیا، وہ دونوں بالکلوں میں کھڑے ہو جاتے ہیں، اپس نیچے سے گزرنے والوں پر اون کا گولا پھینک دیتی ہے، ان کا ہدف گھبرا کر اوپر دیکھتا ہے، وہ دونوں اس سے معدتر کرتے ہیں اور یوں دو تین فقروں کے بیاد لے سے ان کا بیرونی دنیا سے رابطہ استوار ہو جاتا ہے، مجھے معلوم ہوا دونوں بولنے والے کھلونے خریدتے رہتے ہیں، وہ بیٹری کے بھالوں کو گیند مارتے ہیں، بھالوں کھول کر قبچہ لگاتا ہے اور دونوں خوش ہو کرتا یاں پہنچتے ہیں۔ تجھائی دور کرنے کے لئے دونوں نے فلیٹ میں دو شیلی فون لگوار کئے ہیں، دونوں آواز بدل کر شیلی فون پر گھنٹوں ایک دوسرے ہی سے بات کرتے رہتے ہیں۔ اگر کبھی فون پر رانگ کال آجائے یا کسی ادارے کا کوئی کارکن فون کر پیشے تو دونوں بھوکوں کی طرح فون پر جھپٹتے ہیں۔

میں نے ایک دن بوبی سے کہا "یار یہ اس بابے مائی کے ساتھ کتنا ظلم ہے، ان کے بچوں کو ان پر ترس نہیں آتا۔" بوبی نے قبچہ لگایا "پورا ڈنمارک اس قسم کے بابوں اور ماں سے بھرا ہے۔" بوبی کی تاویل کے باوجود میں نے اپس اور فریڈرک کے بچوں کو سمجھانے کا فیصلہ کیا، میں نے ان کے بڑے بیٹے کا ایڈریس لیا اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ ان کا بڑا بیٹا وائکنگ سٹریٹ کے ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ میں اس سے ملا، وہ پینکار تھا۔ بڑی محبت اور تپاک سے ملا، میں نے اپس اور فریڈرک کا ذکر، ان کی حالت زار بیان کی۔ اس نے بہت افسوس کا انکھار لیا، وہ دری تک تاسف سے ہاتھ ملتا رہا۔ میں نے دیکھا اس کا تاسف، اس کا افسوس "مکینیک" ساتھا، بالکل ایسے جیسے کوئی حساس شخص آسٹریلیا کے گینگروں میں کینٹر کے آثار دریافت ہونے پر پریشان ہو جاتا۔ مجھے اس کے تاسف اس کے افسوس میں مال اور بچے، باپ اور بیٹے کی ترب پ نظرہ آئی۔ رشتے کا وہ درد، خون کی وہ گرمی دکھائی نہیں دی جو ہونی چاہیے تھی۔ اس بینکار نے ویک اینڈ پر مال باپ کے پاس آنے کا وعدہ بھی کیا لیکن یہاں بھی مجھے یہ وعدہ بہت سی مصروفیات میں سے ایک مصروفیت محسوس ہوا۔ مجھے لگا وہ اس ملاقات کو اپنے بڑنس کا حصہ سمجھ رہا ہے یا پھر اپنا اخلاقی فرش، اس وعدے میں وہ چیز نہیں تھی جو ہونی چاہیے تھی، مجھے سے رہا نہ گیا۔ میں نے اپنی ابزر ویشن اس کے سامنے رکھ دی، وہ دری تک خاموش رہا۔ پھر اس نے سراخایا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے گوگیر آواز میں کہا "اے میرے اجنبی! دوست! ہم میں اور ہمارے والدین میں وہ تعلق، وہ رشتہ استوار ہی نہیں ہو سکا جسے تم تلاش کر رہے ہو، ہم پیدا ہوئے تو ہماری ماں ایک خوبصورت جوان عورت تھی، وہ اپنی جوانی اور خوبصورتی میں اتنی مصروف تھی کہ اس نے بچپن میں ہمیں ماں ہونے کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ہمارا باپ ایک مصروف بڑنس میں تھا، وہ سولہ سترہ گھنٹے دفتر رہتا تھا، ہر دوسرے تیسرا دن دوسرے پر چلا جاتا تھا، اس کا "ویک اینڈ" دوستوں کے ساتھ "پچھر" پر گزرتا یا شراب خانوں اور کلبوں میں، ہمیں اس سے ویک اینڈ کے لئے مہینوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ اس سے گھنٹوں، اس سے بات چیت کے لئے سکرٹری کی مدد لینا پڑتی تھی لہذا ہم تینوں بھائیوں نے اپنا بچپن،

اپنا لڑکپن والدین کے ہوتے ہوئے تیموں کی طرح گزارا، جب ہم بڑے ہوئے تو ہم نے پرندوں کی طرح گھونٹے چھوڑ دیئے۔ والدین اس وقت ادھیڑ عمر تھے۔ ان کے کشکول میں ابھی جوانی، ابھی لطف کے چند سکے موجود تھے۔ انہوں نے ہمارے کوچ، ہمارے فرار کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ انہوں نے ہمیں واپس لانے، ہمیں منانے کی کوشش نہ کی، ہم آگے بڑھتے گئے، وہ چیچھے کھکھتے گئے یہاں تک کہ وہ بوڑھے ہو گئے، ان کے کشکول خالی ہو گئے، وہ اکیلے ہو گئے، تنہا ہو گئے۔ آج انہیں ہماری ضرورت ہے بالکل اسی طرح جس طرح کبھی ہمیں ان کی ضرورت تھی لیکن ہوتا کیا ہے! ہم بھی انہیں اسی طرح چیک کاٹ کر بیچ دیتے ہیں، پھول اور کارڈ بیجوہ دیتے ہیں جس طرح وہ تیس چالیس سال پہلے ہمیں بیچ دیتے تھے۔“ میں واپس آگیا۔

پاکستان آ کر میں ایس فریڈرک اور ان کے بینکار بیٹے کو بھول گیا لیکن آج صبح جب گھر سے نکلنے کا اور میرے بیٹے نے میرا ہاتھ پکڑا کر پوچھا ”پاپا آپ ہوتے کہاں ہیں، آپ سے ملاقات کرنی ہو تو کہاں کی جا سکتی ہے۔“ تو میں نہیں کر رک گیا، مجھے فوراً ایس اور فریڈرک یاد آ گئے، مجھے یاد آ گیا، مجھے تو اپنے بچوں سے ملے ہوئے عرصہ ہو چکا ہے، جب میں جا گتا ہوں تو وہ سکول جا چکے ہوتے ہیں۔ میں رات گئے واپس آتا ہوں تو وہ میری راہ دیکھ دیکھ کر سوچکے ہوتے ہیں، مجھے لگا زندگی کی اس بھاگ دوڑ میں میرا نام بدل چکا ہے، میں چیکے سے فریڈرک ہو چکا ہوں، مجھے محسوں ہوا میرے چہرے پر کریلے کے خول جیسی جھریان پر چکی ہیں اور میں اپنی تنہائی دور کرنے کے لئے اجنبیوں پر اون کے لوے پھینک رہا ہوں۔



شاید اسی کو طاقت کہتے ہیں

نجف کی جگہ بھی دنیا کا بلند ترین پہاڑ ہوتا تھا۔ سیاہ آیا۔ نافرمان قوم کے لوگ جان بچانے کے لئے بھاگے، حضرت نوح کا ایک گستاخ بیٹا بھاگ کر اس پر چڑھا اور پہاڑ سے پناہ مانگنے لگا۔ حکم ہوا ”اے پہاڑ ریت بن جا“ اور دنیا کا بلند ترین پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا۔ یہ ریزے آج تک نجف کے ریگ زاروں میں اڑتے پھرتے ہیں۔ صرف نجف ہی نہیں عراق کا چپ چپ اپنے وجود میں کوئی نہ کوئی کہانی، کوئی نہ کوئی حقیقت چھپائے جیسا ہے۔ عراق کے معنی ہیں اصل یا بنیاد ہیں۔ آپ دنیا کے کسی خلی، کسی تہذیب اور کسی معاشرت کی تاریخ انداخت کر دیکھ لیں آپ کو اس کے ذائقے عراق سے ملتے دکھائی دیں گے۔ یہ وہی ملک ہے جس میں اربیلانام کا ایک شہر تھا جسے دنیا کا قدیم ترین شہر ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ یہ آج بھی اربیلان کے نام سے قائم ہے۔ یہ وہی عظیم سرزمین ہے جس پر حضرت آدمؐ کی قوبہ قبول ہوئی۔ حضرت نوح نے اپنا مسکن بنایا۔ جس پر حضرت یوسف کو مجھلی کے پیٹ سے رہائی ملی، جس پر حضرت اوریس اور حضرت حضرت رہائش پذیر ہوئے، جس پر حضرت ابراہیمؐ کی ولادت با سعادت ہوئی، جس پر بابل اور نینوا کی قدیم ترین تخلیل پائی، جس پر جنگی رتحہ ایجاد ہوئے، جس پر تجارت نے باقاعدہ پیش کی شکل اختیار کی، جس پر دنیا کی پہلی منڈی بی، جس پر کرنی ایجاد ہوئی جس پر ناپ تول کے نظام کی بنیاد رکھی گئی، جس پر تجارتی معاهدوں، بھی کھاتوں اور رسیدوں نے جنم لیا۔ جس پر دنیا میں پہلی بار اشیاء صرف کی قیمتیں حکومت نے مقرر کرنا شروع کیں، جس میں مزدوروں کی سرکاری اجرت ملے ہوئی، جس میں پہلی بار شہری حقوق اور قوانین کا مجموعہ تیار ہوا، جس میں دن چونیں گھنٹوں، گھنٹے سانچھے منٹ اور منٹ سانچھے سینڈ میں تقسیم ہوئے، جس میں 2 ہزار 8 سو 50 سال قبل سعی میں پہلا شاہی خاندان اور پہلی شہنشاہی قائم ہوئی، جس کے شہر کلانی میں دنیا کی پہلی لا ابھری قائم ہوئی، اس لا ابھری میں ایشوں کی کتابیں رکھی گئیں، جس میں جادو، ثونے، نوکے، سحر، نجوم، رمل اور پامسری کی بنیاد رکھی گئی، تبلیغ اسلام کے بعد جسے حضرت علیؓ نے اپنا مسکن بنایا، جس کی خاک نواس رسول ﷺ کے اہو کی گواہ بی، جس میں حضرت ابوحنیفہ، خواجہ حسن بصری، حضرت رابعہ بصری اور غوث پاک حضرت عبدالقدار جیلانیؓ نے فیض بکھیرا، جس میں معلق باغات بھیے جو بے اور چاہ بابل بھیے عبرت کدے ہیں اور جس کے رہنے والوں میں سے ایک راستے بال عدن کی طرف لکھتا ہے۔

یہ عراق ہے دنیا کا سب سے بڑا باغ گھر، دنیا کی قدیم ترین تہذیب، جس کا چپ چپ آثار قدیمہ کی جیش رکھتا ہے، جس میں دنیا کی تمام تہذیبوں کے آثار اور تمام معاشرتوں کے نقوش چھپے ہیں۔ جو تہذیبوں کی ماں ہے اور جس کے بغیر دنیا وجود نہیں اور معاشرت بیوہ ہے۔ دنیا کی تہذیبوں کے دو دھارے ہیں۔ بیت المقدس اور عراق۔ آج تک دنیا کے مورخین یہ طے نہیں کر سکتے تہذیب کا بہاؤ عراق سے بیت المقدس کی طرف تھا یہ دھارا القدس سے عراق کی طرف بہتا رہا۔ آپ آثار قدیمہ کے ماہرین کی نظر سے دیکھیں۔ عراق کی ایک ایک انج زمین انتہائی قیمتی، انتہائی قدیم ہے۔ آپ مورخین کے زاویے سے پرکھیں، دنیا کی تاریخ سے عراق خارج کر دیں زمین کا سارا حسب نسب بگڑ جائے گا۔ گویا عراق ایک باغ گھر، ایک قدیم نقش اور کروزوں سال کی گرد میں پچھا ایک تاج، ایک بیڑا ہے۔

اہل مغرب کی بے شمار خوبیوں میں سے ایک خوبی ان کی تاریخ، بیان اور آثار قدیمہ سے شدید محبت ہے۔ ابوابویں کے کافوں کی لوہو یا احرام مصری بنیادوں کا پانی، الور کے غار ہوں یا سکندر کے گھوڑے کا مرقد، ہزار ہوں یا موت بخوداڑو کی شکست گھیاں اہل مغرب کی روحمیں ان کے لئے بے پیش رہتی ہیں۔ آپ عہد قدیم کے آثاروں سے ان کی محبت کا اندازہ اس سے لگا جائے، طالبان نے 2000ء میں بامیان کے پہاڑوں پر کھدے مجسمے توڑنے کا اعلان کیا تو سارا مغرب جیخ اٹھا۔ امریکہ کی بیکی حکومت تھی، بیکی لوگ تھے، برطانیہ کا بیکی بلیغ تھا جس نے اس ظلم کو تاریخ کے جاتا تھا برا دلی قرار دیا۔ جس نے اسے بودھ ملت کے چیزوں کا مذہبی بے عزمی اور روحانی توہین کہا تھا۔ جس نے کہا تھا تاریخ اور قدیم آثار کسی ایک قوم، کسی ایک خلیل کی ملکیت نہیں ہوتے۔ یہ پوری دنیا، پوری نسل انسانی کا ورثہ ہوتے ہیں۔ بیکی امریکی اور برطانوی حکومتیں تھیں جنہیں نے کہا تھا آثار قدیمہ کے دشمن پوری دنیا کے حریف ہوتے ہیں لیکن آج تاریخ، نقوش قدیم اور پرانے آثاروں سے محبت کرنے والے بیکی لوگ خود انسانی تاریخ پر بمگارہ ہے ہیں۔ بامیان کے بتوں سے تو چند لوگوں کے دل جڑے تھے لیکن عراق تو انسانی تاریخ میں نہیں کی طرح پھیلا تھا۔ اس کے پیچے پیچے پر انبیاء، کرام، اولیاء اللہ اور صاحبوں طریقت کے نقش ہیں۔ بامیان تو چند ہزار، چند لاکھ یا پھر چند کروڑ لوگوں کی عقیدت گاہ تھا لیکن کربلا کی خاک میں تو ایک ارب 45 کروز مسلمان کی روحسی الجھی ہیں۔ بامیان تو ایک پہاڑ کا نام تھا جس پر دو مجسمے تھے اور لوگ ان جسموں کے وجود تک سے ناواقف تھے لیکن عراق تو خانہ کعبہ اور بیت المقدس کے بعد مسلمانوں کی تیسری مقدس سرزمیں ہے۔ عجیب بات نہیں بیش ہو یا نوئی وہ جب چاہتے ہیں ایک پہاڑ کو نسل انسانی کا ورثہ فراہدے دیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں پوی نسل انسانی کے دریے کو ریت کا ذہر بنادیتے ہیں۔ شاید اسی کا نام طاقت ہے، شاید جھوٹ کو جی اور نیش کو پہاڑ فراہدینے کی استطاعت ہی کو طاقت کہتے ہیں۔ شاید پہاڑ کو رائی اور رائی کو پہاڑ بنانے والے جادوگر ہی طاقتوں ہوتے ہیں۔ شاید نیش کی طرف بہتے پانی اسی کو طاقت کہا جاتا ہے۔ بہر حال یہ طے ہے جھوٹ کیا ہے اور جی کیا، بلند کیا ہے اور پست کیا اس کا فیصلہ طاقت کرتی ہے اور آج کی طاقت کا نام بیش ہے!



زندگی

انہیں بعض اوگ لوائی خور کہتے ہیں اور سچھ خوار، یہ لوگ بیانادی طور بحکاری ہوتے تھے لیکن ذرا دکھری نائپ کے، یہ لوگ سر شام نو نے جام لے کر شراب خانوں کے سامنے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اندر دور پر دور چلتا رہتا تھا۔ اس دوران انگر کسی کی نظر ان پر پڑ جاتی اور اسے ان پر رحم آ جاتا تو وہ باہر آ کر پیانے سے چند گھونٹ ان کے پیالے میں انڈیل جاتا، یہ لوگ غنائمت چڑھا جاتے اور باقی رات اس سخن کی مذاق سرائی میں گزار دیتے۔ کہتے ہیں محمود غزنوی آخری ہم کے لئے غزنی سے نکلنے لگا تو نشے سے نوٹا ہوا ایک لوائی خور اس کے راستے میں کھڑا ہو گیا، لوائی خور نے سلطان سے پوچھا "کہاں جا رہے ہو؟" "محمود نے جواب دیا" ہندوستان کے اندر جسے مندرجہ میں پڑا رہتے گے چنانچہ جلد اپنا لوائی خور نے قبضہ لگایا اپنا اونٹا جام اتنا لیا اور گستاخ لجھے میں بولا" ہاں ہاں جاؤ، ہندوستان جاؤ، غزنی کے آسان پر تو تم نے جتنے ستارے ٹانکنے تھے ناک دیئے" محمود غزنوی آگے بڑھ گیا۔ دریائے سندھ کے جانوں کو شکست دی، واپس آیا اور پھر کہیں نہ جاسکا۔

ایسے لوائی خور صرف تاریخ میں ملتے ہیں۔ ان میں سے آج ایک بھی "پیس" ہوتا تو وہ یقیناً "ناسا" کی یہ رپورٹ پڑھ کر ضرور قبضہ لگاتا جس میں دنیا کے بہترین سائنس دانوں نے امکشاف کیا "مرنٹ پر انسانی زندگی کو دوام مل سکتا ہے۔" یہ لوائی خوار بھی اپنا نوٹا جام اتنا تا، بھوکے پیٹ پر ہاتھ مارتا اور گستاخ لجھے میں کہتا "جو لوگ زمین سے زندگی کا پودا اکھاڑ رہے ہیں وہی مرٹ پر زندگی کے آثار تلاش کر رہے ہیں وہ مولہ وادا" بات صرف لوائی خوار کی نہیں، کوئی بھی باہوش، باخبر اور باخیر ٹھنڈھ اس مذاق پر قبضہ لگا سکتا ہے۔ ذرا سوچنے ناسا جیسا ادارہ ہر سال اس تحقیق پر اربوں ڈالر خرچ کر دیتا ہے کہ کیا مرٹ پر انسان زندہ رہ سکتا ہے لیکن وہ لوگ جو ناسا کو اس ریسرچ کے لئے قند فراہم کرتے ہیں وہ زمین سے زندگی کے آثار بھی مٹاتے جا رہے ہیں۔ اس زمین جس کی رصد گاہیں، لیبارٹریاں اور ریسرچ سنٹر قائم فلکی کی رگوں میں زندگی کے امکانات تلاش کر رہے ہیں اسی زمین پر جنگ کے وہ مہلک بیچ بوئے اور کائے جاتے ہیں جو انسان پر زندگی کا دائرہ مختصر سے مختصر کرتے جا رہے ہیں۔

دنیا میں دو عظیم جنگیں ہوئیں جنگ عظیم اول اور جنگ عظیم دوم، پہلی جنگ پر چار ہزار پانچ سو بلین

ڈالر خرچ ہوئے، کروڑوں لوگ مرے۔ دوسری پر 13 ہزار بیکن ڈالر صرف ہوئے اور کروڑوں لوگ مرے۔ ان جنگوں کے بعد دنیا نے جنگ نہ کرنے کا فیصلہ کیا لیکن 1945ء سے 1994ء تک دنیا میں 107 خوفناک جنگیں ہوئیں، جن میں مجموعی طور پر ایک کروڑ 90 لاکھ 73 ہزار لوگ مارے گئے۔ ان مرنے والوں میں سے 4 لاکھ 77 ہزار کا تعلق لاطینی امریکہ 9 لاکھ 93 ہزار مدل ایسٹ اور نارتھ افریقہ، 41 لاکھ 64 ہزار سب سہارن افریقہ، ایک لاکھ 88 ہزار یورپ، 28 لاکھ 57 ہزار سنترل اور جنوبی ایشیاء اور ایک کروڑ 3 لاکھ 96 ہزار مشرقی ایشیاء کے رہنے والے تھے۔ ان 107 جنگوں میں سے 16 انتہائی غیر معمولی جنگیں تھیں جن میں سے کوئی جنگ پر 3 سو 40، ویتنام 7 سو 20، لبنان 77، افغانستان (روں کے خلاف) ایک سو سو، ایران عراق ڈیزیہ سوا دریچ کی جنگ میں ایک سو دو ارب ڈالر خرچ ہوئے۔ اس وقت بھی دنیا کے 68 ممالک میں جنگیں ہو رہی ہیں جن میں سے 46 بڑے تازگوں پر ہر سال 18 ہزار ایک سو 96 بیکن ڈالر خرچ ہوتے ہیں جبکہ ان 46 تازگوں پر اب تک ایک لاکھ 95 ہزار پانچ سو 7 بیکن ڈالر خرچ ہو چکے ہیں۔ اس وقت دنیا کے 14 ممالک پر اقوام متحدہ کی اسن فوج کے 29 ہزار 7 سو 59 فوجی میٹھے ہیں۔ جن پر 2000-1999ء میں 8 ہزار 5 سو 24 بیکن ڈالر جبکہ 2000-2001ء میں 2 ہزار 2 سو 39 بیکن ڈالر خرچ ہوئے۔ اقوام متحدہ جنگ عظیم دوم کے بعد مختلف متنازع علاقوں میں اب تک ایک لاکھ ستر ہزار پانچ سو میں اسن فوجی تعینات کر رکھی ہے۔ جن پر 14 ہزار 28 بیکن ڈالر خرچ ہوتے ہیں۔ اولاد دہشت کروی کے خلاف جنگ کی آڑ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی دنیا سے ڈھکا چھپا نہیں، گردیز کے قریب واقع ایک گاؤں کا قبضہ لینے کے لئے اتحادیوں نے گیارہ دنوں میں اڑھائی ہزار مہلک بم بر سائے جب قبضہ ہو گیا تو معلوم ہوا وہاں القاعدہ اور طالبان کا ایک بھی "سپاہی" نہیں تھا۔

یہ ہے دنیا کی اصل صورت حال! اس دنیا جس میں پاکستان جیسے ملک کا نوٹل بجٹ دس سے گیارہ بیکن ڈالر سالانہ ہوتا ہے لیکن دنیا ہر سال سات سو 80 بیکن ڈالر ہتھیاروں کی خرید و فروخت پر صرف کر دیتی ہے جبکہ جنگوں میں ہر سال ہزاروں، لاکھوں لوگ مارے جاتے ہیں اور ان سے کمیں زیادہ زخمی ہو جاتے ہیں۔ اس دنیا میں 29 ممالک کے پاس پینے کے لئے پانی نہیں، دنیا کے ایک ارب لوگ کھلے آسمان سے پڑے ہیں اور ایک ارب انسانوں کو اقوام متحدہ کے ادارے غریب ڈیلیسٹر کر چکے ہیں۔ اسی دنیا میں ماں میں بچوں کو روٹی کی جگہ زہر کھلاتی ہیں۔ لوگ کھانے کے بد لے گزدے اور آنکھیں بیچتے ہیں، اسی زمین، اسی کرہ ارش پر کروڑوں بچے کھرا گھروں سے رزق نکال نکال کر کھاتے ہیں لیکن ہر روز نیا بم، نئی گولی اور نئی رائلن بنائی اور نیچی جاتی ہے، اس زمین پر اتنی بارودی سرگیں بچھے پکھی ہیں کہ اگر وہ بیک وقت پہٹ جائیں تو دنیا کی آدمی سے زائد آبادی معدود ہو جائے جبکہ سرگیں تلاش کرنے اور انہیں مخفیا کرنے کے لئے دنیا کو اب اقوام متحدہ جتنے آنکھ ادارے چاہتیں۔ یہ ہے دنیا، اسے کہتے ہیں زمین، وہ زمین، وہ دنیا جس پر اب خوف، دہشت، دکھ،

غم، موت اور قبروں کے سوا کچھ باقی نہیں لیکن ناساموت کے ان جزوؤں میں بینخ کر من خ پر زندگی کے آثار دریافت کر رہا ہے۔ وہ یہ بھی کیا مذاق ہے!

یہ انسان بھی کیا چیز ہے بارودی سرگن پر گلاب کی قلم لگاتا ہے، پھر اس کے بھلنے پھولنے کے خواب دیکھتا ہے اور پھر سوچتا ہے اس سے دنیا میں اُن ہو جائے گا، کیا ایسا ہو سکتا ہے، کیا ایسا ہو گا۔ موت بوکر زندگی کاٹی جائے۔ انسانی کھوپڑی پر کھڑے ہو کر من خ پر زندگی مٹولی جائے کیا یہ ممکن ہے؟۔



اگر ایسا ہوتا، اگر ویسا ہوتا

میری نوجوان سے پہلی ملاقات کراچی میں ہوئی، وہاں کوئی تقریب تھی۔ میں ہال سے نکل رہا تھا، وہ آیا اور اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں اسے اپنے ساتھ ہوٹل میں لے گہا۔ وہ ایک گھنٹہ میرے ساتھ رہا۔ مجھے آج یاد ہے اس کی ہربات کی تان "پاکستان نے ہمیں کیا دیا" پر نوٹی تھی، اس کی گفتگو، اس کی باتوں میں ملک کے خلاف نفرت تھی، نظام اور حالات کے خلاف شکایت تھی، مجھے محسوں ہوا حالات کی تھی، معاشرتی بے انسانی اور ایک طویل بے روزگاری اسے آتش فشاں ہنا پچھی ہے۔ اس کے اندر نفرت اور شکایت کا کھولتا لاوا ہے جسے بننے کے لئے راست نہیں ملتا تو وہ ملک پر آنکھا ہے۔ اس کی جھوپی شکایت کی کنکریوں سے بھری ہے، وہ کنکریاں ایک ایک کر کے ملک پر ہے ساڑھا ہے، وہ کہتا تھا جو ملک روزگار نہیں دے سکتا، انصاف اور امن نہیں دے سکتا اس کی کیا ضرورت تھی پاکستان نہ بتا تو کیا نقصان، کیا خسارہ ہوتا۔ میں سمجھاتا رہا، سمجھاتا رہا۔ میں اسے سمجھاتا رہا لیکن بات اس کی سمجھی میں نہ آئی۔ دوسرا ملاقات پر بھی یہی صورتحال تھی، تیسری اور چوتھی بار ملے تو اس وقت بھی شکایت، شکوئے اور نفرت کا دریا شاخیں مار رہا تھا لیکن وہ کل میرے پاس آیا تو ایک بولا ہوا تبدیل شدہ انسان تھا۔ اس کی جھوپی کنکریوں سے خالی تھی، لا اسرو ہو چکا ہا اور نفرت خنڈی، میں نے اس کا یا کاپ کی وجہ دریافت کی تو اس کی نیلی آنکھوں میں آنسوؤں کے بجھے بلکرے لینے لگے، اس نے کوٹ کی جیب سے اخبار کا ایک مژاڑا تراشنا کلا، سیدھا کیا اور میرے میز پر بچھا کر بولا "سرآپ یہ دیکھئے، آپ کو تمام سوالوں کا جواب مل جائے گا" میں آگے جھک گیا، یہ ایک تصویر تھی، ایک پختہ عمر شخص کی تصویر جس کے چہرے پر خوف رات کی طرح اتر رہا تھا، اس کی آنکھوں میں بے چارگی کے آنسو تھے، وہ ہاتھ پاندھ کر کسی سے رحم کی بھیک ناگزیر رہا تھا، میں نے تصویر کا کپیشن پڑھا، لکھا تھا، احمد آباد بھارت کے اس مسلم شہری کا گھر بلوائیوں نے گھیر رکھا تھا وہ ہاتھ پاندھ کر پولیس سے مدد کی درخواست کر رہا تھا، میرے ہونتوں سے سکی نکل گئی۔

نوجوان نے اخبار تہہ کر کے جیب میں رکھا اور خنڈی آہ بھر کر بولا "سرچھٹے ایک بفتے سے بھارت میں مسلم کش فسادات چل رہے ہیں۔ گجرات، اتر پردیش، راجستھان، ہریانہ، مہاراشٹر، آندھرا پردیش اور

دہلی میں خون کی ہوئی کھیلی جا رہی ہے۔ اب تک پانچ سو مسلمان شہد کئے جا چکے ہیں۔ ان میں زیادہ تر زندہ جلائے گئے، تلواروں سے بچوں کے گلزارے کے گئے، مورتوں کو سر عالم آبرد ریزی کے بعد پڑول چجز کر آگ لگائی گئی، دکانیں لوٹ لی گئیں، مسجدیں تباہ کر دی گئیں اور گھروں پر قبضہ کر لیا گیا، حالت یہ ہے شہر کے شہر مسلمانوں کی نعشوں سے ائے پڑے ہیں لیکن کوئی کافن دینے والا نہیں۔ اذان دینے، چنازہ انجانے، نماز پڑھنے، سر پر ٹوپی رکھنے، برقد پہننے اور داڑھی رکھنے پر پابندی لگ چکی ہے۔ جو اخبار اٹھا کر دیکھیں، جوئی وی چینیں لگائیں، تلوار لہراتے، آگ لگاتے اور گالی دیتے بلوائی دکھائی دیتے ہیں۔ جس طرف دیکھیں جلی ہوئی نعشیں ہیں، جلتے ہوئے مکان اور سلسلتی ہوئی مسجد ہیں ہیں۔ میں ایک بیٹتے سے یہ کھیل دیکھ رہا ہوں، پڑھ رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں۔ ان لوگوں کا کیا قصور تھا، کیا یہ سارے گے سارے بنیاد پرست مسلمان تھے۔ اسامہ بن لادن تھے یقیناً نہیں ان میں سے بہت سے میرے جیسے ہوں گے۔ ایسے جن کا اسلام صرف اسلامی نام اور ایک کلے تک محدود تھا، جنہیں مسجد میں داخل ہوئے دو، دو، تین، تین سال گزر جاتے تھے۔ جو انسانیت کو اپنا نہ ہب اور پوری دنیا کو اپنا ملک سمجھتے تھے۔ جو پاکستان کے وجود کو اتنا ہی غیر ضروری، اتنا ہی غیر حقیقی سمجھتے ہیں جتنا جواہرِ اعلیٰ نہر و اور اُل بہاری و اچھائی سمجھتے ہیں۔ لیکن جب انفتر اور قساد کی آندھی چل تو پاکستان زندہ باد کہنے والوں، پانچ وقت کے نمازیوں اور سر ملک ملک مالست کہنے والوں کے ساتھ ہے لہرل، یہ اپنی پاکستان لوگ بھی ملاتے ہیں، بلوائیوں نے پڑول چجز کئے وقت، دیا مسلمان جلائے وقت اور تلوار چھرا گھوپتے ہوئے ایک لمحے کے لئے نہیں سوچا یہ لوگ تو ہمارے ہی بھائی ہیں۔ یہ صرف نام کے مسلمان ہیں، اندر سے یہ سارے کے سارے بھول اور کشن اچار یہ ہیں، یہ بھارت ماتا کے ان سے زیادہ وقاردار ہیں شاید بلوائیوں کے لئے ان کا مسلمانوں کے محلے میں رہتا، ثم اسلامی نام یا کسی پر مسلمان ہونے کا شک ہی کافی تھا۔“ نوجوان نے طویل خندی سانس بھری۔

میں خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا، اس پر تمیش بھی تھی اور سرخی بھی۔ اس نے ماتھا پوچھا اور اسی روایت میں بولا۔“ جب میرا نام کا مسلمان ہوتا بھی جرم ہے تو پھر میں پورے کا پورا مسلمان کیوں نہ ہو جاؤں۔ میں اسامہ بن لادن کی طرح کیوں نہ سوچوں، میں کیوں نہ سوچوں میں نے زندہ رہتا ہے تو پھر مجھے زندگی کے لئے پوری جدوجہد کرنا ہوگی، وہ جدوجہد جس میں انسان اپو کے دریا میں کھوپڑیوں کے بینار پر انسانی گوشت کھا کر زندہ رہتا ہے، رہا پاکستان تو سر میں نے زندگی میں پہلی بار محسوں کیا یہ ملک اللہ کی بہت بڑی صہریانی، بہت بڑی عنایت ہے یہ ملک ہے تو میں آپ کے سامنے بیٹھا یوں الٹیناں سے گفتگو کر رہا ہوں۔ اس ملک نے مجھے تحفظ دیا، مجھے سجدے کرنے کی اجازت دی، مجھے اپنے بچوں کے نام عبد اللہ، ابو بکر اور عمر رکھنے کی آزادی دی۔ اگر یہ ملک نہ ہوتا تو آج میں بھی احمد آباد، بھبھی، ازیز یا مہارا شری کسی کبھی بستی میں رہ رہا ہوتا اور میرا نام بھی کا جل، خوبیوں یا کوکل ہوتا۔ میں بھی بلوائیوں سے بچتے کے لئے لکلی کرتا پہنتا اور

مندروں کے باہر پچاریوں کے جوتے سید ہے کرتا لیکن اس تمام تر عقیدت اور خدمت کے باوجود کسی چوک، کسی موڑ، مردک کے کسی کونے، گلی کھدرے یا بازار کی کسی نکلا پر میری آدھ جلی بے کفن، بے گورغش پڑی ہوتی اور لوگ ناک پر ردمال رکھ کر میرے قریب سے گزرتے، اگر ایسا نہ ہوتا تو ایسا ہوتا۔ ”نجوان نے جیب سے دوبارہ اخبار کا تراشناکala، میز پر پھیلایا اور تصویر پر انگلی رکھ کر بولا ”میں بھی اپنی ماں، اپنی بہنوں، اپنی بیٹیوں کی صحت بچانے کے لئے اس طرح ہاتھ جوڑے کھڑا ہوتا لیکن جواب میں مجھے بھی شیطانی تھی، گالیاں اور نفرت ملتی، سر یہ ملک بہت بڑی نعمت ہے۔ یہ ملک ہمیں کچھ بھی نہ دے تو بھی اس کا اتنا احسان ہی کافی ہے کہ اس نے ہمیں اپنا پن دیا، ایک حساسیت، ایک احساس تحفظ عطا کیا۔ آئیے سرہم اس کی حفاظت کریں، پھر انہوں کی ڈال سے کانے الگ کر دیں، یہ میں نہیں کہہ رہا سو، یہ پیغام یہ تصویر دے رہی ہے۔ ”اس نے ایک بار پھر تصویر پر انگلی پھیری ” یہ تصویر پاکستان کے تمام آزاد باشندوں کو پیغام دے رہی ہے اگر احمد آباد کے مسلمانوں کے پاس بھی ایک پاکستان ہوتا تو آج ان کے ہاتھ اس طرح نہ بندھے ہوتے، یہ تصویر جیچ چیز کر کہہ رہی ہے اگر آج پاکستان مجبوب ہوتا تو بھارت میں ہم یوں کمزور نہ ہوتے۔ ”

ہمیں 1948ء کا پاکستان چاہیے

کابینہ کا اجلاس تھا، اے ڈی سی نے پوچھا "سر اجلاس میں چائے سرو کی جائے یا کافی۔" چونکہ کسر اٹھایا اور سخت لمحے میں فرمایا "یہ لوگ گروں سے چائے کافی ہی کر نہیں آئیں گے۔" اے ڈی سی گھبرا گیا۔ آپ نے بات جاری رکھی "جس وزیر نے چائے کافی ہیں ہو وہ گھر سے پی کر آئے یا پھر واپس گھر جا کر پینے، قوم کا پیرس قوم کے لئے ہے وزروں کے لئے نہیں۔" اس حکم کے بعد جب تک وہ بر سر اقتدار ہے کابینہ کے اجلاسوں میں سادے پانی کے سوا کچھ سرو نہ کیا گیا۔ "گورنر جنرل ہاؤس کے لئے سارے 38 روپے کا سامان خریدا گیا۔ آپ نے حساب مبلغوا لیا، کچھ چیزیں محترمہ فاطمہ جناح نے مبلغوائی تھیں، حکم دیا" یہ پیسے ان کے اکاؤنٹ سے کانے چائیں۔ "دو تین چینیں ان کے ذاتی استعمال کے لئے تھیں فرمایا" یہ پیسے میرے اکاؤنٹ سے لے لئے جائیں۔ باقی چیزیں گورنر جنرل ہاؤس کے لئے تھیں، فرمایا "محیک ہے یہ رقم سرکاری خزانے سے ادا کر دی جائے لیکن آئندہ احتیاط کی جائے" برطانوی شاہ کا بھائی ڈیوک آف گلوسٹر پاکستان کے دورے پر آ رہا تھا۔ برطانوی سفیر نے درخواست کی "آپ اسے ایئر پورٹ پر خوش آمدید کہہ دیں۔" بہس کر کہا "میں تیار ہوں لیکن جب میرا بھائی لندن جائے گا تو پھر بریش سکنگ کو بھی اس کے استقبال کے لئے ایئر پورٹ آتا پڑے گا۔" ایک روز اے ڈی سی نے ایک دن بگ کارڈ سامنے رکھا، آپ نے کارڈ پھار کر پھینک دیا اور فرمایا "اس کو آئندہ مجھے شکل نہ دکھائے" یہ شخص آپ کا بھائی تھا اور اس کا قصور صرف اتنا تھا اس نے اپنے کارڈ پر نام کے نیچے "برادر آف قائد اعظم محمد علی جناح گورنر جنرل پاکستان" لکھا دیا تھا۔ زیارت میں سردی پڑ رہی تھی۔ کریل الہی بخش نے نئے موزے پیش کر دیئے، دیکھئے تو بہت پسند فرمائے، ریت پوچھا، بتایا، "دو روپے، گھبرا کر بولے" کریل یہ تو بہت منگے ہیں "عرض کیا" سریا آپ کے اکاؤنٹ سے خریدے گئے ہیں۔" فرمایا "میرا اکاؤنٹ بھی قوم کی امانت ہے، ایک غریب ملک کے سر براد کو اتنا عیاش نہیں ہونا چاہیے" موزے لپسیں اور کریل الہی بخش کو واپس کرنے کا حکم دے دیا۔ زیارت ہی میں ایک نرس کی خدمت سے متاثر ہوئے اور اس سے پوچھا "بینی میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں۔" نرس نے عرض کیا "سر میں پنجاب سے ہوں۔ میرا سارا خاندان پنجاب میں ہے میں اکیلی کوئی میں نو کری کر رہی ہوں آپ میری ٹرانسفر پنجاب کرو دیں۔" اداں

لہجے میں جواب دیا "سوری بھی یہ مکمل صحبت کا کام ہے گورنر جنرل کا نہیں۔" اپنے طیارے میں رائمنگ نیبل لگوانے کا آرڈر دے دیا۔ فائل وزارت خزانہ پہنچی تو وزیر خزانہ نے اجازت تو دے دی لیکن یہ توٹ لکھ دیا " گورنر جنرل اس حکم کے احکامات سے پہلے وزارت خزانہ سے اجازت کے پابند ہیں۔" آپ کو معلوم ہوا تو وزارت خزانہ سے تحریری معدودت کی اور اپنا حکم منسوخ کر دیا اور رہا پھانک والا قصد تو کون نہیں جانتا گل حص نے آپ کی گازی گزارنے کے لئے ریلوے کا پھانک کھلوادیا تھا۔ آپ کا چہرہ فسے سے سرخ ہو گیا۔ پھانک بند کرنے کا حکم دیا اور فرمایا "اگر میں ہی قانون کی پابندی نہیں کروں گا تو پھر کون کرے گا۔"

یہ آج سے 56ء برس پہلے کا پاکستان تھا، وہ پاکستان جس کے سربراہ محمد علی جناح تھے لیکن پھر ہم ترقی کرتے کرتے اس پاکستان میں آگئے جس میں پھانک تو رہے ایک طرف سربراہ مملکت کے آنے سے ایک گھنٹہ پہلے سڑکوں کے تمام گھنٹل بند کر دیئے جاتے ہیں۔ دونوں اطراف ٹرینک روک دی جاتی ہے اور جب تک شاہی سواری نہیں گزرتی ٹرینک کھلتی ہے اور نہ ہی اشارے، جس میں سربراہ مملکت وزارت خزانہ کی اجازت کے بغیر جلسوں میں پانچ پانچ کروڑ روپے کا اعلان کر دیتے ہیں۔ وزارت خزانہ کے انکار کے باوجود پورے پورے جہاز خریدے جاتے ہیں۔ جس میں صدر رہوں اور وزیر اعظم کے احکامات پر سیکھزوں ہزاروں لوگ بھرتی کئے گئے۔ اتنے ہی لوگوں کے تباہی ہوئے، اتنے لوگ تو کریوں سے نکالے گئے اور اتنے لوگوں کو ضابطہ اور قانون توڑ کر ترقی دی گئی۔ جس میں صورتے تو رہے ایک طرف پھانکوں کے پورے تک سرکاری خزانے سے خریدے گئے جس میں آج ایوان صدر کا سائز ہے 18 اور وزیر اعظم ہاؤس کا بجٹ 20 کروڑ روپے ہے جس میں ایوان اقتدار میں عملہ بھائیوں، بھتیجیوں، بھانجوں، بھنوں، بھنیوں اور خاوندوں کا راج رہا۔ جس میں وزیر اعظم ہاؤس سے سیکھریوں کو فون کیا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا "میں صاحب کا بہنوںی بول رہا ہوں۔" جس میں امریکہ کے نائب وزیر کے استقبال کے لئے پوری پوری حکومت ایک پورٹ پر کھڑی دکھائی دیتی ہے اور جس میں چائے اور کافی تورتی دور کا بینے کے اجلاس میں پورا لٹھ، پورا ڈنر سرو کیا جاتا ہے اور جس میں ایوان صدر اور وزیر اعظم ہاؤس کے کچن ہر سال کروڑوں روپے دھواں بنادیتے ہیں۔ یہ پاکستان کی وہ ترقی یافتہ ٹھکل ہے جس میں اس وقت 15 کروڑ لوگ رہ رہے ہیں۔ جب قائد اعظم گورنر جنرل ہاؤس سے نکلتے تھے تو ان کے ساتھ پولیس کی صرف ایک گازی ہوتی تھی اس گازی میں صرف ایک اسپنٹ ہوتا تھا اور وہ بھی غیر مسلم تھا اور یہ وہ وقت تھا جب گاندھی قتل ہو چکے تھے اور قائد اعظم کی جان کو سخت خطرہ تھا۔ قائد اعظم اس خطرے کے باوجود سیکورٹی کے بغیر کھلی ہوا میں سیر کرتے تھے لیکن آج کے پاکستان میں سربراہ مملکت ماؤن بلت پروف گاڑیوں، ماہر سیکورٹی گاڑیوں اور انجمنی تربیت یافتہ کمانڈوز کے بغیر دس کلومیٹر کا فاصلہ طے نہیں کر سکتے، ہم اس ملک میں مساوات رائج نہیں کر سکے ہم اسے ایک خوددار، بادقا اور ایماندار قیادت بھی نہیں دے سکے۔ نہ دیں، ہم اسے چدید، ترقی یافتہ اور پر اسن ملک نہیں بنا سکے نہ بنا سیں لیکن ہم اسے واپس

1948 تک تو لے جاسکتے ہیں۔ ہم اسے 56 برس پر اتنا پاکستان تو بنا سکتے ہیں۔ کوئی ہے جو ہم سے یہ ترقی، یہ خوشحالی اور یہ یعروج لے لے اور ہمیں ہمارا پہمانہ، غریب اور غیر ترقی یافتہ پاکستان واپس دے دے۔ جو ہمیں قائدِ اعظم کا پاکستان واپس کر دے کہ اس ملک کے 15 کروڑ عوام کو 2003ء کے بجائے 1948ء کا پاکستان چاہیے۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

چپ

”کیوں پھر تھک گئے“، ایک سختی کی آواز نے میری ساعت پر دستک دی، میں نے ہڑ بڑا کر آنکھیں کھولیں، سرخ و سپید بوڑھا سیری طرف دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھوں میں ایک عجیب محسوس، ایک انوکھا رچاؤ تھا۔ ”ہاں“، میں نے سختہ اس انس بھرا اور تالکیں پھیلادیں، سامنے راول جھیل پر شام اتر رہی تھی، پانی کے کنارے آباد جنگلوں میں جاتی بھار کی ہوا خوشبو سمیت رہی تھی، باد بانی کشتیاں پھولوں پر لہراتی تھیں، پانی کے طرح پانی پر ہو لے ہو لے دیرے دیرے ذول رہی تھی اور جھیل پر جنکے پیازوں کا عکس رنگ بدل رہا تھا، بوڑھے نے اپنا شفیق ہاتھ میرے کندھے پر رکھا ”کیوں“، میں نے اپنا ہاتھ اس کے جنک ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کے ہاتھ کی نسوانیں خون کیچوئے کی طرح سرک رہا تھا۔ ”طبیعت نحیک نہیں، ایک ذیج یہش ہے جو تنور میں جلتی لکڑوں کا دھوال بن گر معدے سے الحتا ہے اور سیدھا دماغ کی چوٹی پر جا ٹھہرتا ہے، اندر میرے اندر ایک غبار ہے، ایک آگ ہے، ایک لاوا ہے جو باہر نکلنے کا راستہ حلاش کر رہا ہے۔“ مجھے اپنی آواز اپنی محسوس ہوئی، میں نے تالکیں سمجھیں، آنکھیں بند کیں اور گردان پر ہاتھ رکھ کر پیچھے جمک گیا، بوڑھے نے میرے کندھے سے ہاتھ اٹھا لیا، مجھے محسوس ہوا جلتے سحر میں بر گد کا ایک درخت تھا جو میرے وجود سے جدا ہو گیا۔ میں نے پریشان ہو کر آنکھیں کھول دیں، بوڑھا نھوڑی چکلی میں دبائے جھیل کی وسعت میں گم تھا۔ وہ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر مسکرایا اور اپنے ساتھ بینیتھے شخص کی طرف اشارہ کر کے بولا ”یہ میرا چھوٹا بھائی احمد ہے، اس کے ساتھ ہم دونوں کا چھوٹا بھائی احسن بیٹا ہے۔“ میں نے آگے جمک کر دیکھا، واقعی بیٹھ پر میرے بعد وہ جھیل پر جمادیں۔

”ہاں تو میں بتا رہا تھا، یہ دونوں میرے بھائی ہیں، ہم اپنے والدین کے تین ہی بچے تھے۔ میں، احمد اور احسن۔ ہم تینوں پیدائشی محدود ہیں۔ قدرت نے جب مجھے بنایا تو وہ میری تالکیں بنانا بھول گئی۔“ میں

نے بوزہ اکر بوزہ کی طرف دیکھا واقعی رانوں سے نیچے اس کی ٹانگیں غائب تھیں۔ "احمد پیدا ہوا تو اس کے بازو نہیں تھے، احسن بصارت کی نعمت سے محروم پیدا ہوا" بوزہ اس رواد اور بیٹھنے لجئے میں بولتا چلا گیا، میں نے گھبرا کر اس سے آگے دیکھا، اس کے ساتھ بیٹھنے بوزہ کے کوٹ کے بازو پہنچنے ہوئے جھنڈے کی طرح لٹک رہے تھے اور کونے میں بیٹھا بوزہ حاسیاہ ششیٰ کی اوٹ سے ذات کی تاریکیاں ماپ رہا تھا۔ میں نے افسوس سے جھنڈا سائنس بھرا، بوزہ نے اپنا شفیق ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا۔ "ہمارے والدین مر گئے، ہمارے لئے زمین جانیداد چھوڑ گئے، ہم نے شادی نہیں کی، میں اس وقت اسی سال کا ہوں، احمد کی 178 اور احسن کی عمر 76 سال ہے۔ ہم میں میں ایک دن یہاں آتے ہیں۔ ایک دو ٹکھنے یہاں بیٹھتے ہیں اور پھر ہمارا ذرا نیور ہمیں دوبارہ گھر لے جاتا ہے۔ ہم نے پوری زندگی اس معمول میں گزار دی لیکن کبھی ہمارے معدے میں لکڑیاں جلیں اور نہ ہی ان کا دھواؤ اٹھ کر ہمارے دماغ کی چوٹی پر آبیٹھا، احسن نے، احمد نے اور میں نے کبھی اپنے رب سے شکوہ نہیں کیا۔ ہم نے کبھی اس سے نہیں پوچھا، اے پرو دگار ہمارا کیا قصور تھا، ہمیں کس جرم، کس گناہ کی سزا دی گئی اور ایک تم ہو؟" بوزہ حابنا، اس نے اپنا ہاتھ میرے کندھے سے اٹھا لیا" اور ایک تم ہو، اپنے قدموں پر چلتے ہو، تم نے ذرا دیر پہلے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا، تم نے میری نسوں میں سر کتے ہوئی سرسر اہٹ محسوس کی تھی، تم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہو، میں بھی دیکھ سے دیکھ رہا ہوں، تم کامبا بار پانی میں پہاڑوں کا عکس دیکھتے ہو۔ تم سامنے بادبانی کشیوں کے بادبان بھی دیکھتے ہو، تم نے ذرا دیر پہلے جنگلوں میں بڑھتی ہوئی تاریکی کا مشاہدہ بھی کیا تھا، دیکھو میرا وہ بھائی" بوزہ نے انگلی سے نٹ کے سرے پر بیٹھنے بوزہ کی طرف اشارہ کیا" میرا وہ بھائی شام کی بڑھتی تاریکی دیکھ سکتا ہے، نہ جنگل، نہ بادبان، نہ کشیاں اور نہ ہی رنگ بدلتے عکس، اس کی زندگی کا ایک ہی رنگ ہے گہرا سیاہ، تاریک اور کالا رنگ اور وہ میرا دوسرا بھائی" اس نے دوسرے بوزہ کی طرف اشارہ کیا، بوزہ نے چمکتی آنکھوں سے میری طرف دیکھا" وہ چھوٹے کی لذت سے محروم ہے، اسے معلوم ہی نہیں ہاتھ جب ہاتھوں کو چھوٹے ہیں تو کیا ہوتا ہے، جب کوئی کسی جلتی ہوئی پیشانی پر ہاتھ رکھتا ہے تو ہاتھ کیا کیا محسوس کرتا ہے اور پیشانی کیا کیا محسوس کرتی ہے اور رہا میں" بوزہ نے اپنی ادھوری رانوں پر ہاتھ پھیرا۔ "ہاں رہا میں تو میں وہ بد قسم شخص ہو جے معلوم ہی نہیں قدم کیا ہوتے ہیں، صافتیں کیا ہوتی ہیں، فاصلے کے کہتے ہیں، وہ جو بولتے تھے وہ ہزار کلو میٹر لمبے سفر کا آغاز ایک قدم سے ہوتا ہے جو لیکن میرے سفر کا تو آغاز ہی نہیں ہو سکتا میرے تو پاؤں ہی نہیں ہیں" بوزہ حاسنس لینے کے لئے رکا۔

میں نے لمبا سائنس لے کر پیچھہ دوں میں تازہ ہوا بھری، بوزہ کا پھر گویا ہوا" ذیپریشن تو ہمیں ہونا چاہیے، ہم ادھورے لوگوں کو جو تین مل کر بھی پورا ایک نہیں ہو سکتے تم پر تو خدا کا پورا پورا کرم ہے، تمہارے پاس ہاتھ ہیں، آنکھیں ہیں، پاؤں ہیں، تم صحت مند ہو، جوان ہو، باصلاحت اور ذہن بھی دکھائی دیتے ہو،

قدرت نے تمہارے جسم، تمہارے وجود میں کوئی کمی، کوئی خامی نہیں چھوڑی لہذا پھر مجھے تمہاری مایوسی، ڈپریشن اور خودترسی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔" میں نے کسما کر جواب دیا۔" میں کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن حالات، وقت اور نظام موقع نہیں دے رہا۔" بوڑھے نے قبیلہ لگایا، ہاتھوں پر ہاتھ ملے اور اسی میشی آواز میں بولا۔"بس یہ مسئلہ ہے، لوپھر میں تمہیں ایک نسخہ بتاتا ہوں، اس پر عمل کرو، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مایوسی سے نکل جاؤ گے، میرے پچھے چپ سے بڑی آواز اور خاموشی سے بڑا کوئی احتجاج نہیں ہوتا۔ جب ساری آوازیں بے اثر ہو جائیں اور سارے احتجاج پے معنی ہو کر رہ جائیں تو چپ سادھ لیا کرو، خاموش ہو جالیا کرو جب لوگ خاموش ہو جاتے ہیں تو پھر قدرت کی آواز بلند ہوا کرتی ہے، تم خاموش ہو کر، تم چپ سادھ کر قدرت کی آواز کا انتظار کیا کرو۔" بوڑھا خاموش ہوا، اس نے گردن پلانی اور سرگوشی میں بولا۔" چپ سے بڑی بد دعا بھی کوئی نہیں، تم چپ کی بد دعا دے کر اپنا حساب اللہ پر چھوڑ دیا کرو، پر سکون ہو جاؤ گے، مطمئن ہو جاؤ گے۔"



ہم مسکرا کر تو دیکھ سکتے ہیں

یہ تیسری دکان تھی، سیلز میں پھر رہے تھے اور مالک کا وزیر پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں نے عادتا ان کی طرف مسکرا کر دیکھا اور خوش دلی سے مطلوبہ چیز کے بارے میں پوچھا۔ سب نے سرد نظر وہ سے میرا استقبال کیا، ایک سیلز میں ڈھینے ڈھالے انداز سے میری طرف بڑھا، مجھے لیا اور شیف کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میں قیمتیں پوچھتا رہا اور وہ خندے، روکتے اور بے جان لجئے میں بتاتا رہا۔ میں نے دیکھا پوری دکان میں کسی کے پیہے پر مسکراہٹ نہیں۔ کسی کے انداز میں گرم جوشی، زندگی اور حرارت نہیں۔ سب بے جان بھروسوں کی طرح ایک ملکیتیک طریقے سے حرکت کر رہے ہیں، مالک ہر آنے والے گاہک کو ترچھی نظر سے دیکھتا ہے اور پھر دعاوارہ اخبار پر جھک جاتا ہے۔ سیلز میں نہم دالانہ طریقے سے گاہک کے ساتھ گلستوکرتے ہیں۔ گاہک بھی سرد انداز سے قیمتیں پوچھتے ہیں اور دکان سے نکل جاتے ہیں۔ ہم بھی دوسرے گاہوں کی بیروی میں دکان سے باہر آگئے۔ باہر بازار کی ساری افراتقری موجود تھی۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا "یار طارق دیکھو اس دکان میں سب کچھ ہے لیکن مسکراہٹ نہیں۔" طارق نے مخصوص کھوئے کھوئے انداز میں میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا "اگر یہ تمام لوگ مسکرانا شروع کر دیں تو اسی خندی، ڈھیل ڈھالی اور بے جان فضا میں حرارت بھی آجائے، زندگی بھی اور گرم جوشی بھی طارق نے گروں ہاں میں ہلا کر تصدیق کر دی۔

ولیم جیمز ایک انسیات داں تھا۔ مدتوں پہلے میں نے اس کی کتاب میں ایک پیر اگراف پڑھا تھا۔ اس نے کہا تھا "ہر جذبے کا اظہار کسی نہ کسی عمل سے ہوتا ہے مثلاً انسان ہس کر خوشی کا اظہار کرتا ہے، روکر تکلیف، درد اور افسوس اظہار کرتا ہے۔ جیخ کر، چلا کر، چیزیں توڑ کر اپنا غصہ ثابت کرتا ہے۔" اس نے کہا "اگر ہم اس عمل کو اٹ دیں تو ہم اپنے اندر جذبے بھی پیدا کر سکتے ہیں مثلاً کوئی دکھی شخص اگر مسکرانا شروع کر دے تو تحوزی دیر بعد اس کے اندر خوشی کا جذبہ پیدا ہو جائیگا، کوئی شخص خوش ہے لیکن وہ اداہی، پریشانی اور دکھ کی اداکاری شروع کر دے، اپنی آواز بھرا لے، آنکھوں میں آنسو لے آئے تو ایک آدھے گھنے بعد وہ حقیقتاً اس ہو جائے گا۔" ولیم جیمز کی پات میں وزن ہے۔ مجھے یورپ، امریکہ اور مشرق بعید کے ترقی یافتہ ممالک میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں میں نے بڑی شدت سے دو باتیں محسوس کیں ایک آپ کسی کی طرف دیکھیں، کسی سے غلط ہوں اس کے پیہے پر فوراً دل آؤں مسکراہٹ آجائے گی۔ دوم آپ کو ہر شخص مستقبل کے منصوبے

ہنا نظر آئے گا۔ میں اس دیکھ بھیوں کا میں ان چھیٹوں میں وہاں جاؤں گا وغیرہ وغیرہ شروع شروع
میں بھی یہ چیزیں پریشان کرتی تھیں لیکن جب غور کیا تو محسوس ہوا جن معاشروں میں امید زندہ ہوتی ہے وہاں
یہ دلوں چیزیں بکثرت پائی جاتی ہیں مزید غور کیا تو معلوم ہوا مسکراہست اور امید دلوں ایک ہی کوکھ سے جنم لیتی
ہیں جن معاشروں میں لوگ مسکرانا بھول جاتے ہیں وہاں سے امید بھی رخصت ہو جاتی ہے اور جہاں امید نہیں
ہوتی وہاں لوگوں کے چہروں پر مسکراہست بھی نہیں ہوتی۔

انسانی چہرے پر ایسے دو سو زاویے (پوائنٹ) ہوتے ہیں جن کی مدد سے انسان تاثرات
پیدا کرتا ہے، وہ خوش ہے تو اس خوشی کا انطباق اس کے چہرے سے ہوتا ہے۔ وہ اداس ہے، غصے یا
تکلیف کی حالت میں ہے تو اس کا انطباق بھی وہ چہرے کے تاثرات سے کرے گا۔ یہ تاثر چہرے کے یہ دو سو
زاویے پیدا کرتے ہیں۔ ہر احساس، ہر تاثر کے لئے زاویوں کا ایک مخصوص مرکب (کمبی نیشن) ہوتا ہے۔
احساسات تبدیل ہونے سے یہ کمبی نیشن بدلتا ہے اور اس کمبی نیشن سے تاثرات میں تبدیلی آتی ہے۔ جن
لوگوں کے چہروں پر طویل عرصے تک ایک ہی کیفیت رہتی ہے، ان کے چہروں کے دوسرے زاویے مرتا
شروع ہو جاتے ہیں اور بعد ازاں وہ لوگ اپنے تاثرات تبدیل کرنے کی صلاحیت کھو جنتے ہیں۔ آپ اکثر
ایسے لوگوں کو دیکھتے ہیں جن کے چہروں پر مدت غصے کی لکھیں رہتی ہیں۔ چہرے کے عضلات تنے اور
آنکھیں چڑھتی ہوتی ہیں۔ آپ ذرا غور کریں، کیا یہ لوگ 24 گھنے غصے کی حالت میں رہتے ہیں یقیناً نہیں۔
ان لوگوں کی کیفیات بھی تبدیل ہوتی رہتی ہیں لیکن ان کے چہرے ان تبدیل ہوتی کیفیات کے اس انطباق
پر قادر نہیں ہوتے کیونکہ ان کے چہرے اچھی کیفیت کے حامل زاویوں کے قبرستان بن چکے ہیں۔ کیشیات اور
تاثرات کے تمام ماہرین اس بات پر تحقیق ہیں صرف مسکراہست ہی وہ واحد کیفیت ہے جس میں انسانی چہرے
کے تمام زاویے حرکت کرتے ہیں۔ جس کے ذریعے چہرے کے دو سو پوائنٹس کی ورزش ہوتی ہے لہذا جو لوگ
دن میں کم از کم پچاس مرتبہ مسکراتے ہیں۔ ان لوگوں کے چہرے بھی بوڑھے نہیں ہوتے۔ یہ لوگ بھی مایوس
نہیں ہوتے۔ یہ لوگ بھی زندگی سے نہیں اکتاتے۔ چینی کہاوت ہے جو مسکرانا نہیں جانتا اسے دکان نہیں کھولنی
چاہیے، پاکستانی حالات میں اس کہاوت میں تحوزہ ہی تبدیلی کی ضرورت ہے، میں کہنا چاہیے جو مسکراانا نہیں
جانتا اسے اپنادروازہ نہیں کھولنا چاہیے۔ اسے لوگوں میں نہیں بیٹھنا چاہیے۔

ہم لوگوں کا مقدار نہیں بدلتے، بیماروں کو شفا نہیں دے سکتے، غریبوں کو امیر نہیں بن سکتے اور
بیکوئں کو رزق نہیں دے سکتے لیکن ہم ان بیکوئں، ان غریبوں، ان بیماروں اور زندگی کے ان ماروں کو
مسکراہست تودے سکتے ہیں۔ اپنے دروازے پر کھڑے لوگوں کو نہیں کرتے دیکھ سکتے ہیں لیکن شاید ہمارے پاس
مسکراہست بھی نہیں پہنچی!!



جست پُش اٹ

لوگوں کا پہلا سوال ہوتا ہے "آپ اپنے کالم سے چھوٹے دکھائی دیتے ہیں، ان سیاہ بالوں کے ساتھ اتنے سفید اور سچے تم کے کالم کیسے لکھ لیتے ہیں۔" اب آپ ہی بتائیں اس سوال کا کیا جواب ہو سکتا ہے؟ میں نہایت احتیاط سے کہتا ہوں "بس تھی اللہ تعالیٰ کا کرم ہے وہ جس کو چاہے، جس عمر میں چاہے، جو چاہے عطا کر دے۔ ہم اور آپ پوچھنے والے کون ہوتے ہیں، ویسے میں اتنا لو جوان ہوں نہیں جتنا دکھائی دیتا ہوں۔ مجھے تو بوزہ عہد ہوئے بھی تمیں چالیس سال گزر رکھے ہیں۔" لوگ یقین نہیں کرتے تو میرا جواب ہوتا ہے "میں نے جوان دکھائی دینے کے لئے پلاسٹک سرجری کروار کھی ہے" ہوں میں اس دور کا انسان جب ابھی گھوڑا بھی ایجاد نہیں تھا ہوا تھا اور لوگوں کو گھوڑے سے وابستہ تام کام اونتوں اور باتیں جیوں سے لینا پڑتے تھے۔ اسی تم کے ایک فلکشن میں جب میں نے پلاسٹک سرجری کا "انکشاف" کیا تو مجھے میں سے آواز آئی "اگر پلاسٹک سرجری کرانی ہی تو ذرا اچھی کروالیتے۔ پیسے بھی لگائے اور قائدہ بھی نہیں ہوا۔" اب میں انہیں کیا بتاتا میں نے جب پلاسٹک سرجری کرانی تھی تو اس وقت بکلی بھی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔

دوسرے سوال بہت دلچسپ ہوتا ہے لوگ پوچھتے ہیں "آپ لوگ جو کالم لکھتے ہیں اس کا کوئی اثر بھی ہوتا ہے، بھی حکومت نے نوٹس لیا، بھی کالم کی وجہ سے کوئی بلاٹی یا کسی شخص کو کوئی رسیلف مل اوغیرہ وغیرہ۔"

پچیسا بات ہے اس کا جواب امام صحافت حسن ثار اور پیغمبر محدث عطا الحنفی قاسمی کے پاس ہو تو ہو لیکن میرا کھیس بائل خالی ہے۔ مجھے تو اکثر محسوس ہوتا ہے جیسے میں سحر میں ریتلے نیلوں سے مخاطب ہوں۔ دیوار گریہ سے لپٹ کر گریہ زادی کر رہا ہوں یا پھر سیاہ کھنے جنگل میں مور تھا رہا ہوں۔ ناقچ ناقچ کر موروں کے پاؤں شل ہو چکے ہیں۔ رو رو آنکھوں کا نور بہہ چکا ہے اور جن جن کر آوازوں کے گلے پھٹ چکے ہیں۔ لفظوں کے سینے چاک ہو چکے ہیں اور حروفوں کے وجود مٹی ہو کر مٹی میں مل چکے ہیں لیکن کہیں سے "میں آرہا ہوں" کی آواز آتی ہے اور نہ ہی "جا تیری سن لی گئی" کا سند یہ۔

یقین کیجئے ایک شدید ذیپریشن ہے۔ کاغذ اور قلم لے کر گھننوں بیخا رہتا ہوں لیکن کوئی خیال سوجھتا ہے اور نہ ہی کوئی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ تو صرف استاد مکرم ہارون الرشید ہیں جن کے ہاتھ پھینپن میں تاریخ

کی تین کتابیں لگ چکی تھیں جب تک ان کتابوں کو کیز انہیں لگتا استاد کے کاروبار کو کوئی خطرہ نہیں، بعض اوقات تو گمان ہوتا ہے اتنی تاریخ مورثیں نہیں لکھی، جتنی اب تک استاد تحریر فرمائے ہیں لیکن رہے "شاگرد" تو یہ لوگ کیا کریں گے؟ کیا لکھیں؟ کچھ عرصہ پہلے یہاں اسلام آباد میں چیف ایگزیکٹو سے ملاقات ہوئی تو زمانے بھر سے ناراض ہمارے دوست ایاز امیر نے جزل صاحب کو مخاطب کر کے کہا "آپ نے تو ہمیں بالکل ہی بے کار کر دیا، حکومت اخبار کی کسی تحریر پر کوئی رد عمل ہی ظاہر نہیں کرتی، ہمیں لفت ہی نہیں کرتی۔"

جواب میں جزل صاحب نے بڑے خلوص سے قہقہہ لگا دیا۔

چند روز پہلے کراچی سے میرے ایک دوست نے کالموں میں وقٹے کی شکایت کی۔ میں نے اس سے عرض کیا "فریبہ بھائی جب بھی لکھتا ہوں محسوس ہوتا ہے یہ تو ہی کالم ہے جو چند روز پہلے لکھا تھا اور چند روز پہلے کا کالم پچھلے بختے کا کالم دکھائی دیتا ہے اور پچھلے بختے کا کالم پچھلے دو تین ہمینوں کے کالموں کے بہن بھائی۔ یہ احساس ہوتا ہے خیالات اور الفاظ کی جگائی کر رہا ہوں۔ ایک ہی بات بار بار دہرا رہا ہوں۔ با تم دہرا دہرا کرب تھک چکا ہوں۔" امریکہ سے ایک دوست نے فون کیا اسے بھی سمجھا جا دیا تو اس نے کسی انگریزی کتاب سے ایک واقعہ نقل کر کے بھجوادیا، واقعہ لچکپ ہے "کہتے ہیں کسی شخص نے اللہ تعالیٰ سے رابط کیا اور اس سے کوئی ذمہ داری سوچنے کی درخواست کی، اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا، یہ جو سامنے چٹان پڑی ہے اسے دھکا دیتے رہو، وہ شخص اخفا اور دقوں ہاتھوں سے چھان دھکیتے رہا۔ ایک دن گزر، ایک سال گزر، دس سال گزر گئے لیکن چٹان اس سے مس نہ ہوئی۔ لوگوں نے اسے سمجھایا بھلے مانس تم یہ چٹان نہیں سر کا سکتے کیوں جان ہلاکان کر رہے ہو۔ وہ لوگوں کی با تمیں سنتا رہا لیکن چٹان بھی دھکیلتا رہا۔ جب لوگوں کے سخنے مذاق میں تیزی آگئی تو ایک دن اس نے سوچا، واقعی ان دس سالوں میں یہ چٹان تو ایک انج آگئے نہیں سر کی، وہ سیدھا ہوا اور آسمان کی طرف من کر کے شکوہ کرنے لگا، یا اللہ یہ چٹان تو نہیں سر کر رہی۔" اللہ تعالیٰ نے جواب دیا۔ اے بے دوقوف شخص ہم نے تمہیں اس چٹان کو دھکا دیئے کا حکم دیا تھا، سر کانے کا نہیں، تم بس اسے دھکا دیتے رہو، دھکا دیتے رہو، یہ دیکھے بغیر کہ یہ سر کر رہی ہے یا نہیں، تمہارا کام دھکا دینا ہے چٹان کو سر کانا نہیں، سو جست پش اٹ۔" میرے دوست کا کہنا تھا تم لوگوں کا کام چٹان کو دھکا دینا تھا لیکن تم لوگ اسے سر کانے میں مصروف ہو گئے چنانچہ تم لوگوں کو ڈیپریشن ہوا اور ہزید ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے جو کام تمہارے ذمے لگایا خود کو بس اس تک محدود رکھو، باقی کام خدا اور اس کے دوسرے بندوں پر چھوڑ دو۔

مجھے نہیں معلوم میرے دوست رفتائے کارکی کیا کیفیت ہے۔ بسم اللہ، الحمد لله اور انشاء اللہ سے ان کی کہاں تک شفی ہو رہی ہے۔ نعشوں کے کیزے دیکھ دیکھ کر وہ کب تک زندگی گزار سکتے ہیں، وہ امریکہ کی لکیر کو کب تک پہنچ سکتے ہیں لیکن جہاں تک میرا معاملہ ہے میں خود کو ڈینی طور پر بانجھ محسوس کر رہا ہوں۔ اس ملک میں پھیلی مایوسی، یاست، ڈیپریشن اور بے مقصدیت میرے سینے تک پہنچ چکی ہے اور مجھے سمجھنے کیوں آ

رہا میں اس سے کیسے چھکارا پاؤں؟

خدا کے لئے کوئی نیا سورج تراشو، کوئی نئی سچ، کوئی نیا سویرا کاشت کرو۔ ہواوں کی کوئی نئی نصل ہی بو
دو۔ اور کچھ نہیں تو گندے جو ہڑ کے اس بد بودار پانی کو راستہ ہی دے دو۔ اسے پہنے کا موقع ہی فراہم کر دو۔
کچھ تو کرو اس سے پہلے کہ پانی کی ساری نبی اڑ جائے، زمین کی ساری ہریالی بکھ جائے اور سورج کی ساری
روشنی کند ہو جائے۔ نحیک ہے ہمارا کام چنان کو دھکا دینا ہے "جست پش اٹ" لیکن کب تک! آخر چنان کو
سر کانے والے بھی تو دکھائی دیں، وہ لوگ بھی تو نظر آئیں جن کے لئے ہم چنان دھکیل دے رہے ہیں۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

جیکب دی لائیں

جیکب جرم کی یہودی تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ہٹلر نے یہودیوں کے خلاف آپریشن شروع کیا تو نازی فوج نے جیکب کو گرفتار کر لیا اور اسے بھی دوسرے یہودیوں کے ساتھ ایک نظر بندی کمپ میں ڈال دیا۔ کمپ کی زندگی میں شدید ڈیپریشن تھا ہر روز جرم فوجی کسی نہ کسی قیدی کو سرے عام قتل کرتے۔ اس کی غصے کے لکڑے کرتے اور پھر انہیں چیلوں اور کتوں کے آگے ڈال دیتے۔ قید کا کوئی انت بھی نہیں تھا یوں محسوس ہوتا تھا جب تک دنیا میں ایک بھی جرم موجود ہے کمپ کا چھانک نہیں کھلتا گا۔ قیدیوں کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ قید کی اس طوالت اور جرم فوجیوں کے ان مظالم نے یہودیوں کے حوصلے توڑ دیے۔ ان کا مورال یہ ہے: ہو گیا اور انہیں محسوس ہوتے لگا اب صرف موت ہی انہیں اس قید سے برہائی دلائلی ہے۔ جیکب یہ سب پچھوڑ کر رہا تھا، ایک روز اسے بیٹھے بیٹھے احساس ہوا اگر چند روز میں قیدیوں کے دلوں میں امید پیدا نہ ہوئی تو یہ ہزاروں لوگ موت سے کہیں پہلے مر جائیں گے لیکن سوال یہ تھا! یہ امید پیدا کون کرے اور کیسے کرے؟! اسی رات جیکب سوچیں سکا۔ صح سوچ نے کمپ کے چھانک پر دھک دی تو جیکب اپنی زندگی کا مشکل ترین فیصلہ کر چکا تھا۔ شام نازی فوجیوں نے قیدیوں کو کوٹھریوں کی طرف دھکلنا شروع کیا تو جیکب نے اپنے ایک ساتھی کے کان میں سرگوشی کی "اتحادی فوجیں ہماری مدد کے لئے پہنچنے والی ہیں۔" ساتھی نے چونک کراس کی طرف دیکھا۔ جیکب نے اسے آنکھ ماری اور اسی دبے دبے لجھے میں کہا "میرے پاس ایک ریڈ یو ہے، میں نے جرمنوں سے چھپا کر رکھا ہے۔ میں نے اس ریڈ یو پر رات کو لی بی سی نہ۔ جرمنوں کو بے شمار مجازوں پر نکلت ہو رہی ہے اتحادی فوجیں تیزی سے جرمی کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ اب ہماری قید چند دنوں کی بات ہے۔"

جیکب کی ترکیب کامیاب رہی۔ اس رات یہ خبر پورے کمپ میں پھیل گئی۔ ہمارے ہونے یہودیوں میں جو عمل پیدا ہوا۔ دوسرے روز دیکھنے والوں نے ہر قیدی کی آنکھ میں ایک روشنی، ایک امگ دیکھی۔ اس کے بعد جیکب کا معمول ہو گیا۔ وہ اپنی کوٹھری سے نکلا، منتظر یہودیوں کے قریب آتا اور انہیں اتحادی فوج کی کسی نہ کسی جھوٹی خیخ کی خوبخبری سنایا کر آگے نکل جاتا اور یہ خبر تھوڑی ہی دیر میں پورے کمپ میں پھیل جاتی۔ خوش

سے قیدیوں کے چہرے تمنا اشتبہتے جیکب کا یہ نسخہ اس قدر کارگر ثابت ہوا کہ کمپ کی زندگی ہی بدل گئی۔ یہ معاملہ کچھ دنوں تک چلتا رہا لیکن پھر انتظامیہ کو کان ہو گئے۔ اس نے دیکھا قیدیوں کا مورال بلند ہو رہا ہے۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ پرمیڈ خوش اور مطمئن دکھائی دے رہے ہیں۔ انتظامیہ نے اس اطمینان کی وجہات معلوم کرنے کیلئے کمپ میں جاسوس چھوڑ دیے۔ جاسوسوں نے اگلے ہی روز وہ معلوم کر لی۔

جیکب کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس کی کوئی خبری کی تلاشی لی گئی لیکن ریڈیونس ملا۔ تحقیقات شروع ہوئیں تو معلوم ہوا جیکب قیدیوں سے جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ انہیں اتحادیوں کی فتوحات اور تازی کی فوج کی شکست کی جھوٹی خبریں دیتا آ رہا تھا۔ کمپ کے انجارج نے جیکب کو قیدیوں کے سامنے پھانسی دی اور اسے کمپ میں فہن کیا۔ اس کی قبر پر "جیکب دی لائیئر" کا کتبہ لگایا اور کمپ میں اعلان کر دیا جیکب کے پاس کوئی ریڈیونس نہ تھا۔ اس کی ساری خبریں جھوٹ اور لغو تھیں لیکن یہودیوں نے جرمنوں کی بات پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا خیال تھا اگر جیکب کے پاس ریڈیونس نہ ہوتا تو وہ قیدیوں کے سامنے اس کا اعتراف کر کے اپنی جان بچا سکا تھا۔ جرمنوں نے اسے پھانسی دی ہے تو اس کی باتوں میں لازمی بھی ہو گا۔ اب تدریت کا کمال دیکھئے جیکب کی موت کے چند ہی روز بعد جرمنوں کو شکست ہو گئی۔ ہتلر نے خود کشی کر لی، اتحادی فوجی سرحدیں تاراج کرتے ہوئے جرمنی میں داخل ہو گئے کمپ کے چھانک کھول دیے گئے۔ یہودی قیدی آزاد ہو گئے۔ یہ قیدی جب کمپ سے نکلے تو ان کے پاؤں میں جیکب کی قبر کی مشی بندھی ہوئی تھی اور وہ "جیکب، وی لیڈر آف ٹروٹھ" کے نام سے لگا رہے تھے۔ جیکب کی قبر کی یہ مشی آج بھی ان یہودی خاندانوں کے پاس محفوظ ہے۔ یہ چوتھی نسل ہے جو اس مشی کی پرستش کر رہی ہے جو جیکب کو دوسری جنگ عظیم کا ہیرہ سمجھ رہی ہے۔ ان یہودیوں کی عقیدت چیز ہے، واقعی اگر جیکب یہودیوں کے نمائتے ہوئے تو حملے اور بھیتی ہوئی امیدیوں کو اپنے خون کا ایجاد سن فراہم نہ کرتا تو ان یہودیوں میں سے ہزاروں لوگ نا امیدی مایوسی اور ذپریشن کے ہاتھوں تک مر جاتے اور ان کی داستان تک داستانوں کے ہجوم میں گم ہو جاتی۔

جیکب کی یہ کہانی، جیکب کی یہ ترکیب دنیا کو ایک سبق ایک درس دے گئی۔ وہ درس، وہ سبق یہ ہے کہ جب کوئی قوم ڈی مورالائزڈ ہونے لگے، جب مایوسیوں کی دیکھ اس کی اساس چانٹے لگے۔ جب لوگ ایک دوسرے سے پوچھنے لگیں "اس ملک کا کیا بنے گا؟" جب لوگ اغلیں مکانی اور فرار کو ہجرت کہنے لگیں، جب لوگ مستقبل کے خوف سے اپنے بچوں کو زہر دینے لگیں اور جب ہر چہرے پر ایک پیلا ہٹ ایک افسردگی دکھائی دینے لگے تو سمجھ لیں اس ملک، اس قوم میں جیکب ختم ہو گئے ہیں۔ ایسے جیکب جوان بھیتی ہوئی امیدیوں، جوان نوئی ہوئی آسوں کو تھوڑی سی زندگی تھوڑا سا حوصلہ دے سکیں۔ ان کی آس، ان کی امید قائم رکھ سکیں!

مشہور فرانسیسی دانشور کامیون نے کہا تھا "اگر امید نہ ہو تو ایک امید ایجاد کر لیں۔" اف دیر ازانو ہو پ

دین انوینٹ اے ہوپ۔ ”لیکن بد قسمتی دیکھئے اس ملک میں جی ہاں اس ملک پاکستان میں مایوسیاں پھیلانے والے ”چے“، جیکب تو ہزاروں لاکھوں ہیں لیکن اس قوم کی رگوں میں امید کا نجت بونے والا ”جمونا“ جیکب ایک بھی نہیں۔ جی ہاں کوئی ایک بھی ایسا لیڈر، ایسا رہنمائیں جو لوگوں کو بتا سکے ”اللہ کے گھر میں دیر ہے اور نہ ہی اندر ہیر“ وہ جب چاہے گا وقت بدل جائے گا۔ یا کوئی ایک بھی تو نہیں جو اس اندر ہیرے میں ماحصلہ کی ایک تسلی ہی جلاوے، سہی کہہ دے دوستوا میں باہر دیکھ کر آیا ہوں مج زیادہ دور نہیں بس چند گھنٹوں کی بات ہے۔ یقین سمجھنے بد قسمتی یہ نہیں ہوتی کہ کسی ملک، کسی قوم کے حالات خراب ہو گئے ہیں بد قسمتی یہ ہوتی ہے کہ اس قوم، اس ملک میں مایوسی پھیلانے والے بڑھ گئے ہیں، ذرا سوچنے جس مریض کے سرہانے بیٹھا ہر تماردار اس کے مرنے کی قشیں گولی کر رہا ہو وہ مریض کب تک زندہ رہے گا۔



آئیے ماں کی طرح سوچیں

دی اور گیارہ مارچ کو ملتان میں خواتین کا سیلہ تھا۔ اس میلے کا اہتمام ایک غیر سرکاری "حلقہ دیپ" نے کیا تھا۔ میلے کی رنگارنگ تقریبات میں شرکت کے لئے دو صوبائی وزراء شاہین عقیق الرحمن، بریگیڈر جامد سعید اختر اور بشریٰ رحمن ملتان حسکے۔ میں بھی وہاں مدعو تھا۔ یہ دو دن ہم لوگوں نے جنوبی پنجاب کے دکھنے، محوس کرنے اور ان دکھوں پر کڑھنے میں صرف کے۔ معلوم نہیں کیوں ہم جب بھی لاہور سے جنوب کی طرف سفر کرتے ہیں تو ہمیں ہر دل پندرہ میں کلو میٹر بعد محوس ہوتا ہے ہم آگے نہیں پہنچے جا رہے ہیں۔ ہر سنگ میل پر احساس ہوتا ہے۔ گھری اٹی چل رہی ہے اور ہم ہر سینکڑے کے بعد دل پندرہ میں سال پاشی میں اتر رہے ہیں، یہ شہروں کی حالت ہے، رہے قبیلے اور دیہات تو جنوبی پنجاب میں ایسے ایسے علاقوںے ہیں جہاں جا کر احساس ہوتا ہے وقت وہاں دو تین ہزار سال پہلے مر گیا تھا اور اب اس دن کے بعد وہاں کوئی نیا سورج نہیں نکلا، کسی نئی ہوا، وقت کی کسی نئی چاپ نے وہاں جنم نہیں لیا۔ بہر حال اس پر پھر کبھی تفصیل سے گفتگو کریں گے سردمت میں آپ کو محترمہ بشریٰ رحمن کا ایک فقرہ سنانا چاہتا ہوں۔ ایک ایسا فقرہ جس میں اس قوم کی تمام مشکلات، تمام مسائل کا حل چھپا ہے۔

اتوار گیارہ مارچ کی سہ پہر ملتان پر لس کلب میں میری کتاب "زیر و پرداخت" کی روشنائی تھی۔ اس تقریب کے صدارتی خطبے کے دوران محترمہ بشریٰ رحمن نے فرمایا "میں ماں ہوں اور ماں کبھی مایوس نہیں ہوا کرتی، ماں کو اگر یقین بھی ہو جائے کل اس کے بچوں کو روشنی نہیں ملے گی وہ تب بھی اپنے بچوں کو تکمیل دے کر کہے گی، میرے بچوں کو نہ کرو ضمیر جب تمہاری آنکھ کھلے گی تو کھانا تیار ہو گا۔" مجھے نہیں معلوم محترمہ نے یہ فقرہ کیوں کہا اور اس سے ان کی کیا مراد تھی لیکن یقین کجھے میں نے ان کے منہ سے یہ الفاظ سنبھالے تو میرے پورے جسم میں سرشاری پہنچی گئی۔ مجھے محوس ہوا اس کائنات میں صرف دو ہی ہستیاں ہیں جو مایوس نہیں ہوتیں۔ خدا اور ماں۔ اس زمین پر کتنے ظلم ہوتے ہیں اور انسان اپنے اوپر کس کس حد تک قلم کرتا ہے لیکن اس کے باوجود خدا کی رحمت انسان سے مایوس نہیں ہوتی۔ کھیتیاں اسی طرح رزق کا شت کرتی رہتی ہیں، درخت اسی طرح سایہ اور پھل پیدا کرتے رہتے ہیں، ہوا اسی طرح چلتی رہتی ہیں، سورج اسی طرح نکھرا رہا ہے، بارش اسی طرح برستی رہتی ہے اور پانی زمین سے اسے طرح ابلتا رہتا ہے اور رہی ماں تو اس کا ایک ماہ کا بچہ گم ہو جائے یا پانی میں گر جائے اور ساری دنیا اسے یقین دلاتی رہے اس کا بچہ مر چکا ہے لیکن وہ آخری سانس تک اس پہنچ کا انتظار کرتی رہتی ہے، ہر دن تک پر اس

کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے، وہ ہر خط کی طرف بے تابی سے دوڑتی ہے اور ہر کال، ٹیلی فون کی ہر گھنٹی پر اس کا چہرہ کھل اختا ہے۔ یہ کیا کمال ہے قدرت کا؟ بھی ہم نے سوچا، یہ ماں کی امید ہے ماں کی آس ہے، امید کی یہ طاقت، آس کی یہ قوت اللہ تعالیٰ نے صرف ماں کو بخشی ہے۔ صرف ماں میں ہی وہ جستیاں ہیں جو اپنے مایوس، اپنے نامید پھولوں کو امید کا پیغام دیتی ہیں جوانہیں قوت دیتی ہیں، جوانہیں خیر کی دعا دیتی ہیں۔

اللہ اور ماں کا بھی عجیب رشتہ ہے، اللہ جب اپنی رحمت کی گارنی دیتا ہے تو وہ فوراً فرماتا ہے میں ستر ماڈل سے زیادہ حیم ہوں ادھر جب ماں بچے کو دکھلی مایوس اور غم زده پاتی ہے تو وہ بھی اسے صرف اللہ سے رابطہ کرنے اور صرف اللہ سے مانگنے کی پدایت کرتی ہے۔ اس دنیا میں شاید ہی کوئی ماں ہو جس کے منہ سے بھی یہ لکا ہو، جس زمین پر اس کے بچے رہتے ہیں وہ زمین تباہ ہو جائے گی، وہ ملک خاہ ہو جائے گا وہ مکان گرجائے گا۔ آپ کسی ماں کے سامنے نہ کہہ کر کے دیکھ لیں وہ فوراً جھوپی پھیلا کر اس جگہ، اس مقام، اس شہر، اس ملک کے لئے خیر کی دعا کرے گی جہاں اس کے بچے رہتے ہیں۔ ایک ماں جس کی چادر میں سوپوند ہوں، جس کے سر پر چھٹت اور پاؤں میں جوتا ہو وہ بھی اپنے بچے کے لئے محل کے خواب بخھتی ہے۔ ایک ماں جس کا بچہ پیدائشی معدود ہو، جس کے بچے کے پاس پہننے کے لئے کرتا اور ستر ڈھالپنے کے لئے پانچاہس نہ ہو اس کی ماں بھی اپنے بچے کو باشدہ بنتے کی دعا دیتی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ڈاکنر ماؤں کو اپنے کینسر کے مارے پھولوں کو تعمیذ پلاتے، درگا ہوں کی خاک چائے اور ان پڑھ جاں بیدوں سے پھولوں مرواتے دیکھا ہے۔ مجھے ابھی تک کینسر کی وہ پیشافت ڈاکٹریاڈ ہے جس کے بچے کو بلند کینسر ہوا تو وہ اسے اس شیاسی کے پاس لے گئی جو تین سال تک اس ڈاکنر سے بلغم کی دوالیتا رہا تھا۔ یہ کیا ہے؟ یہ ماں کا یقین ہے، ماں کی امید ہے، ایک ایسی امید، ایک ایسا یقین جو اسے مایوس نہیں ہونے دیتا، جو اسے سمجھتا رہتا ہے، قدرت کے دامن میں اربوں کھربوں میջزے ہیں۔ قدرت چاہے تو مردے اٹھ کر بیٹھ جائیں۔

مایوسی اور تا امیدی کی بد نصیبی تو صرف ہم مردوں کے حصے میں آتی ہے، ایسے مردوں کے حصے جو دن رات اس ملک کے تباہ ہونے، ہر باد ہونے کی پوشن گویاں کرتے رہتے ہیں۔ جو اس ملک کے کل سے پوری طرح مایوس ہو چکے ہیں۔ جو بہت ہار چکے ہیں، جو جگد جگد کہتے پھرتے ہیں۔ جو موقع بہ موقع فرماتے رہتے ہیں یہ ملک نہیں چل سکتا۔ اس ملک کا خدا ہی حافظ ہے اور اس ملک سے بھاگ چلو وغیرہ وغیرہ یقین سمجھے ملکوں کو ماں میں بچایا کرتی ہیں وہ ماں میں جو قبرستانوں میں بیٹھ کر بھی امید کا دامن نہیں چھوڑتیں، جو ہر حال میں پہ امید رہتی ہیں۔ جو اپنے پھولوں کے کل کے لئے جستی ہیں۔

آئیے آج سے ہم بھی ماڈل کی طرح سوچیں، ان ماڈل کی طرح جو اپنی منوانے پر آ جائیں تو قدرت کو فصلے واپس لینے پر مجبور کرو دیتی ہیں۔ آئیے آج سے ہم وعدہ کریں ہم جب بھی اس ملک کے بارے میں سوچیں گے ماں کی طرح سوچیں گے۔





تم نے جانتے ہوئے کہ مجھ میں تجویزی تھیں۔

دوسرا لکی کے مرے پر ایک کنواری بھی تھی، ملیے پانچ سالی تھیں تھمبل پانچ سالیں میں تجویز میں وکٹ کے ہزاروں بھروسے ہیں، تھم کے تھوڑے تھے ہزاروں کی پانچ سالی اور یہاں کے ایک پانچ سالی تھے، اس کی پانچ سالی تھی، اس وقت زندگی تھی، ان رفتاریاں کی بھت برقی فرم، انسان تھے تم نے تھمبل سے یادوں لایا، تم نظر پر تھے اور سر زخم میں ہی بیکے پھپے رہا، پھر اُنکی نیس ہزاروں کے سلے کچھے بدن پر تھیا رہے ہزاروں کے سلے ان رہا کہ میں نیشن و پیون کر دیا جاتا ہوں۔

تم جو لیاں کی ہزاروں بھی پانچ سالی تھے تھے اور میں کی تھی رہا سب بہت کرم اور سائے بہت خندے تھے، ہمارے حسانت نیک سلا کے شوپ پکھرے رہے تھے تھم نے ہزاروں سے "فاسٹ بڈھا" لایا تھا، دیوبھا طلبی سے کافی تھیں رہا کیا، وہ تھمدا آج تھے اپنے ہاک کا انتفار کر رہا تھا، جیس وہ بھاروہ خندے سائے، وہ کرم و حسوب اور وہ کیسی زین میں اپنی آنکھیں بھی ہوں، میں جو عیناں کی ہزاروں بھیں پرانی تھیں جیسی آنکھیں ادا کہ جاتا ہوں۔

تم خلائق کی بالکل تھیں ہی نہ تھے، ہی نہ تھے، ہی نہ تھے، اسی تھی اور خیری اور سب کے درخت ہمارے ہیں پر نہ تھے، تم لے گئے کنواروں پر بہت اولادیے ہو دیتے، اسکے ہزاروں بھی ہزاروں سے تھاں اور بھی ہزاروں پر ہزاروں کی بھیں پر نہ تھے، میں نہ جسک، نیشن اور کافی کا یہاں کی ایس کر دیا جاتا ہوں، میں سب اور اخباری کے، وہ رفت، وہ جتنا دریا اور جنگزادوں کی بھی تھیں اور انہا پا جاتا ہوں۔

بھرے گلکنوار کے بہت ہزاروں میں زندگی کی پہلا اور آخری سگرے پوچھا، میں نے شروع کیا تھا تم نے شتم، اس سگریت کی رائے کوہا تھوڑے کوہا تھے، لئی سمجھی باتیں توں، لاں سماں کے درست ہزاروں کے باحمدہم کے غرض پر وہ گیا تو لے گئی اسی طرح جو ایسے تھے، کچھے کاروڑ اور ساری تھوڑی کی تھیں، میں نہ تھیں، سے لکھاے جو گزرے تھے، تھمہاری ساری کھشیں، ساری ای ویزے ساری تھوڑی کھشیں، میں نہ تھیں، اسی طرح آسان پر گئے ہیں، جھیلوں میں پیکھے، میں نہ تھیں جیسا تھم نے رکھی تھیں، یہ دھویں کے، وہ سارے پیارے بھی اسی طرح آسان پر گئے ہیں، جھیلوں میں پیکھے، میں نہ تھیں، کے بدن سے لئے وہ سارے داہرے بھی اسی طرح موجود ہیں، تھمہارے سلسلے کی وہ بھی کلیں اسی طبقہ تھمہاری تھیں کا وہ لوڑا ہیں، اسکی دیس پاہیں جو چوری تھیں، اسی طبقہ تھمہاری تھیں، تھمہاری خوشبو، اسکی تھک جا گئی رہی، وہیں پہاڑے پہاڑے تھے، ہزاروں کی اصلی ہزاروں اور گھنیں کے سرخ نثاروں میں تھمہاری خوشبو، اسکی تھک جا گئی رہی، وہیں پہاڑے پہاڑے تھے، ہزاروں کی آنکھوں کی آنکھوں تھے، اسکی خیز تھیں پیچھے اور سبی پیروں کے پیٹھیں میں اسکی تھک تھمہاری پکاؤں کا ارتقاش یاتی ہے اور سبی کروں رہ تھمہاری ساریں کا اس سمجھی ابھی زندہ ہے، میں نہ تھا، اس کی ساری خوشبویں، مگر تھے وہ اعلیٰ کی ساری تصوریں اسکی تھیں، وہیں کر دیا جاتا ہوں، میں اپنا سارا ماں اسکی تھیں، اور دیا جاتا ہوں۔

Rs. 500/-

علم و فن سپلائرز

الحمدلہ سارکیت، 40 - اردو بazar، لاہور۔

فون: 7232336 7352332

www.ilmoirfanpublishers.com

E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com